DUE DATE

Cl. No. Acc. No.

Late Fine Ordinary books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night book **Re. 1/-** per day.

سب رس



کابل کا ایک بازار

عمل۔ غوث الدین

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان

ماہنامہ

سب رس خاص نمبر

حیدرآباد دکن

جلد (۱۷) فروری و مارچ سنہ ۱۹۵۴ء شمارہ (۳،۲)

نگران

ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری زورؔ

ادارہ

نجمہ سمیع

رمن راج سکسینہ

نصیر الدین ہاشمی

سالانہ چندہ چھ روپے سکۂ ہند
ششماہی " تین " "
(رجسٹری فیس بذمہ خریدار)
خاص نمبر، دو روپے سکۂ ہند

مہتمم ادارہ ادبیات اردو کے اہتمام سے "تاج برقی پریس" میں چھپ کر دفتر ادارہ خیریت آباد سے شائع ہوا۔

سب رس کی مجلس انتظامی



پہلی صف [illegible]

دوسری صف [illegible]

ادارہ

پہلی بات

جیسا کہ ہم نے جنوری کے شمارے میں اس کا اعلان کیا تھا کہ فروری یا مارچ میں "سب رس" کا خاص نمبر پیش کیا جائے گا سو وہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اسے فروری اور مارچ کا مشترکہ نمبر سمجھنا چاہیے۔ گو یہ صحیح ہے کہ یہ نمبر کافی تاخیر سے نکل رہا ہے لیکن اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ہمارے کئی ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات بھیجنے میں کافی تاخیر کر دی اور بہت سوں نے تو محض انتظار کرایا اور پھر بھی اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ دوسری وجہ انتظامی دشواریاں تھیں جن سے ہم بر وقت عہدہ برا نہ ہو سکے۔ بہرحال تھوڑی سی تاخیر کے بعد ہی سہی اب جو پرچہ آپ کے سامنے ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اس لائق ضرور ہے کہ آپ ہمیں معاف فرما دیں گے۔ ویسے یہ خاص نمبر اور وزنی اور وسیع ہو جاتا اگر وہ تمام مضامین نظم و نثر شامل ہوتے جن کی ضخامت (کتابت کرانے کے بعد) سو صفحات تک پہنچ رہی تھی اور جنھیں مجبوراً اس لئے نکالنا پڑا کہ ایک تو وہ تھوڑے سے طویل تھے اور دوسرے ہمیں خاص نمبر کی ضخامت کو (مالی دقتوں کی وجہ سے) ۳۰۰ صفحات سے گھٹا کر ۲۰۰ صفحات کرنا پڑا۔ وہ مضامین جو اس نمبر میں شریک ہونے سے رہ گئے اپریل کے پرچے میں شامل رہیں گے۔ گویا اپریل کا پرچہ سالنامہ ہی کا دوسرا حصہ ہوگا جس کی اہمیت کا اندازہ نیچے دی ہوئی چند ناموں کی فہرست سے کیا جا سکتا ہے۔ آخر میں ہم ان تمام کرمفرماؤں سے ممنونیت خواہ ہیں جن کے مضامین کہانیاں اور نظمیں اور غزلیں خاص نمبر کی زینت بن سکے۔

یہ نمبر کیسا ہے؟ اس کے متعلق ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ آپ خود بے لاگ رائے قائم کیجئے اور ہمیں لکھئے اور پسند آنے کی صورت میں "سب رس" کی توسیع اشاعت میں دلچسپی لیجئے۔

سالنامے کے دوسرے حصے کی ایک جھلک

(۱) "مکتوبات اختر شیرانی" مرسلہ دیوانہ سلطان آبادی (۲) "غالب اور اقبال کی شاعری" پروفیسر ہارون خان شیروانی (۳) "بھکاری مصنف" حبیب الرحمٰن (۴) "سورداس" پروفیسر زینت ساجدہ (۵) "غالب کا فیضان" پروفیسر شجاع احمد زیبا (۶) "کتب خانہ آصفیہ کی قلمی کتابیں اور ان کی اہمیت" ڈاکٹر راحت اللہ خان (۷) "گُن" (ڈرامہ) محمد مہدی (۸) "تفریق" (افسانہ) ل۔ احمد (۹) "جدید آرٹ کیا ہے؟" پروفیسر انعام انصاری (۱۰) "نظموں میں نئے رجحانات" بلراج ساہنی (۱۱) "سالانہ رپورٹ" (طنز) یوسف ناظم (۱۲) "کتھا کلی" امجد علی (۱۳) "اورنگ آباد کے شعراء و ادیب" خالدہ بیگم ــــــ ان کے علاوہ بہت سی کہانیاں اور منظومات۔



علی منظور



موهان لال حمانی



ودهان شفائی



شادان صدری



[illegible]



[illegible]



[illegible] مدني



[illegible] سالم



ڈاکٹر سلامت اللہ



عزیز قیسی



وحید اختر



اجلم ابوالحسن



شاذ تمکنت

★



[illegible]

[illegible]

ڈاکٹر سید حسین — ڈاکٹر بھٹناگر — ڈاکٹر رضی الدین صدیقی — [illegible]

ڈاکٹر زور — ظہیر الدین احمد — عزیز قیسی — سلیمان اریب



[illegible]

پہلی صف: ظہیر الدین احمد — ڈاکٹر [illegible] — [illegible] — ڈاکٹر زور

ڈاکٹر بھٹناگر — [illegible] — سلیمان اریب — [illegible]

دوسری صف: [illegible] — [illegible]

مظہر حسن [illegible] — [illegible] — عزیز قیسی — [illegible] علی [illegible] — [illegible] علی [illegible]

تیسری صف: [illegible] — [illegible] علی — پروفیسر [illegible] — [illegible]

پروفیسر [illegible] — پروفیسر [illegible] — پروفیسر [illegible]



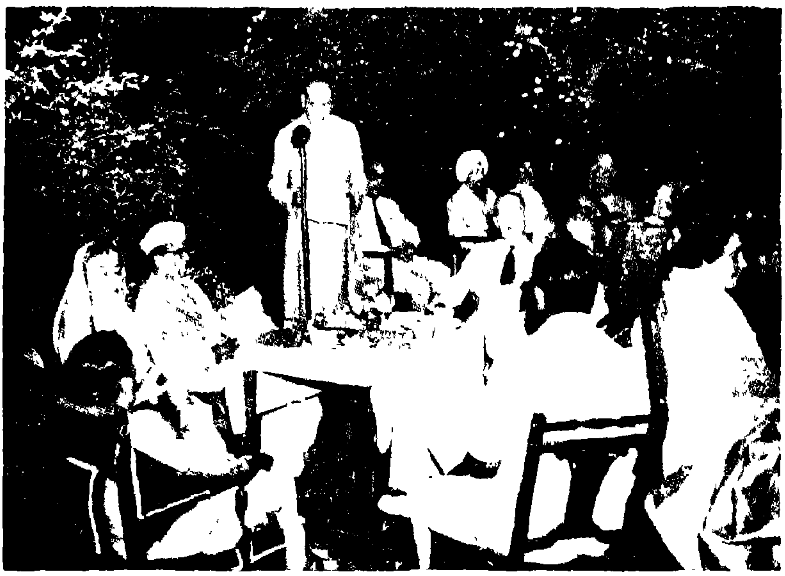
سیدھی طرف سے پہلی صف:- وزیر تعلیم ادارے میں

محمد الدین شاہد - پروفیسر سروری - ڈاکٹر زور - شاہ جہاں بیگم - گوپال راؤ ایکبوٹے

وزیر تعلیم - بی۔ ایچ۔ راؤ [illegible] - سید [illegible] - عبداللہ [illegible]

دوسری صف - مولوی [illegible] - نواب [illegible] - علی الدین احمد

محمد [illegible] - پروفیسر محمود حسین - ڈاکٹر حفیظ قتیل - پروفیسر سید محمد۔



ڈاکٹر زور خیر مقدم کر رہے ہیں

ڈاکٹر محی الدین زور

موجودہ اردو ادب کے چند رجحانات اور مسائل

عہد حاضر میں اردو ایک نازک دور سے گزر رہی ہے۔ یہ ایک عبوری دور ہے۔ اور قوموں اور افراد کی زندگی میں ایسے دور کبھی نہ کبھی ضرور آتے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی نے جہاں کئی پیچیدگیوں اور رکاوٹوں کو دور کر دیا بہت سے نئے نئے مسائل اور گتھیاں بھی پیدا کر دیں۔ جو سیاست دانوں اور ارباب حکومت کے لئے اب تک سرگرانی کا باعث بنی ہوئی ہیں اور اکثر اہل ملک ان میں بری طرح الجھے ہوئے ہیں۔

اہل اردو بھی گزشتہ چند سالوں میں دوگونہ اضطراب اور انتشار کا شکار رہے ہیں۔ ملک کی تقسیم کے ساتھ اس زبان کے شیدائی اور خدمت گزار اور خاص طور پر ادیب و شاعر بھی دو گروہوں میں بٹ گئے۔ جو گروہ سرحد کے اس پار ہے وہ بھی ایک واقعی اصول اور سرکاری سازگاری کے باعث مطمئن نہیں ہے۔ اس ملک کی مذہبی نوعیت نے وہاں کے ادیبوں اور شاعروں میں اسلامی ادب اور لادینی ادب کے علمبرداروں کی دو جداگانہ پارٹیاں کھڑی کر دی ہیں اور آثار ایسے ہیں کہ نقطۂ نظر میں اختلاف کی یہ خلیج روز بروز وسیع ہوتی جائے گی اور ایک نہ ایک دن اس کا اثر ہندوستان کی اردو اور اہل اردو پر بھی پڑے گا۔

ہندوستان کی آزادی نے جہاں اس ملک کی اکثر و بیشتر زبانوں اور ان کے بولنے والوں میں زندگی اور زندہ دلی کی نت نئی لہریں دوڑا دیں۔ اردو اور اس کے حامیوں کو ایک خطرناک صورت حال سے دوچار کر دیا۔ یہاں بعض ایسے افسوسناک رجحانات پیدا ہوئے جن کی وجہ سے اردو کو ایک بدیسی اور غیر ملکی زبان سمجھا جانے لگا اور اس کی شاندار قومی روایات کا سبب سے انکار ہونے لگا۔ اور اس کی وہ خدمات فراموش کر دی گئیں جو ہندوستان کی جد و جہد آزادی میں وہ گزشتہ سو سال سے انجام دیتی آئی ہے۔

ان نامساعد حالات میں بھی اردو کے ادیب اور شاعر خاموش نہیں رہے اور اردو ادب و شاعری کا چشمہ سوکھنے نہ پایا اور بڑی طمانیت کی بات تو یہ ہے کہ اس افراتفری اور دلدوگیر کے دور میں جب کہ اس زبان پر صرف مسلمانوں کی زبان ہونے کا الزام لگایا جا رہا تھا اردو کے غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں نے آگے بڑھ کر اس زبان کو اس کے حریفوں کے حملوں سے بچایا اور اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے سے یہ ثابت کر دکھایا کہ نہ تو اردو کوئی غیر ملکی زبان ہے اور نہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے جیسا کہ اس کے بعض مخالف اس کے متعلق غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ گزشتہ چھ سالوں میں غیر مسلم ارباب قلم کی جتنی کتابیں اور رسالے اردو میں شائع ہوئے ہیں اتنے کسی ایک دور میں کبھی نہیں ہوئے تھے۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، کشن پرشاد کول، فراق گورکھپوری، آنند نرائن ملا، گوپی ناتھ امن، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، سور لکھنوی، تلوک چند محروم اور جوش ملسیانی تو اس کے قدیم پرستار اور خدمت گزار ہیں۔ لیکن نوجوانوں میں کرشن چندر، کنھیا لال کپور، جگن ناتھ آزاد، اوپندر ناتھ اشک، عرش ملسیانی، ہنس راج رہبر، رادھے شیام احقر، راجندر سنگھ بیدی، فکر تونسوی، مخمور جالندھری، پرکاش پنڈت، اوم پرکاش، گوپال متل، لبراج کول، دیویندر ناتھ، کشمیری لال ذاکر، گوربچن سنگھ، بلونت کارگی، بلونت سنگھ اور ستیش کمار شاد جیسے بیسیوں شاعروں، ادیبوں، افسانہ نگاروں اور صحافیوں نے پوری توانائی کے ساتھ اردو کی طرف توجہ کی اور ان کے مضمونوں، مقالوں، افسانوں، نظموں اور غزلوں اور ان کی نظم و نثر کے مجموعوں اور ان کے زیر ادارت شائع ہونے والے

رسالوں سے اردو ادب میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس میں صحت مند رجحانات نمایاں ہوتے جا رہے ہیں اور وہ روایات پھر سے تازہ ہو رہی ہیں جو دکن میں یعنی قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں میں صدیوں تک شگفتہ رہیں اور اس کے بعد کے ادب میں نظیر اکبرآبادی، محسن کاکوروی، چکبست اور پریم چند جیسے فنکاروں کے یہاں جلوہ دکھاتی رہی ہیں۔

یہ صورت حال اردو کے ایک جدید اور امید افزا رجحان کی ترجمانی کرتی ہے اور ہندوستان کے مخالفین اردو کے علاوہ پاکستان کے ان نام نہاد محبان اردو کو بھی دعوت فکر دیتی ہے جو اردو میں صالح یا اسلامی ادب کا ایک نیا دبستان قائم کرنے کا پرچار کر رہے ہیں اور اس طرح وہاں کے ادیبوں اور شاعروں کے سامنے ایک اہم مسئلہ بنا کر کھڑا کر دیا ہے حالانکہ جس قسم کے دبستان کو وہ اب قائم کرنا چاہتے ہیں وہ پہلے ہی سے اردو میں موجود ہے اور اس کے لکھنے والے اور پڑھنے والے ہر زبان کے مذہبی ادب کے دائروں کی طرح اردو میں بھی صدیوں سے موجود ہیں۔

اردو کے آج کل کے ادیبوں کے لئے خواہ وہ پاکستان میں ہوں یا ہندوستان میں صرف یہی ایک مسئلہ درپیش نہیں ہے اور یہ مسئلہ بھی آسانی سے طے ہو جائے گا اگر وہ اپنی زبان اور ادب کے ان تین بنیادی مسئلوں کو حل کر لیں جو پہلے سے زیادہ شدت اور گہرائی کے ساتھ اب ان کے آگے ہیں۔

(۱) کیا لکھیں اور کس کے لئے لکھیں؟
(۲) کس طرح لکھیں یعنی زبان اور ہئیت کیا ہو؟
(۳) متحدہ محاذ کس طرح بنائیں؟

یہ ظاہر ہے کہ سائنسی تجزیہ اور صحت مند طریقہ پر حقیقت کی بے لاگ ترجمانی کسی ادیب کی سب سے بڑی کامرانی ہے۔ اس کے لئے ادیب کو سماج کی حقیقت سمجھنی پڑے گی۔ مختلف طبقات کے رشتوں اور ان سے تعلق رکھنے والے انسانوں کے خیالات اور جذبات کو جانچنا ہوگا اور اپنی تہذیب کی تاریخی و ادبی روایتوں سے واقفیت حاصل کرنا اور اپنے ملک کی اخلاقی، تاریخی اور سیاسی فضا کا گہرا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اردو کے شاعروں اور ادیبوں کو عوام یا سماج کے جس طبقے کے لئے لکھنا مقصود ہے اس کی حقیقی زندگی کا قریب سے مشاہدہ کرنا ضروری ہے۔

جہاں تک زبان اور فارم کے مسئلہ کا تعلق ہے اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو یہ مسلمہ حقیقت ہر وقت پیش نظر رکھنی ہوگی کہ وہی ادب بڑا اور عظیم الشان ہوتا ہے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے ہو اور ایسے ادب کی زبان، فارم اور طریقۂ اظہار یا اکسپریشن کو بھی عام فہم اور نوک رچاؤ کے ساتھ آسان ہونے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ایک طرف انفرادیت پسندی، فحاشی، عریانی، اسلوب پرستی اور فن کلاسکیت سے اور دوسری جانب سیاسی انتہا پسندی کی ذہنیت، کسی خاص نظریہ کی تشہیر اور آخر میں فارم کو نظر انداز کرنے کے تصور سے بچنا ہوگا۔

اس تمام تفصیل کا خلاصہ اس ایک جملہ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اردو ادب کی ہئیت قومی اور اس کے موضوع مقبول خواص و عوام ہوں کیونکہ کسی ادب میں اس کے یہ دونوں اجزا یعنی موضوع اور شکل (Form and Theme) برابر کی اہمیت رکھتے ہیں۔

اردو ادب کا تیسرا اور اہم مسئلہ خود ملک اور اہل ملک کے ان حالات اور رجحانات کا پیدا کردہ ہے جو اس جمہوری دور میں سامنے آ گئے ہیں اور جن سے اردو کے ادیب سب سے زیادہ متاثر ہیں۔ ہمارا ملک جن حالات سے گزر رہا ہے اور ہمارے ادیبوں اور شاعروں میں جو انتشار سا نظر آتا ہے اس کے دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک متحدہ محاذ قائم کیا جائے۔ جب تک یہ نہ ہوگا صوبہ داریت، گروہ بندی اور علم و فضل کا تعصب دور نہ ہوگا۔ اس کے لئے لازمی ہے کہ مختلف نقطۂ نظر اور مختلف جماعتوں یا انجمنوں سے

تعلق رکھنے والے ادیب و شاعر باہمی میل جول کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ آپس میں بحث و مباحثہ اور سیکھنے سکھانے کے طریق کار سے صحیح تنقید اور خود تنقیدی کا ان میں شعور پیدا ہوگا اور اس طرح رفتہ رفتہ ایک متحدہ محاذ بن سکے گا۔ یہ متحدہ محاذ سیاسی جماعتوں کا ہو نہ سیاسی عقیدے کی بنا پر۔ اس لئے اس میں ہر وہ ادیب اور شاعر شامل ہوگا جو محب وطن ہو اور جمہوریت پسند ہو۔

آج کل ادب کے سلسلے میں ایک اور موضوع بحث "جمود" بھی ہے۔ عام طور پر اس جمود کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ تقسیم ہند اور آزادی سے پہلے انگریز سب کا دشمن سمجھا جاتا تھا اور ادیبوں کے لئے اس کی مخالفت ایک عام موضوع تھا۔ جب منظر سے انگریز ہی ہٹ گیا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے ہاتھ سے ان کا موضوع نکل گیا۔ وسعت نظر اور سیاسی شعور کی کمی نے ان میں واماندگی کے آثار پیدا کر دیئے۔ بعض نے رومانیت میں پناہ لی اور بعض نے گٹ بندی کا سہارا ڈھونڈھا اور بعض صوبہ واریت کی گود میں گر پڑے۔ اس کا علاج یہی ہو سکتا ہے کہ ادیبوں کا ایک متحدہ محاذ ان سے چھوٹ کر پیچھے رہ جانے والوں کو اپنے ساتھ لے لے اور انھیں صحیح راہ پر لگا دے۔ اس سلسلے میں ایک اطمینان کی بات یہ ہے کہ ایسے ادیب اور شاعر بھی جنھوں نے رومانیت اور فحاشی کی کم یا زیادہ کسی زمانے میں سرپرستی کی تھی اب اس سے کنارہ کشی اختیار کر چکے یا کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں تو قدیم عربی قصیدہ نگاروں کے مشہور موضوع تشبیب ہی کو ان اصحاب نے ایک نفسیاتی حربے کے طور پر استعمال کیا تھا تاکہ ان کے موضوع سے دلچسپی نہ رکھنے والے بھی اس ذہنی عیاشی کے سحر کن نغمے سے متاثر ہو کر وہ سب کچھ سن پڑھ لیں اور سیکھ لیں جو وہ بتلانا چاہتے تھے۔ اور اب جبکہ یہ مقصد بڑی حد تک پورا ہو چکا ہے اس حربے کے استعمال کرنے والے خود بھی اس سے گریز کرتے ہیں۔ یہ معیار کے قائل اور اس کو چھوڑ دینے پر مائل نظر آتے ہیں۔ جب متحدہ محاذ کی کوششوں سے ایک صحتمند اور ترقی پرور فضا پیدا ہو جائے گی تو سڑی گلی چیزیں خود گر پڑیں گی یا پھینک دی جائیں گی۔ مجھے مستقبل سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ ہر رات ایک نیا خواب لاتی ہے اور ہر صبح اس خواب کی نئی تعبیر

(آل حیدرآباد ہندی پرچار سمیلن میں پڑھا گیا)

محمد مہدی

ہندستانی صحافت

ہندستانی صحافت کا ذکر کرتے وقت میرے سامنے لازمی طور پر چند مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ مشکلات ہیں زبان کی۔ ہندستان کی ترقی یافتہ زبانوں میں ایک زبان بھی ایسی نہ ملے گی جس میں صحافت کی ایک تاریخ اور اس کی اچھی بری روایات موجود نہ ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ ہندستان کی آزادی سے پہلے اور اس کے بعد بھی انگریزی صحافت کو ایک نمایاں مقام حاصل رہا ہے اور ہندستان سے باہر اور خود ہندستان میں رائے عامہ سے واقف ہونے کے لئے عام طور پر انگریزی صحافت ہی پر بھروسہ کیا گیا لیکن اس کے باوجود بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندستان کی اپنی زبانوں کی صحافت نے ہمارے ملک کی تاریخ میں ایک نمایاں پارٹ ادا کیا ہے اور اب بھی اس کی آواز میں ایک اثر ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے ملک کے موجودہ سیاسی اور معاشی ڈھانچے کو دعا دیجئے کہ اس نے اب تک ایسے حالات پیدا نہیں کئے کہ ہندستان کی اپنی زبانوں کی صحافت ترقی کر سکے اور رائے عامہ کی نہ صرف عکاسی کر سکے بلکہ اس کی رہنمائی کے فرائض بھی پورے کر سکے جو اس کا ایک اہم مقصد ہے۔

بہر حال موجودہ حالات میں جب ہم ہندستانی صحافت کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے سامنے اگر ایک طرف ہندستان کی مختلف زبانوں کی جدید صحافت ہے تو دوسری طرف ہندستان کی انگریزی صحافت بھی ہے جو اب بھی رائے عامہ کو استوار (یا گمراہ ؟) کرنے میں سب سے آگے آگے ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ زبان کی مشکل ہمارے اس مطالعے کو محدود کر دیتی ہے لیکن پھر بھی چند ایسی مجموعی خصوصیات ہمارے سامنے ہیں جن کی بنیاد پر سارے ملک کی صحافت کے متعلق ایک رائے قائم کرنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمیں یہاں یہ دیکھنا ہے کہ جدید ہندستانی صحافت جس پر رائے عامہ کی عکاسی کرنے اور اسے استوار کرنے کی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کون سا رخ اختیار کر رہی ہے اور اس سے کیا نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

یوں تو ہندستانی صحافت کی ابتدا ملک کی مختلف اصلاحی تحریکوں کے ساتھ ہوئی اور دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ اردو کا پہلا ہفتہ وار اخبار راجہ رام موہن رائے نے شائع کیا۔ لیکن ہندستان کی صحافت کی آواز میں اعتماد اور انفرادیت کی تاریخ ہندستان کی قومی آزادی کی تحریک کی تاریخ سے وابستہ ہے۔ ہندستان کی قومی تحریک کے ساتھ ساتھ ہندستانی صحافت نے بھی ترقی کی اور اگر آپ کو ہندستانی صحافت کی تاریخ میں کسی منصوبہ بندی کا فقدان نظر آئے تو اسے اپنی قومی آزادی کی تحریک کی برکت سمجھ لیجئے جو ابتدا میں ایک خود رو پودے کی طرح بڑھتی رہی۔

شروع میں رسائل نکلے تو کمپنی بہادر کی قصیدہ خوانی انھوں نے اپنا فریضہ سمجھا لیکن جیسے جیسے ہندستان کا ابھرتا ہوا سرمایہ دار طبقہ اپنی پوزیشن سے واقف ہونے لگا اور درمیانی طبقے میں سیاسی شعور بیدار ہوا ویسے ویسے ہمارے رسائل اور اخبار ایک حد تک لوگوں کے عام رجحانات کی نمائندگی کرنے لگے یا کم سے کم ان کے دکھ درد کو حکومت تک پہنچانے کی کوشش کرنے لگے۔ کلکتہ ریویو (Calcutta Review) اور فرینڈز آف انڈیا (Friends of India) جیسے اخبار کسانوں پر زمینداروں اور حکام کے مظالم کے لرزہ خیز قصے شائع کرنے لگے لیکن عام لوگوں کے ساتھ ان اخباروں کی ہمدردی صرف اسی حد تک تھی جب تک وہ حکومت کے آگے ناک رگڑنے سے انکار نہ کریں۔ جب سنتھال بغاوت نے مشرقی ہندستان کو ہلا دیا تو فرینڈز آف انڈیا نے یہ بھی لکھا کہ "ان خونخوار کے

دلوں میں جو نفرت بیٹھ چکی ہے نہ جنس کا لحاظ کرتے ہیں خوف و دہشت بٹھائے بغیر اس بغاوت کو ختم کرنا ممکن نہیں......"

قومی تحریک کے قدموں میں استقامت آئی تو ہندستانی صحافت نے بھی ایک نیا رخ اختیار کیا۔ ادھر ایک پریس ایکٹ کے بعد دوسرا پریس ایکٹ بنایا گیا ادھر قومی جذبے کے تحت ایک اخبار کے بعد دوسرا اخبار جاری کیا گیا۔ ابتدا میں قومی صحافت منافع کے لئے نہیں بلکہ قومی آزادی کو زبان دینے کی غرض سے شروع ہوئی تھی اور یہ حقیقت ہے کہ اس نے یہ فرض ایک حد تک اچھی طرح سے پورا کیا۔

لیکن یہ حالت زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہی۔ ہماری بدقسمتی سے ہندستان کی قومی آزادی کی تحریک کی رہنمائی یہاں کے ایسے سرمایہ دار طبقے کے ہاتھ میں تھی جس نے ہندستان کی مکمل آزادی سے زیادہ ضروری اپنے منافع کو رکھا۔ چند انگریزی اخبار اگر ایک طرف ملک میں انگریزوں کے مفاد کی نگہبانی میں مصروف تھے تو دوسری طرف باشعور سرمایہ دار طبقہ بھی اپنے طبقاتی مفاد کے تحفظ کے لئے اخباروں کو استعمال کرنے کی فکر کرنے لگا اور آہستہ آہستہ صحافت ایک ایسے پیشے میں تبدیل ہو گئی جس کا اولین مقصد لوگوں تک صحیح اور غیر جانبدارانہ انداز میں خبریں پہنچانا نہیں رہا بلکہ اس کا سب سے اہم مقصد سرمایہ دار طبقے کے مفاد کی حفاظت کرنا اور ایک صنعت کی حیثیت سے منافع کمانا ٹھہرا۔

کڑی در کڑی

آج ہندستان کی ساری صحافت اسی ڈگر پر چل رہی ہے۔ ملک میں چند گنے چنے ہی اخبار ایسے رہ گئے ہیں جن کا تعلق کسی ایسے بڑے سرمایہ دار خاندان سے نہ ہو جو ہندستان کی معاشی زندگی میں اجارہ دارانہ حیثیت اختیار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس وقت تین بڑے سرمایہ دار خاندان پورے ہندستان کی صحافت کو اپنے شکنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں یا اور زیادہ جکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک برلا گروپ ہے جس نے ہندستان ٹائمز، سرچ لائٹ (پٹنہ)، لیڈر (الہ آباد) وغیرہ اور اسی قسم کے ہندی اخباروں کی ایک زنجیر قائم کر رکھی ہے۔ دوسرا گروپ گوئنکا کا ہے جسے ایکسپریس گروپ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس کے قبضے میں شمال اور جنوب دونوں علاقوں کے اخبار ہیں، اور تیسرا گروپ ڈالمیا کا ہے جس نے ٹائمز آف انڈیا کو انگریزوں سے خرید کر تین جگہ سے نکالا۔ (کلکتہ ایڈیشن بند ہو چکا ہے) اور جس کے قبضے میں کئی ہندی اور تمل پرچے ہیں۔ یہ تین خاندان ہندستان کے "کاغذی بادشاہ" ہیں جو صحافت کے ہر پہلو پر چھائے ہوئے ہیں۔

اردو اور دوسری زبانوں میں یقیناً ایسے اخبار بہت ملیں گے جو کسی ایک خاندان یا فرد کے جاری کئے ہوئے ہیں یا جو صرف ایک ہی جگہ سے شائع ہوتے ہیں۔ انگریزی میں ہندو اور سیل جیسے اخبار بھی ہیں جو اپنی جگہ بہت بڑے اخبار ہیں لیکن وہ خاندانوں کی نجی ملکیت ہیں۔ لیکن جب سے اخباروں کو خبریں پہنچانے کے ذرائع سے زیادہ منافع کمانے کا ذریعہ سمجھا جانے لگا اس وقت سے یہ رجحان زیادہ تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اخبار ایک ہی فرد یا سرمایہ دار خاندان کے ہاتھ میں اکٹھا ہو جائیں اور ایک ہی اخبار کئی اہم شہروں سے نکلے۔ سرمایہ دار خاندانوں کی "نظر عنایت" سب سے پہلے انگریزی اخباروں پر پڑی کہ اس وقت انگریزی صحافت کی آواز میں اثر ہے۔ اس کے بعد ہندی اخباروں کا نمبر آیا ہے جس نے آزادی کے بعد سے کافی اہم مقام حاصل کر لیا ہے اور اب تو یہ رجحان اردو صحافت میں بھی پیدا ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر اردو ملاپ کا نام پیش کیا جا سکتا ہے جو بیک وقت دہلی، جالندھر اور حیدرآباد سے شائع ہوتا ہے۔ ٹائمز آف انڈیا سیٹھ ڈالمیا کے لئے نہ صرف ایک نفع بخش صنعت ہے بلکہ اسی اخبار کے ذریعہ وہ ایک طرف اپنے طبقاتی مفاد کو محفوظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور تمام مسائل پر اپنے اور اپنے طبقے کے مفاد کے نقطہ نظر سے رائے زنی اور تنقید کرتے ہیں اور دوسری طرف سیاسی میدان میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے یا برقرار رکھنے کے لئے اسے ایک ہتھیار کی طرح استعمال کرتے ہیں۔

یہی حال ہندستان ٹائمز، سرچ لائٹ اور لیڈر جیسے اخباروں کا ہے جو سیٹھ برلا کی تجوریاں بھرنے کے علاوہ ان کے

معاشی اور سیاسی مفاد کی نگرانی کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں اور بالکل یہی بات ایکسپریس گروپ پر صادق آتی ہے جو گوئنکا کے مفاد کا محافظ ہے۔ انگریزی روزناموں کے علاوہ ان گروپوں نے ان ہی اخباروں کے ساتھ ساتھ ہندی اور دوسری زبانوں کے اخبار یا رسالے بھی جاری کر رکھے ہیں۔ یہاں یہ بتانا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان تین گروپوں میں سے دو گروہوں نے شادی کے ذریعہ ایک دوسرے سے رشتہ داری بھی قائم کر لی ہے۔

جب اخبار بڑے سرمایہ دار خاندانوں کے ہاتھ میں ہوں تو یہ اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان اخباروں کا مقصد کیا ہوگا۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں ان اخباروں کو یہ لوگ اپنے نجی اور طبقاتی مفاد کے لئے استعمال کرتے ہیں لیکن اب تو یہ بات بھی منظر عام پر آرہی ہے کہ بیک وقت ایک ہی اخبار کے مختلف مقامات سے ایڈیشن نکالنے کے پیچھے ایک جذبہ اور بھی کارفرما ہے کہ کس طرح اپنے سرمائے کو مختلف سمتوں میں تقسیم کیا جائے اور اس طرح اگر ایک طرف ٹیکس سے بچنے کی کوشش ہوتی ہے تو دوسری طرف ایک اخبار کا منافع دوسرے اخبار میں لگا کر منافع کو کم کر کے دکھایا جاسکتا ہے اور اخبار میں کام کرنے والوں کی تنخواہوں میں اضافہ کو بھی روکا جاسکتا ہے کئی مقامات سے ایڈیشن نکالنے سے اسٹاف بھی کم کیا جاسکتا ہے اور اس طرح منافع کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔

اس "زنجیری" صحافت نے ملک کو مختلف مسائل سے دوچار کر دیا ہے۔ ایک طرف تو ہر باشعور انسان محسوس کرنے لگا ہے کہ بڑے اخباروں کا اصل مقصد خبریں پہنچانا نہیں بلکہ اپنے گروہ یا طبقے کے حامی مفاد کو آگے بڑھانا اور اس کے لئے ہر جھوٹ کو سچ کر دکھانا ہے اور دوسری طرف چھوٹے صوبائی اخبار بڑے سرمایہ سرمایہ داروں کے لئے بے انتہا سرمایہ اور ان کی نہ ختم ہونے والی مسابقتی قوت کے سامنے ہتھیار ڈال دے رہے ہیں۔ ان اخباروں کی اشاعت کم سے کم تر ہوتی جارہی ہے' کچھ اخبار بند ہو رہے ہیں اور جو زندہ رہنے کی کوشش میں مصروف ہیں انھیں ایسی ترکیبوں اور چالوں کا سہارا لینا پڑ رہا ہے جو صحافت کو بدنام کر دیتی ہیں۔ اپنی اشاعت بڑھانے کے لئے یہ اخبار سنسنی خیز خبروں اور سرخیوں، شہوانی خبروں یا تصویروں، من گھڑت قصوں اور جذبات بھڑکانے والے مضامین کا سہارا لیتے ہیں۔ حیدرآباد اس کی بہترین مثال ہے۔ یہاں ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب اردو روزناموں کی تعداد بیس سے زیادہ پہنچ گئی تھی اور غالباً اب بھی بہت سے اخبار ڈیکلریشن باقی رکھنے اور موقع پڑنے پر "خاص ایڈیشن" نکالنے کے لئے کبھی کبھی جلوہ گر ہو جاتے ہیں جو چند اخبار سرکاری اور غیر سرکاری اشتہاروں اور سرمایہ کے سہارے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئے اور ان کے پروپرائٹر اچھا خاصا منافع کمانے لگے۔ اب وہ اس پوزیشن میں ہیں کہ پی ٹی آئی کی خبریں بھی حاصل کر سکتے ہیں اور چھ صفحات روزانہ لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچا سکتے ہیں۔ پھر انگریزی اخباروں نے بھی اپنا مارکٹ پیدا کر لیا تھا اس لئے لازمی طور پر کم سرمایہ والے اخبار مشکلات محسوس کرنے لگے۔ کئی اخبار اس مقابلے کی تاب نہ لا کر بند ہو گئے اور چند نے دوسرا طریقہ اختیار کیا یعنی سنسنی خیز خبریں شائع کرنا۔ حیدرآباد کی مخصوص فضا میں فرقہ پرستی کو ہوا دینا ان اخباروں کے ہاتھ میں ایک اچھا خاصہ ہتھیار ثابت ہوا اور اب ان کا وجود صرف اسی سنسنی خیزی کی بنیاد پر قائم ہے۔

اس "زنجیری" اور سرمایہ دارانہ صحافت کا نتیجہ ہے کہ پنڈت نہرو کے قائم کئے ہوئے اخبار "نیشنل ہیرالڈ" کو معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور اب وہ صرف یو۔ پی کے ایک مخصوص حلقے کا اخبار ہو کر رہ گیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ایسے اخبار بھی اس "زنجیری صحافت" کی زد سے نہ بچ سکے جنھوں نے میدان صحافت میں ایک مخصوص سنجیدہ مقام حاصل کر لیا تھا۔ چنتامنی کے اخبار "لیڈر" پر سیٹھ برلا کی نظر پڑی اور اپنی ساری روایات کو ختم کر کے وہ برلا جی کا ترجمان بن گیا۔

صنعتی میدان میں اجارہ داری چھوٹی صنعتوں کو تباہ کر دیتی ہے لیکن صحافتی میدان میں اجارہ داری نہ صرف چھوٹے اخباروں کو ختم کرتی ہے بلکہ سیاسی میدان میں بھی اجارہ داری کے جال بچھا دیتی ہے۔ اخباری جھوٹ کے ذریعے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش

کرتی ہے اور صاحب اقتدار عناصر کو اپنے اشاروں پر چلانے کی کوشش کرتی ہے۔

خبریں اور خبر رساں ایجنسیاں

ہمارے اخبار اپنے معاشی اور سیاسی مفاد کے پیش نظر صرف ایسی ہی خبریں شائع کرتے ہیں جو ان کے لئے مناسب ہوتی ہیں اور اگر وہ مجبور ہو کر دوسری قسم کی خبریں شائع بھی کرتے ہیں تو اتنی رنگ آمیزی کے ساتھ کہ اس خبر کی صورت ہی مسخ ہو جاتی ہے اور سیاہ دلاویز ہی اس کا نام ہو کر رہ گیا ہے۔ مثال کے طور پر بلاشبہ خبر رسانی شاید کچھ لوگوں کو یہ معلوم کر کے حیرت ہو کہ چار بڑے وزراء خارجہ کی برلن کانفرنس میں یورپی اجتماعی تحفظ کے متعلق سوویت روس کے وزیر خارجہ مولوٹوف کی تجویز کو مغرب کے کئی اخباروں نے شائع ہی نہیں کیا اور اگر شائع بھی کیا تو اپنے الفاظ میں گہری رنگ آمیزی کے ساتھ اور یہ صرف مغرب ہی میں نہیں ہوا بلکہ ہندوستان کے زیادہ تر اخباروں نے مولوٹوف کی تقریروں کو اتنا مختصر کر کے شائع کیا کہ اکثر وہ بیشتر بے معنی ہو گئیں یا ان تقریروں کے ساتھ اپنے نامہ نگاروں کی رنگ آمیزی بھی شائع کر دی کہ لوگ اس چیز کو دیکھ ہی نہ سکیں۔ آج کل غالباً آپ کو ہر صبح اخبار میں "آئرن کرٹن" (آہنی پردہ) کا ذکر پڑھنا پڑتا ہوگا جسے ہمارے اخبار اس طرح استعمال کرتے ہیں گویا اب اس لفظ اور اس کے مفہوم کی صداقت کو ہر شخص تسلیم کر چکا ہے۔ حالانکہ سوویت روس کے متعلق افترا پردازی کرنے والوں کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ سوویت روس آہنی پردے کے پیچھے چھپا ہوا نہیں بلکہ مغربی ممالک نے اپنی اندرونی کڑوی حقیقتوں کو چھپانے کے لئے جھوٹ کی ایک دیوار کھڑی کر رکھی ہے۔ آپ غالباً اخباروں میں اکثر وبیشتر *Russia's Sattalite* (روس کے حاشیہ برداروں) کا ذکر پڑھتے ہوں گے اور وہ بھی ایسے اخباروں میں جو برطانوی اور امریکی سامراجیت کے قیام کو دل و جان سے سراہتے ہیں۔ ان اخباروں کے ایک یا دو صفحے سٹے بازی، نیویارک کاٹن کے بھاؤ، اسٹاک ایکسچینج کے اتار چڑھاؤ اور گھوڑ دوڑ کی ٹپ سے بھرے ہوتے ہیں لیکن ٹیگور جیسے شاعر کی برسی کے موقع پر شاعروں اور ادیبوں کی تقریریں ان میں صرف چار سطروں تک جگہ پاتی ہیں اور امن کے جلسوں اور جلوسوں کی خبریں چھپنے کے انتظار ہی میں دم توڑ دیتی ہیں۔

صرف ہمارے اخبار ہی اس جرم کے مرتکب نہیں ہیں۔ ہندوستان کی خبر رساں ایجنسیاں بھی اس ڈھرے پر چل رہی ہیں۔ ہندوستان میں قومی اعتبار سے دو خبر رساں ایجنسیاں ہیں۔ پریس ٹرسٹ آف انڈیا (پی ٹی آئی) اور یونائیٹڈ پریس آف انڈیا (یو پی آئی)۔ پی ٹی آئی نے پرانے اے پی آئی کی جگہ لی ہے اور اس کا سارا کاروبار ملک کے چند بڑے اخباروں کے مالکوں کے ہاتھ میں ہے جس کے صدر سیٹھ گوئنکا ہیں جو بذات خود جنوبی ہندوستان کے بہت بڑے سرمایہ دار ہیں اور اخباروں کے ایک گروپ کے مالک ہیں۔ پی ٹی آئی نے برطانوی خبر رساں ایجنسی رائٹر سے یہ معاہدہ کیا ہے کہ وہ ہندوستان سے باہر کی تمام خبریں اسے حوالے کرے اور وہ ہندوستان سے باہر کے لئے ساری ہندوستانی خبریں اس کے حوالے کیا کرے گی۔ اس طرح ہم ساری بیرونی خبریں برطانوی خبر رساں ایجنسی رائٹر کے ذریعہ سے پڑھتے ہیں اور قومی خبریں پی ٹی آئی کے ذریعہ اور اسی طرح باہر کے کئی ممالک میں لوگ ہندوستان کی خبریں [illegible] پی ٹی آئی کی بھیجی ہوئی خبروں سے حاصل کرتے ہیں۔

یو پی آئی نسبتاً چھوٹی ایجنسی ہے جس پر ایسے لوگوں کا قبضہ ہے جن کے متعلق عام خیال ہے مشہور رہی کہ اس پر عزیز و اقارب کا اجارہ ہے۔ اس نے بھی بیرونی خبریں حاصل کرنے کے لئے ایک فرانسیسی ایجنسی سے معاہدہ کر رکھا ہے جسے وہ اس کے بدلے میں ہندوستانی خبریں دیتی ہے۔

اس کے علاوہ ہندوستان کے اخباروں کو چند ایسے خبر رساں ادارے بھی خبریں بہم پہنچاتے ہیں جن کا تعلق بیرونی ملکوں سے ہے۔ ان میں خاص طور پر قابل ذکر یونائیٹڈ پریس آف امریکہ (یو پی اے) نیز انیڈ فار ایسٹ نیوز ایجنسی (نافن) اور ایسوسی ایٹیڈ آف امریکہ (اے پی اے) ہیں ___ موخر الذکر ادارہ ہندوستانی خبروں کو صرف بیرونی اخباروں کے لئے بھیجتا ہے۔ ان کے علاوہ سوویت روس کا خبر رساں ادارہ تاس اور چین کا نیو چائنا نیوز ایجنسی بھی ہیں جن کا مقصد زیادہ تر ہندوستانی خبروں کو اپنے ملکوں کو بھیجنا ہے۔

قومی اعتبار سے ہندوستان کا سب سے اہم خبر رساں ادارہ پی ٹی آئی ہے جو ملکی خبریں دیتا ہے اور رائٹر کے ذریعہ بین الاقوامی خبریں

بھی۔ پی ٹی آئی اور رائٹر کے درمیان اس معاہدے کے پیچھے بھی ایک دلچسپ حکایت ہے۔ ۱۹۴۸ء کے بعد حکومت ہند نے یہ شرائط عاید کردیں کہ چونکہ ٹیلی پرنٹرس کی سہولتیں محدود ہیں اسی لئے ٹیلی پرنٹر دیتے وقت پہلے ہندستانی اداروں کا خیال کیا جائے گا اور اس کے بعد بیرونی اداروں کی باری آئے گی۔ رائٹر کے لئے یہ ناممکن ہوگیا کہ وہ ٹیلی پرنٹر کی سہولتیں براہ راست حاصل کرے اس لئے اس نے فوراً پی ٹی آئی کے ساتھ ایک معاہدہ کرلیا جس کی شرائط بڑی حد تک صیغہ راز میں ہیں۔ گویا صحافتی میدان میں وہی کچھ کیا گیا جو سیاسی میدان میں ۱۹۴۷ء میں ہوا تھا۔ حالانکہ رائٹر کو مجبور ہو کر پی ٹی آئی کے ساتھ یہ معاہدہ کرنا پڑا لیکن اب بھی سنجیدہ حلقوں میں اس خیال کا اظہار کیا جارہا ہے کہ پی ٹی آئی نے اس بہتر پوزیشن کے باوجود ایسی شرائط بھی قبول کرلیں جنھیں وہ آسانی سے رد کرسکتا تھا۔

رائٹر وہ رسوائے زمانہ خبر رساں ادارہ ہے جس نے برطانوی سامراج کی خدمت گزاری کو اپنا مقصد اولین قرار دیا ہے۔ یہی وہ ادارہ ہے جس نے انگریزی راج کے زمانے میں ہندستانی قومی تحریک کو "غنڈہ گردی" اور "غیر ذمہ دارانہ لوگوں کی بے ہودگی" کا نام دے کر دنیا میں بدنام کیا۔ یہی وہ ادارہ ہے جس نے بیرونی ممالک کے لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ انگریزوں کا راج ہندستان کے لئے امن وامان اور خوشحالی وترقی کا ضامن ہے اور یہ کہ قومی تحریک کو ہندستانیوں کی تائید حاصل نہیں ہے۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ہم تک بیرونی خبریں پہنچانے میں اسی ادارے کو تقریباً اجارہ دارانہ حیثیت حاصل ہے۔

رائٹر ہی کا کرشمہ تھا جس نے ہمارے اخباروں کے ذریعہ ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کی کوریا کی جنگ کی اصل وجہ جنوبی کوریا پر شمالی کوریا کا جارحانہ حملہ تھا حالانکہ واقعات اس کے بالکل برعکس تھے۔ رائٹر ہی کا کارنامہ ہے کہ وہ ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کررہا ہے کہ ملایا، انڈونیشیا، کینیا، یوگنڈا، برٹش گیانا، فلپائن اور دوسرے غلام ملکوں میں آئے دن انگریزوں، فرانسیسیوں اور امریکیوں کو جو قتل عام کرنا پڑرہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے چند لوگ قاتل، لٹیرے، ڈاکو اور وحشی ہیں۔ اسی نے کینیا کے آزادی پسندوں کو "ماؤ ماؤ دہشت پسند" کا نام دیا، ملایا کے جانبازوں کو "کمیونسٹ دہشت پسند" کا لقب دیا اور جب ویت منھ کی سپاہ آزادی کو کوئی اور نام نہ دے سکا تو یہی کہہ کر دل کی بھڑاس نکالنے لگا کہ ہوچی منھ ماسکو کا غلام ہے۔ یہی وہ ادارہ ہے جو چین میں روزانہ "قحط اور بلوے" کی اور سویت روس میں روزانہ "غلاموں کے کیمپ" کے من گھڑت قصے سناتا ہے اور سامراجی ممالک کے جارحانہ عزائم اور مکروہ چہروں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ رائٹر نے دروغ گوئی کو فن کی سطح تک پہنچانے کی کوشش کی ہے لیکن اسے کیا کیا جائے کہ جھوٹ ایک دن کھل کر ہی رہتا ہے۔

رہ گیا پی ٹی آئی کا معاملہ سو ہم سب جانتے ہیں کہ اس ادارے پر بڑے سرمایہ داروں اور بڑے اخباروں کا قبضہ ہے اور ان ہی کی خواہشوں کے مطابق وہ صرف خبریں چھانٹتا اور مسترد کرتا بلکہ گڑھتا بھی ہے۔ اب تو پی ٹی آئی نے اپنا حدود اربعہ بھی بڑھانا شروع کردیا ہے۔ اس ادارے کی خبریں صرف اخباروں، آل انڈیا ریڈیو اور حکومت کے اداروں ہی تک محدود نہیں بلکہ اس نے اپنی خدمات سے بازوں اور نجی کاروبار کرنے والوں کو بھی پیش کردی ہیں، اس لحاظ سے ایجنسی کے کردار میں بھی تبدیلی ہوتی جارہی ہے اور اب اس کا ایک معتد بہ حصہ بازار کے بھاؤ، سٹے کی خبروں اور گھوڑ دوڑ کی مہم میں صرف ہوجاتا ہے۔

زیادہ دلچسپ حقیقت تو یہ ہے کہ مرکزی سرکار اور ریاستی حکومتیں بھی اس کی سرپرستی کرتی ہیں۔ اس کی خبریں حاصل کرنے کے لئے مختلف سرکاری محکموں سے ہزاروں روپیہ ادا کئے جاتے ہیں اور اکثر و بیشتر یہ رقم ادارے کی عام فیس سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ایک طرف تو ٹیلی پرنٹرس کی سہولتوں کی کمی کا رونا رویا جاتا ہے لیکن دوسری طرف امریکہ کے ایک خبر رساں ادارے یو پی اے کو ٹیلی پرنٹر کی سہولت دی جاتی ہے۔ یعنی امریکہ کے ایک ادارے کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ نہ صرف ہندستانی خبر رساں ایجنسیوں کا مقابلہ کرے بلکہ اپنے خاص نقطۂ نظر کی اشاعت بھی کرے۔ اس حقیقت کو آنے والے پاک امریکی فوجی

معاہدے کی روشنی میں دیکھئے تو اس کا خطرناک پہلو سامنے آجائے گا۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ پی ٹی آئی کی خبریں پاک امریکی معاہدے کے خطرناک پہلو کو چھپا کر اس کی غیر موجود برکتوں کی قصیدہ خوانی کر رہی ہیں؟ اگر یہ حقیقت ہے تو کیا اسے قومی مفاد کے پیش نظر برداشت کیا جا سکتا ہے؟

بیرونی اثرات

اس سلسلے میں ایک اور اہم سوال بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔ کیا کوئی ملک رائے عامہ کو ہموار کرنے کے شعبے میں کسی بیرونی ملک اداروں کو مداخلت کرنے کی اجازت دے سکتا ہے؟ اور کیا یہ اجازت اس ملک کے قومی مفاد کے مغائر نہ ہوگی؟ صحافت جیسے اہم میدان میں کسی بیرونی عنصر کو کھلی آزادی دے دینا نہ صرف غلط بلکہ خطرناک بھی ہے کیونکہ اس طرح ہم ان عناصر کو آزادی دے دیتے ہیں کہ وہ اپنے ملک یا اپنے نجی مفاد کے لئے ہمارے ملک کی رائے عامہ کو ہموار کریں اور اس بات کا کافی امکان ہے کہ ان عناصر کا مفاد ہمارے ملک کے مفاد کے عین خلاف ہو لیکن آج ہندستان میں نہ صرف ایسے عناصر کو برداشت کیا جا رہا ہے بلکہ ان کی ہمت افزائی بھی کی جا رہی ہے۔ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد انگریز سرمایہ داروں کے مفاد کی نمائندگی کرنے والا اخبار اسٹیٹس مین اب تک شائع ہو رہا ہے اور نہ صرف کلکتہ سے بلکہ دہلی سے بھی شائع ہوتا ہے۔

برطانوی عناصر کے ساتھ ساتھ امریکی عناصر بھی اب ہندستانی صحافت میں قدم رکھ رہے ہیں نہ صرف یہ کہ ہندستان میں امریکی محکمۂ اطلاعات بہت خود اخبار اور بلیٹن نکالتا، مفت کتابیں اور پرچے تقسیم کرتا ہے بلکہ اب امریکی ڈالر نے خود ہندستانی صحافت کو بھی خرید لینے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ چند ہندستانی اخبار تو ایسے ہیں جنھیں غالباً براہ راست امریکی امداد تو نہیں ملتی لیکن وہ امریکہ کا پروپیگنڈا ضرور کرتے ہیں کیونکہ ان کے پروپرائٹر کا مفاد امریکہ سے وابستہ ہو چکا ہے۔ اگر سیٹھ برلا نے امریکی کمپنی اسٹوڈی بیکر سے تجارتی معاہدہ کیا تو ان کے اخبار ہندستان ٹائمز نے وکالت شروع کی کہ ہندستان کو اپنی غیر جانبدارانہ خارجی پالیسی ترک کر کے امریکہ سے رشتہ مضبوط کرنا چاہیے، ان کے دوسرے اخبار ایسٹرن اکانمسٹ نے بھی بالکل یہی راگ الاپنا شروع کیا اور اس نے بھی مشورہ دیا کہ حکومت ہند کو "امریکہ کی طرف جھکنا چاہیئے۔"

ممکن ہے سیٹھ برلا کے اخباروں نے امریکہ سے دوستی کا نعرہ صرف برلا جی کے معاشی مفاد کی وجہ سے لگایا ہو اور انھیں امریکی امداد نہ ملی ہو لیکن اب ہندستان میں ایسے اخبار بھی مل جائیں گے جنھیں امریکی ڈالر نے خرید لیا ہے۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ امریکہ ایک خاص پالیسی کے تحت کروڑوں ڈالر اس بات پر صرف کر رہا ہے کہ دوسرے ملکوں کے دانشوروں، ادیبوں، اخبار نویسوں اور سیاستدانوں کو خرید لیا جائے۔ صرف ۱۹۵۱ء میں امریکہ نے اس غرض کے لئے ہندوستان میں ۸۰۴۹,۳۶۹ ڈالر خرچ کئے۔ ۱۹۵۲ء میں (۱۳۲) ہندستانی امریکہ کا دورہ کرنے گئے، کے اخراجات امریکی حکومت نے برداشت کئے۔ جرنلسٹوں پر بھی خاص نظر عنایت کی جا رہی ہے اور اب تک کئی اخبار نویس امریکہ کا دورہ کر چکے ہیں۔

چند مہینے قبل دہلی کے پرانے ہفتہ وار اخبار "ریاست" نے یہ انکشاف کیا تھا کہ ہندستان کے کئی اخباروں کو امریکی امداد مل رہی ہے۔ سردار دیوان سنگھ مفتون نے بتایا تھا کہ اردو اخباروں ملاپ اور پرتاپ کو کئی ہزار ڈالر ملے ہیں۔ ان کے ایڈیٹروں کو امریکہ کے دورے کے زمانے میں روزانہ ... روپے ادا کئے جاتے تھے۔ انھوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ ایک انگریزی اخبار کے ایڈیٹر کو ایک لاکھ روپے امریکی سفارت خانے سے اس شرط پر ملے کہ وہ اپنے اخبار میں امریکہ کی تائید میں مضامین لکھیں لیکن ایڈیٹر مذکور امریکی سفارت خانے سے بھی زیادہ چالاک نکلے۔ انھوں نے روپے لینے کے بعد امریکہ کی تائید میں مضامین لکھنے اور شائع کرنے سے انکار کر دیا۔ امریکی عہدے دار عجیب شش و پنج میں پڑ گئے کہ اگر مقدمہ چلائیں تو خود اپنے کرتوتوں کا [illegible] ہوتا ہے اور اگر مقدمہ نہ چلائیں تو ایک لاکھ روپیہ ہاتھ سے جاتا ہے آخر میں یہ طے کیا گیا کہ مقدمہ نہ چلایا جائے کیونکہ مقدمہ [illegible] یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا امریکی ادارے کسی ہندستانی ادارے کو اس طرح روپے دے سکتے ہیں۔ دیوان سنگھ مفتون نے امریکی [illegible] عہدے داروں کو چیلنج کیا تھا کہ اگر ان کے اس بیان میں کچھ بھی

غلط بیانی ہے تو وہ ان پر ہتک عزت کا مقدمہ چلائیں لیکن اب تک مفتوں پر کسی قسم کا مقدمہ نہیں چلایا گیا۔

عربی، اردو ہی نہیں انگریزی اور دوسری زبانوں کے اور کئی اخبار ہیں جنھیں کسی نہ کسی شکل میں امریکی امداد مل رہی ہے تاکہ وہ ہندستان کی رائے عامہ کو امریکہ کی تائید اور سوویت روس اور چین کے خلاف ہموار کرسکیں۔ انگریزی ہفتہ وار کرنٹ کے امریکہ نواز اڈیٹر ڈی۔ ایف کراکا نے نیویارک ٹائمز کو ایک دلچسپ خط لکھا تھا جس سے اس سوال پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے ۲۳ر جولائی ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں لکھا۔

"چند ہفتے قبل میرے اخبار کرنٹ کے دفتر میں یونائیٹڈ اسٹیٹس انفارمیشن سروس (امریکی اطلاعاتی بیورو) کا ایک رکن آیا۔ وہ مجھے میرے اخبار کے پہلے صفحہ پر شائع شدہ ایک مضمون کے متعلق مبارکباد دینے آیا تھا جس کا عنوان تھا "جنگ ناگزیر ہے" اور جس میں وزیر اعظم نہرو کی غیر جانبدارانہ خارجی پالیسی پر تنقید کی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ امریکہ جس طرح جنگ کے ناگزیر ہونے کے تصور کے خلاف جنگ کر رہا ہے۔ پنڈت نہرو کی پالیسی اس سے میل نہیں کھاتی۔ ہم سے کہا گیا کہ ہندستان میں اس مضمون کی اشاعت اور زیادہ ہونی چاہیے جس سے ہم یہ سمجھے کہ وہ ہم سے یہ درخواست کرنے آیا ہے کہ ہم امریکی اطلاعاتی بیورو کو اس کی بار دیگر اشاعت کی اجازت دیدیں ہم نے کہا کہ ہمیں اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اس نوجوان نمائندے کی ذہن میں یہ بات نہ تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہمارا اخبار اس پیغام کو اور زیادہ وسیع پیمانے پر لوگوں تک پہنچائے۔ اس نے کہا کہ اس سلسلے میں جو اخراجات ہوں گے ان کے لئے روپیہ کا انتظام کر دیا جائے گا"

مسٹر کراکا جیسے امریکہ کے دوست صحافی کے اس بیان کے بعد شک کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ امریکی ڈالر بہت تیزی سے ہندستانی اخباروں کو خریدنے کے لئے استعمال کئے جا رہے ہیں اور یہ تلخ حقیقت بھی ہمارے سامنے ہے کہ اس خفیہ سازش کو روکنے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔ پاک امریکی معاہدہ کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہم ان واقعات کو نظر انداز کر کے اپنے ملک میں پانچویں کالم کو پناہ دے رہے ہیں۔

چند اہم مسائل

یہاں چند ایسے مسائل کی طرف توجہ دلانا بھی نامناسب نہ ہوگا جن سے آج ہندستانی اخبار دو چار ہیں اور جن کا اثر بالآخر قارئین پر بھی پڑتا ہے۔ ان میں سے ایک مسئلہ ہے اشتہاروں کا۔ سب ہی جانتے ہیں کہ زیادہ تر اخباروں کی زندگی کا دار و مدار اشتہاروں کی آمدنی پر ہوتا ہے بلکہ بڑے اخباروں کے لئے تو یہی منافع کا ذریعہ ہے۔

ظاہر ہے اخباروں میں اشتہاروں کی اشاعت پر اصولاً کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا لیکن جن لوگوں کو صحافت سے تھوڑا بہت بھی لگاؤ ہے وہ بخوبی محسوس کر سکتے ہیں کہ آجکل کے حالات میں اشتہارات اخباروں کے کردار، خبروں کے چناؤ، اڈیٹوریل پالیسی اور عام مضامین کے مجموعہ پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنا اخبار غور سے پڑھتے ہیں تو غالباً آپ نے اکثر و بیشتر یہ بھی دیکھا ہوگا کہ آپ کے ہی اخبار میں شائع ہونے والے اشتہار کے متعلق کچھ باتیں ایسی بھی شائع ہوتی رہتی ہیں جنھیں عام طور پر خبر کہا جاتا ہے۔ بات دراصل یہ ہوتی ہے کہ مشتہرین اپنے اشتہار کے ساتھ ساتھ اپنے مال کے متعلق ایک خبر یا مضمون یا انگریزی میں جسے "ریڈنگ اپ" کہتے ہیں لگا دیتے ہیں تاکہ اگر اشتہار پر آپ کی نظر نہیں پڑی تو کم سے کم خبروں کے بہانے اس مال کی خوبیوں سے آپ واقف ہو جائیں گے جس اخبار میں سینما کے اشتہارات زیادہ نکلتے ہوں اس میں آپ نے کسی فلم پر مخالفانہ تبصرہ شاذ و نادر ہی پڑھا ہوگا۔ اس کے برخلاف ایسے ریویو زیادہ پڑھے ہوں گے جن سے آپ کو سخت اختلاف ہوگا۔ یہ سب اشتہاروں کا معجزہ ہے۔

بڑے کارخانے اور تجارتی فرم تو اس سے بھی زیادہ بڑے پیمانے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر کوئی کارخانہ اپنے مال کا اشتہار دیتا ہے تو ساتھ ہی یہ توقع بھی رکھتا ہے کہ اس اخبار میں نہ تو اس کارخانے کے تیار شدہ مال کے خلاف کوئی بات شائع ہوگی اور

ان صنعتی جھگڑوں، مزدوروں کی حالت اور ان کے مطالبوں کے متعلق کوئی بات شائع ہوگی جس سے مالک کارخانہ کو تقریباً روزانہ سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ اگر کسی سب ایڈیٹر نے غلطی سے کوئی ایسی خبر شائع کر دی تو دوسرے دن اسے ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ بڑے اخبار تو صرف اتنی احتیاط کرتے ہیں کہ اپنے مشتہرین کے خلاف کوئی بات شائع نہیں کرتے لیکن چھوٹے اخبار تو اپنی ایڈیٹوریل پالیسی کو بھی مشتہرین کی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر اس کا تجربہ ہے کہ ایک سینما کے مالک نے صرف اس لئے اشتہار دینا بند کر دیا تھا کہ ہمارے اخبار میں سینما کے ملازمین کی شکایتیں شائع ہوئی تھیں اور مجھے ذاتی طور پر ایسے اخباروں کا بھی علم ہے جو کوئی ایسی خبر شائع کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے جس سے اس کے مشتہرین خفا ہو سکتے ہیں۔

یہ بات خاص طور پر سرکاری اشتہاروں پر عائد ہوتی ہے۔ سرکاری اشتہار صرف اچھی آمدنی ہی کا ذریعہ نہیں بلکہ صحافتی دنیا میں عزت کا بھی ذریعہ ہیں۔ برطانوی حکومت کے زمانے میں تو سرکاری اشتہارات صرف ان اخباروں کو ملتے تھے جو انگریزوں کی شان میں قصیدے پڑھتے تھے۔ توقع تھی کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اس رویہ میں تبدیلی آئے گی لیکن افسوس تو یہ ہے کہ آج کل بھی اخباروں کی ایک سیاہ فہرست تیار کی جاتی ہے جنھیں اشتہارات نہیں دئیے جاتے۔ سرکاری نمائندے عام طور پر تو یہی کہتے ہیں کہ سرکاری اشتہار دیتے وقت عہدے داروں کے پیش نظر صرف ایک ہی سوال رہتا ہے کہ اخباروں کی اشاعت کتنی ہے۔ مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ 'ٹائمز آف انڈیا' کا مشہور و معروف قصہ ہمارے ذہنوں میں اب بھی تازہ ہے جب بمبئی کی حکومت نے اشتہارات دینا صرف اس لئے بند کر دیا کہ 'ٹائمز آف انڈیا' کئی باتوں میں حکومت پر سخت تنقید کرتا ہے۔ یعنی اشتہارات دینے نہ دینے کا انحصار سیاسی بنیاد پر ہے۔ حکومت صرف ان ہی اخباروں کو اشتہارات دیتی ہے جو اس کی تائید کرتے ہیں اور اگر تائید کرنے والے اخبار بھی کسی وقت تنقید کرنے کی جرأت کرتے ہیں تو ان کے اشتہارات بند کر دیئے جاتے ہیں یا بند کرنے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ مخالف جماعت کے اخباروں کو سرکاری اشتہارات تقریباً بالکل نہیں ملتے۔ مغربی بنگال کے چیف منسٹر ڈاکٹر بی سی رائے نے بہت صاف طریقے سے اسمبلی میں اعتراف بھی کر لیا کہ اشتہارات دیتے وقت حکومت کے پیش نظر صرف اشاعت ہی نہیں بلکہ کئی اور سوال بھی ہوتے ہیں یعنی سیاسی سوالات۔

صحافت اور حکومت کے درمیان تعلق کا سوال بھی کافی اہم مسئلہ ہے جو دنیائے صحافت کو ایک عرصے سے پریشان کر رہا ہے۔ انگریزوں نے اپنی مخالفت کو روکنے اور کچلنے کے لئے ایک کے بعد ایک قوانین بنائے، اخباروں کے لئے نئی نئی زنجیریں ڈھالی گئیں اور آزاد اخباروں کی زبان بندی کر دی گئی۔ کئی اخبار بند کر دئیے گئے۔ کئی اخباروں سے ہزاروں روپے کی ضمانت طلب کی گئی، سنسرشپ کے قواعد اتنے سخت کئے گئے کہ چند اخباروں کو شائع کرنے سے پہلے ہر چیز سنسر کو دکھانی پڑتی تھی۔ اڈیٹروں اور صحافیوں کو جیل میں ڈالا گیا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود صحافت کی آزادی کی جدوجہد برابر جاری رہی۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ پریس کی آزادی کی یہ جدوجہد اب بھی ختم نہیں ہوئی کیونکہ اب بھی صحافت کے پیروں میں پریس ایکٹ کی زنجیریں ہیں۔

حال ہی میں صدر جمہوریہ نے اپنے خصوصی اختیارات کے تحت "قانون قابل اعتراض مواد" کی مدت میں توسیع کرنے کے لئے ایک آرڈیننس جاری کیا۔ یہ وہ قانون ہے جس کی مخالفت نہ صرف بائیں بازو کے اخباروں اور صحافیوں نے کی بلکہ آل انڈیا نیوز پیپر ایڈیٹرس کانفرنس جیسی جماعت نے بھی کی جس میں بڑے بڑے اخباروں کے مالکوں کے نمائندوں کا اثر ہے۔ اس کانفرنس نے مذکورہ بالا قانون کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اخباروں سے اپیل کی تھی کہ وہ نمایاں مقام پر یہ نعرہ لکھا کریں کہ "اظہار خیال کی آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے اور ہم اسے حاصل کر کے دم لیں گے۔"

اگر ایک طرف اس قانون کے ذریعہ حکومت کو اخباروں سے ہزاروں روپے کی ضمانت طلب کرنے کا حق حاصل ہے تو حکومت کے پاس سلامتی نظر بندی کا قانون بھی موجود ہے جس کے تحت وہ صحافیوں کو نظر بند کر سکتی ہے بلکہ کرتی ہے۔ غرض ابھی صحافت کو قدم قدم پر پابندیوں کا مقابلہ ہے اور اس لحاظ سے آزادیٔ صحافت کی جدوجہد تیز تر ہوتا ہے۔

آزاد صحافت کی جدوجہد

آزاد صحافت کی جدوجہد کے دو پہلو ہیں۔ مجموعی طور پر ہندستانی صحافت کو برسر اقتدار طبقوں کی عائد کردہ پابندی کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے اظہار خیال کی آزادی کا تحفظ کرنا اور اپنے حقوق کو منوانا ہے۔ لیکن جب ہم آزاد صحافت کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارا تصور اس سے بھی پرے جاتا ہے۔ اس مضمون میں اب تک جو کچھ باتیں پیش کی گئیں اگر وہ صحیح ہیں تو پھر لازمی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مجموعی حیثیت سے ہندستانی صحافت آزاد صحافت کہلائی جانے کی مستحق ہے؟ جو اخبار مختلف رشتوں ناتوں سے ایک مختصر گروہ کے مفاد کے تابع ہوں اور اس مفاد کے پیش نظر خبروں، اداریوں، مضامین اور کارٹونوں میں رنگ آمیزی کریں اور حقیقت کو صحیح اور صحت مند زاویہ سے دیکھنے اور پیش کرنے کے بجائے واقعات کو مسخ کریں انھیں آزاد صحافت کی برادری میں کس طرح شامل کیا جا سکتا ہے! ان اخباروں کے لئے تو خبر اب بھی یہ نہیں ہے کہ کتے نے آدمی کو کاٹا بلکہ خبر تو اسی وقت بنتی ہے جب آدمی کتے کو کاٹ لے۔ جنس، قتل، زنا، اغوا، ڈکیتی اور مارپیٹ ان کے محبوب عنوانات ہیں جن کے لئے وہ خبریں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ خوشحالی اور امن کیلئے عام انسانوں کی روزانہ کی جدوجہد ان کے لئے خبر یا تبصرے کی مستحق نہیں ہے۔ عام انسان کی صورت اگر ان اخباروں میں نظر بھی آتی ہے تو مسخ شدہ ہو یا تو کسی کے جیب کاٹنے سے جرائم اور "تشدد" کے مرتکب ہوتے ہیں اور اپنی "وحشیانہ خصوصیات" کا مظاہرہ کر کے برسر اقتدار طبقوں کو پریشان کرتے ہیں یا پھر ہر وقت "ناجائز" اور "غیر مناسب" مطالبات سے اپنے آقاؤں کو تنگ کیا کرتے ہیں۔

لیکن ان ہی عام انسانوں کی زندگی اور ان کی جدوجہد اپنی ترجمانی کے لئے آزاد صحافت کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہی عام انسان اپنی تحریکوں کو مربوط کرنے کے لئے اپنے اخبار مانگتے ہیں۔ ایسے اخبار نکالنا یا انھیں زندہ رکھنا آسان کام نہیں کیونکہ انھیں اگر ایک طرف برسر اقتدار طبقوں کے عتاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو دوسری طرف سرمایہ پرست اخباروں اور ان کی چالبازیوں کا سامنا کرنا ہوتا اور تیسری طرف اشتہاروں اور آمدنی کے دوسرے ذرائع کو خیرباد کہہ کر لوگوں کی عملی امداد پر بھروسہ کرنا ہوتا ہے۔

آزاد صحافت کی تاریخ پرانی ہے اور شاندار ہے۔ اس میں ان دلیر جنگجوؤں اور محبان وطن کا خون جگر شامل ہے جنھوں نے انگریزوں کے حلقہ بگوش پریس کے مقابلے میں آزادئ صحافت کے لئے جدوجہد کی۔ اردو میں مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، قاضی عبدالغفار جیسے لوگوں نے صحافت کی شاندار روایات قائم کی ہیں، انگریزی میں نیشنل ہیرالڈ جیسا اخبار تھا۔ جس نے پنڈت نہرو کی سرپرستی میں ابتدا کی اور انگریزوں کے تمام حملوں کا مقابلہ کرتا ہوا آج بھی سنجیدہ صحافت کی لاج رکھے ہوئے ہے۔ بالکل اسی طرح بنگالی، مراٹھی اور دوسری زبانوں کے اخباروں نے آزاد پریس کے لئے بڑی شاندار جدوجہد کی ہے اور اس راستے میں بڑی یادیں چھوڑی ہیں۔

لیکن آج کے بدلے ہوئے حالات میں یہ بوجھ کچھ اور ہی عناصر کو اٹھانا پڑ رہا ہے۔ گو اس کی ابتدا آج سے بہت پہلے انگریزی راج ہی میں ہوگئی تھی جب کہ محنت کش طبقات نے بھی اپنے رسالوں کے ذریعے دنیائے صحافت میں قدم رکھا تھا لیکن اب یہ جدوجہد اور بھی زیادہ تیز ہوگئی ہے کہ حالات کا یہی تقاضا ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ انگریزی میں نیشنل ہیرالڈ جیسے ایک ہی آدھ اخبار ہیں جو سنجیدہ اور آزاد صحافت کے پرچم کو بلند کئے ہوئے ہیں۔ دوسری زبانوں میں بھی حالات اسی قسم کے ہیں۔ ہزارہا مشکلات اور مخالفتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے چند اخبار اپنا پیغام لوگوں تک پہنچا رہے ہیں۔ اس جدوجہد کی سختیوں کو کچھ وہی خوب محسوس کر سکتا ہے جو عملی طور پر ان سے وابستہ رہا ہو۔ یقیناً مبارکباد کے قابل ہیں وہ اخبار جو ان مشکل حالات میں زندہ ہیں اور زندہ رہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کتنی شاندار تھی "نیا زمانہ" کی جدوجہد جس نے ہر حملہ کے بعد نیا روپ دھارا، کبھی "مزدور" ہوا کبھی "نئی زندگی" اور کبھی "سات دن"

لیکن جس نے روگوں سے اپنا رشتہ نہیں توڑا۔ جب کبھی ہندستانی صحافت کی تاریخ لکھی جائے گی یہ باب سونے کے حروف سے لکھا جائے گا۔ محسوس کیجئے ان ساعد حالات کو جن کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے جنوب کا واحد آزاد اردو اخبار "پیام" زندہ رہا اور اپنا پیغام لوگوں تک پہنچاتا رہا۔ قاضی عبد الغفار اور سبط حسن جیسے صحافیوں نے اسے پروان چڑھایا۔ اختر حسن جیسے صحافی نے مذہبی جنون کے جھگڑوں کے درمیان اس چراغ کو بجھنے نہ دیا لیکن آخر سرمایہ کی کمی نے اسے بھی خاموش کر دیا۔ شاید اس سے بھی زیادہ شاندار ہے دوسری زبانوں کے اخباروں کی وہ کہانی جو ان ناساعد حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے، مالی مشکلات کا حل نکالتے ہوئے عوام کی خدمت برابر کر رہے ہیں۔ یہ کہانی یقیناً ایک دن لکھی جائے گی اور ان ہی تجربوں کی بنیاد پر نئی صحافت جنم لے گی۔

ہندستانی صحافت کا ماضی شاندار ہے۔ آج سرمایہ کی گرمی نے ان روایات کو پامال کرنے کی کوشش کی ہے اور صحافت کو استحصالی طبقوں کی لونڈی بنا دیا ہے۔ لیکن آزاد صحافت کی جدوجہد برابر جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہیگی جب تک صحافت واقعی تمام زنجیروں کو کاٹ کر آزاد فضا میں سانس لینا نہیں شروع کرتی۔

اکبر الہ آبادی

ظ۔ انصاری

(اپنی شکست کی آواز)

سماج اور ادب کی تاریخ اس مرحلے سے آگے بڑھ گئی ہے جہاں وہ اکبر الہ آبادی کو جنم دے سکتی تھی، اب اردو شاعری دوسرے اکبر کو پیدا نہ کر سکے گی۔ کیونکہ ٹیلی ویژن اور ہائیڈروجن بم کے اس زمانے میں تاریخ کے ساتھ جغرافیے کا تصور بھی بدل گیا ہے اور مشرق و مغرب کا درمیانی فاصلہ روز بہ روز کم ہوتا جا رہا ہے۔

اکبر ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ کم سنی سے شاعری شروع کر دی تھی لیکن شاعری کی وہ سمت جس نے انھیں اردو ادب میں خاص مقام دیا ۱۸۷۰ء کے قریب شروع ہوئی جب ان کی عمر ۲۵، ۲۶ برس کے لگ بھگ تھی۔ یہ زمانہ اکبر کی شاعری کا پس منظر ہی نہیں ہے بلکہ اس کی روح بھی ہے۔ جس کے گہرے مطالعے کے بغیر اکبر پر کوئی مستقل لیبل لگانا بے جا ہوگا کیونکہ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ صرف رجحانات ہی نہیں بدلتے بلکہ وہ اسباب و حالات بھی بدل جاتے ہیں جو آرٹ کی مختلف ہیئتوں اور شکلوں کی راہ ہموار کرتے ہیں

سودا نے جب اپنا وہ مشہور قصیدہ لکھا تھا جس میں گھوڑے کی تیز رفتاری کو یوں بیان کیا گیا تھا کہ

حاضری کھائے جو کلکتے تو لندن میں ٹفن

اس وقت یہ مصرعہ انسانی خیال کے انتہائی مبالغہ کا ایک نمونہ تھا اور مبالغہ کا حسن ہی اس کی جان تھا۔ لیکن آج صرف ڈیڑھ سو برس کے فاصلے نے اس میں مبالغے کا حسن ختم کر دیا ہے اور اس کے بجائے حقیقت یا واقعیت کی سادگی پیدا کر دی ہے۔ آج نہیں تو پانچ سات سال کے بعد[1] یہ بالکل ممکن ہوگا کہ آدمی کی سواری صبح ۵ بجے کلکتے میں ہو اور دن کو ڈیڑھ بجے لندن پہنچ جائے ہم سودا کے اس شعر کی داد نہیں دے سکتے اگر ہم اسے اٹھارویں صدی کے حالات میں رکھ کر نہ دیکھیں۔

اکبر ۱۹ ویں صدی کے آخری برسوں کے ہندستانی ذہن کی پیداوار ہیں اور بیسویں صدی کی ابتدا تک ہندستانی درمیانی طبقے کی ایک بڑی تعداد کا ذہن ان کی شاعری کی زبان سے بولتا ہے۔

۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد شمالی ہندستان پر انگریزوں کی گرفت اور سخت ہو گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ اب برطانوی شہنشاہیت نے ہندستان کے نظام کو اپنے مفاد اور اپنے منشا کے مطابق اور زیادہ قوت کے ساتھ ڈھالنا شروع کر دیا اور عہد وسطیٰ کے ہندستان کی رہی سہی مدافعت بھی اس کے آگے بالکل بے بسی محسوس کرنے لگی۔ فوجی ہتھیاربند بغاوت کی ناکامی نے ذہنی، سیاسی اور تہذیبی ناکامی کی فضا طاری کر دی جو کم از کم ۲۰، ۲۵ برس تک برقرار رہی۔

---

[1] یہ پیرا ۱۹۴۵ء دسمبر کا لکھا ہوا ہے۔ ظ۔ ا

سب رس

لارڈ ڈلہوزی کے بعد لارڈ کیننگ کو برطانوی شہنشاہیت کا نمائندہ بنا کر بھیجا گیا تو ڈلہوزی کی سیاسی اور فوجی سخت گیری ضرور کم ہوئی لیکن اس کی جگہ تہذیبی اور معاشرتی سخت گیری اندر ہی اندر بڑھنے لگی ——— سر جان لارنس کے زمانے اور اس کے بعد سے مغربی سرمایہ داروں نے اگر ہندوستان میں ریلیں، ڈاک، تار اور روئی یا جوٹ کے صنعتوں کے جال بچھانے شروع کئے تو ان کے ساتھ نئے ترقی یافتہ، زیادہ خوش حال، زیادہ منظم سماج کی آمد نہیں ہوئی بلکہ یہ بھی نو آبادیاتی نظام کو مضبوط اور پائیدار بنانے کی تدبیر تھی تاکہ ہندوستان کو ایک زراعتی ملک کی حیثیت سے برطانوی صنعتوں کی نفع اندوزی کے لئے سدھایا جائے۔ نئے نظام کی حیرت انگیز قوت، پائداری اور امن کے حالات کی تنظیم سے جو اطمینان کی فضاء پیدا ہونی چاہیئے تھی وہ نہیں ہوئی کیوں کہ اس سطح کے نیچے نہ صرف یہ کہ عام ہندوستانی کی معاشی حالت روز بہ روز گرتی جا رہی تھی بلکہ اسے اپنی مکمل سیاسی شکست کے سامان کے ساتھ وہ حالات بھی نظر آ رہے تھے جن میں حاکم کے دل میں محکوم کی طرف سے بے اعتمادی اور تحقیر بھری ہوئی تھی۔ اوپر کے طبقوں میں ان لوگوں کی سرگرمیاں نظر آ رہی تھیں جو خود یا تو منافع خور تاجر تھے یا بڑے بڑے جاگیردار تھے یا اعلیٰ عہدوں کے لالچی اور ان سب کا دارومدار صاحب اقتدار انگریزوں کے دامن دولت سے وابستہ ہونے میں تھا۔ پھر ادھر بمبئی، کلکتہ اور مدراس یونیورسٹیوں کے سایۂ عاطفت میں ہندوستانیوں کی ایک نئی نسل پروان چڑھ رہی تھی۔ ان میں دولت مند تاجروں، بڑے بڑے جاگیرداروں اور خوش حال درمیانی طبقے کے بیٹے تھے جن کا مستقبل حکومت برطانیہ کی انتظامی اور تعلیمی پالیسی کا ایک پرزہ بن جانے میں پوشیدہ تھا۔

لارڈ میکالے کی تعلیمی اور تہذیبی پالیسی اپنا کام کر رہی تھی کہ

> "ہمیں ہندوستانیوں میں ایک ایسا طبقہ بنانا چاہیئے جو ہمارے اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان ترجمان بن جائے۔ خون اور رنگ کے اعتبار سے تو وہ ہندوستانی ہو مگر اپنے مذاق، اپنی رائے، الفاظ اور عقل و شعور کے لحاظ سے بالکل انگریز ہو۔"
> (۱۸۳۵ء۔ میکالے رپورٹ)

اس طرح حکمران اجنبی اور بے مزدور قوت کے لئے (Social Base) ہندوستانی زمین پر ایک سماجی بنیاد تیار کرنا انگریز کی انتظامی، تعلیمی اور تہذیبی پالیسی کا اصل مقصد تھا چنانچہ وہ سوشیل بیس پیدا ہو رہی تھی جو نکہ اور فن میں تو انگریزوں کی طرح گہری پر جوش اور اتھک نہ تھی لیکن انگریز نما اور انگریز ساز ضرور تھی اور برطانیہ کے ادھ کچرے افسروں کی کھوکھلی نقالی ہی کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کافی سمجھتی تھی۔

اکبر نے سرکاری ملازمت کی، روٹی کا کوئی اور سہارا نہ رہ گیا تھا اس لئے اور اپنی ذہانت اور محنت سے ترقی کرتے کرتے چند سال کے اندر اس مقام تک پہنچ گئے جہاں وہ انگریز کو، انگریزی کو اور کھوکھلی انگریزیت کو زیادہ قریب سے دیکھ سکتے اور اس کے ظاہر و باطن کے فرق کو سمجھ سکتے تھے۔ اس کے پہلے ہی جلووں نے اکبر کو بیزار کر دیا۔ اگر شاعر کی عالی شان سرپرستی کرنے والے ملک میں پہلے کی طرح زندہ ہوتے تو شاید اکبر سرکاری دفتر میں مسل خوانی چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے یا اگر عام ہندوستانی کی طرح متاثر اور مستقل ہو جانے والا دل و دماغ رکھنے کے ساتھ اگر ان میں مصائب کا سامنا کرنے کا حوصلہ ہوتا تب بھی وہ سرکاری نوکری سے استعفا دے دیتے۔ لیکن یہاں تو ساری قوم کا حوصلہ جواب دے چکا تھا۔ اکبر کس شمار و قطار میں تھے۔

انھوں نے دبی زبان سے احتجاج شروع کیا۔ یہ احتجاج غم زدہ تھا۔ بیزاری سے بھرا تھا اور اس میں انگریز اور اس کی نیت کو غصہ اور نفرت سے دیکھنے والوں کا جذبہ اور ایک بے بس سرکاری ملازم کی زبان پائی جاتی تھی۔

یہ بات غلط کہ ملک اسلام ہے ہند　　یہ جھوٹ کہ ملکِ لچھمن و رام ہے ہند

سب رس

ہم سب ہیں مطیع و خیر خواہ انگلش — یورپ کے لئے بس ایک گودام ہے ہند

اس "مطیع و خیر خواہ" کے اعلان میں منہ پھیر کر تھوک دینے کا جذبہ موجزن ہے۔

اسی جذبے اور حالات کی مجبوری میں کش مکش ہوئی اور بہت دن تک ہوتی رہی تب جاکر وہ انداز بیان ابھرا جس میں طنز کی تلخی اور مزاج کی چاشنی پائی جاتی تھی۔ یہ بھی ایک نمایاں مثال ہے ادبی تنقید کے اہم کلیے کی کہ معنوی کیفیت اپنے مطابق صوری انداز یا اظہار کے سانچے خود بنا لیتی ہے۔ ہیئت کی ساخت میں موضوع کو گہرا دخل ہے۔

اکبر کی ابتدائی غزلوں میں عاشقی کی رنگا رنگی، شباب کی جولانی اور روایتی عقاید کی پچہ کاری پائی جاتی تھی، طنز اور مزاج کا نام و نشان نہ تھا لیکن جیسے جیسے ان کی نگاہ گہری ہوتی گئی۔ قومی درد کی کسک بڑھتی گئی اور قومی بے بسی کے ساتھ اپنی مجبوریوں کا احساس ہوتا گیا تھا ہی ان کے شعر میں طنزیہ کیفیت اور ان کے طنز میں دھار پیدا ہوتی گئی۔

اب اور چاہیئے ہنگامہ کے واسطے کیا بات — یہی بہت ہے مشرف ہوئے اسلام سے ہم

جن لوگوں نے کلام اکبر کو ترتیب وار اور تاریخی سلسلے کے ساتھ پڑھا ہے انھیں یہ بات ضرور محسوس ہوئی ہوگی کہ اکبر کے ہاں شروع شروع میں طنز کا وار زیادہ تر ان افراد پر پڑتا ہے جو ان کے نزدیک محض عہدوں کے لالچ میں، سرکاری رعایتوں کی تمنا میں اور قوم کی نگاہ میں صاحب رسوخ اور با اثر کہلانے کے لئے مشرقی آداب، روایتی طور طریقوں، پرانے درمیانی طبقے کی معاشرت اور پرانی مذہبی تعلیم سے دور بھاگنے لگے تھے۔ بعد میں ایسے لوگوں کو وہ اداروں کی شکل میں دیکھنے لگے ہیں اور ان کو واضح کرنے کے لئے بالکل دیسی فضا سے کچھ نام تراش لیتے ہیں۔ مثلاً کلو، بدھو، رفاقی، لیڈر، شیخ، سید، انجمن، مس اور بیگم، لاٹ صاحب، گھسیٹا، پنڈت وغیرہ۔

اور جس طرح افراد کے خلاف جو غصہ تھا وہ مظاہر کے خلاف بیزاری میں تبدیل ہوا ایسے ہی مظاہر کے خلاف نفرت مستقل اداروں اور ان کے مقاصد اور ان کی سرگرمیوں کی شدید انتھک مخالفت میں تبدیل ہو گئی۔

یہ بات یوں ہی گزر جانے کی نہیں ہے بلکہ کافی غور طلب ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اکبر کے مشرقی احتجاج نے بالکل فطری راستہ اختیار کیا۔ ان کی شاعری بھی ان کی نگاہ اور ان کے جذبے کی طرح ناپختگی سے پختگی کی طرف، مشاہدے سے حقیقت کی طرف، حس سے ادراک کی طرف اور نفی سے اثبات کی طرف بڑھتی گئی ہے۔ یہ ہوا تب جاکے ان کے پرچار میں فن کی گہرائی اور دل کشی پیدا ہوئی۔ پروپگنڈا دھیرے دھیرے فن کے سانچے میں سمایا اور جب سما گیا تو اس طرح کہ دونوں یک جان و یک قلب بن گئے۔ اب ہم اکبر کے فن کو ان کے پروپگنڈے سے جدا نہیں کر سکتے اور یہ نہیں بتا سکتے کہ یہاں پروپگنڈے کی خاطر فنی حسن کو یا فن کی خاطر پروپگنڈا دلیو کو ختم کر دیا گیا۔ فکر اور جذبے کی ہم آہنگی کی یہ منزل بھی اکبر کے ہاں بڑی لمبی ریاضت کے بعد آئی ہے۔

شعر اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں — دل پہ گزری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

اکبر کے دل پر کم و بیش ۴۰ برس تک (۱۸۸۲ء سے ۱۹۲۱ء تک) کیا گزرتی رہی اور کیوں گزرتی رہی؟ یہ اصل سوال

---

(۱) چند جستہ جستہ اشعار اس کلیے سے مستثنا ہیں جہاں اکبر محض پھکڑپن پر اتر آئے ہیں۔ ط۔ ق

ہے اور اس سوال کا جواب بالکل واضح ہے۔ اول ان حالات کی صورت میں جو ۱۸۵۷ء کے دوران اور اس کے بعد ہندستان میں پائے جاتے تھے اور پھر ان تحریکوں کی صورت میں جو اسی دوران اور اس کے بعد یک وقت اور یکے بعد دیگرے ردعمل کے طور پر ہندستان کی خاک سے اٹھیں۔[1]

"ہندستان میں برطانوی راج کے تاریخی صفحات پر اگرچہ تباہ کاری کے سوا کوئی اور داستان نظر نہیں آتی لیکن انگریز کی قوت "تاریخ کے بے رحم ہاتھوں میں اوزار کی طرح کام کر رہی تھی" (مارکس یہی ہیں)

تاریخ کے بے رحم ہاتھوں نے انگریز کے خون آلود ہاتھوں کو اوزار کی طرح استعمال کر کے جو کام لیا اس کا حاصل تو بہت دیر بعد نظر آنا شروع ہوا۔ پہلے تو تباہ کاری کے زہریلے پھل ہی پکے۔

مقامی جاگیرداروں کے زوال نے کسانوں کو خوش حالی نہیں بخشی بلکہ انھیں اور نئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کاشتکاری پرانے خود کفائی نظام کے دائرے سے نکل کر تجارتی لائنوں پر چل پڑی تھی کہ اسے بار بار خوف ناک دھکے کھانے پڑے۔ قحطوں کا سلسلہ، آبیاری کا انتظام درہم برہم ہوتا۔ مالکوں کا بدلتے رہنا۔ فوجی افراتفری۔ لگانوں کی بھرمار زرعی پیداوار کا کم قیمت رہ جانا اور اس کے علاوہ سب سے بڑی مصیبت یہ کہ ہندستانی دستکاری کی تباہی، خاص طور سے کپڑے اور نیل کی صنعت کی بربادی نے دستکاروں کو بھی زمین کی پیداوار پر بوجھ بنا دیا جس سے پرانے کاشت کار اور نئے کاشت کار طبقے کی کمر اور بھی ٹوٹ گئی۔

جب دیہات اور قصبات میں تباہی اور افراتفری کا یہ دور دورہ ہو اس وقت زمیندار طبقے اور معمولی بیوپاری طبقے کی کیا حالت ہوگی۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پرانی دنیا لٹ رہی تھی اور اس کے ملبے سے نئی دنیا جنم نہیں لے رہی تھی۔ ماضی بعید کی یادیں خوشگوار تھیں، حال دردناک تھا، مستقبل نامعلوم اور گھپ اندھیرا

مغربی کل نے مجھ کو پیسا ہے میرا چونا ہے اور کلیسا ہے

---

[1] جو حضرات اس موضوع کا اور خاص طور سے اس زمانے کے ہندستانی ردعمل اور تاثرات کا تفصیلی جائزہ حاصل کرنا چاہیں ان کے لئے میں ذیل کے چند کتابیں تجویز کروں گا جو اکبر اور ان کے دور کو سمجھنے میں میرے لئے شمع راہ ثابت ہوئی ہیں۔

(۱) کارل مارکس کے خطوط ہندستان پر (K. Marx)
(۲) India Today (R. P. Dutt)
(۳) India struggles for freedom (ہیرن مکرجی)
(۴) تاریخ ہند .... آر، سی، مزمدار
(۵) " .... ڈاکٹر تاراچند
(۶) حیات جاوید .... مولانا حالی
(۷) مسلمانان ہند کا روشن مستقبل .... مولانا طفیل احمد منگلوری
(۸) حیات شبلی .... سید سلیمان ندوی
(۹) ہندستانی قومیت (جلد دوم و سوم) ..... ڈاکٹر سید عابد حسین
(۱۰) اسباب بغاوت ہند .... سر سید احمد خاں
(۱۱) ابن الوقت .... ڈاکٹر نذیر احمد

اس زمانے میں حاکم انگریزوں کا رویہ تعلیم یافتہ اور ان پڑھ، عوام اور خواص ہندستانیوں۔ کے ساتھ کس قسم کا تھا۔ اس کے لئے وارن ہیسٹنگز یا لارڈ ڈلہوزی کے "کارنامے" پڑھنے کی ضرورت نہیں بلکہ صرف اتنا جاننا کافی ہے کہ جیسا لارڈ رپن نے البرٹ بل کے ذریعہ ایک جج اصلاح کی کوشش کی اور انگریزوں اور ہندستانیوں کو قانون کی نظر میں یکساں سمجھنے کا ابتدائی قدم اٹھایا تو با اقتدار اور سرمایہ دار انگریزوں کی طرف سے طوفان برپا ہوگیا اور رپن کا اصل مشن ناکام کر دیا گیا

یہ پہلا موقع تھا جب بمبئی، کلکتہ اور مدراس یونیورسٹیوں سے اور ان کے آس پاس سے ابھرنے والی نئی نسل میں کچھ ایسے لوگ بھی آگے آئے جن کے حوصلے بلند تھے اور جو کارلائل، مل بنتھم اور آدم سمتھ کی کتابوں کو امتحان کی تیاری کے لئے نہیں بلکہ فرد کی آزادی اور قوم کی عزت کا مفہوم سمجھنے تک پڑھ چکے تھے۔ یہ قدرتی بات تھی کہ ہندوؤں میں ایسے لوگ زیادہ تھے کیوں کہ ہندو درمیانی طبقے نے ہی نئے تعلیمی انتظام سے زیادہ فیض اٹھایا تھا اور انگریزوں نے ابتدا میں سرپرستی بھی ان کی کی تھی۔ ان کے احساسات قریب قریب وہی تھے جو اکبر کے اس شعر سے ظاہر ہیں۔

نیشن وقعت کے کم ہونے کا ہے اکبر کو غم آفیشل عزت کا اس کو کچھ مزا ملتا نہیں

ٹھیک یہی دن تھے جب انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی اور ان بکھرے ہوئے لوگوں کی جلد بندی ہوگئی جو انگریزی قانون کے دائرے میں رہ کر "نیشنل" وقعت حاصل کرنا چاہتے تھے اور زیادہ سے زیادہ اونچے عہدے اپنا حق سمجھ کر مانگتے تھے۔

مگر مسئلہ صرف سیاسی نہ تھا۔ اس سے آگے کا اور اس سے زیادہ گہرا تھا۔ اور اس کا حل صرف اونچے عہدوں اور سیاسی طور پر "نیشنل وقعت" حاصل کرنے کی جدوجہد سے نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ تہذیبی، تعلیمی اور معاشرتی زندگی میں اصلاح، تجدید اور احیاء (Revivalism) کی تحریکیں شروع ہوگئیں جو ایک طرف انگریزوں کے جابرانہ نظام حکومت کی مدافعت اور مقابلے کی لائنیں بناتی تھیں تو دوسری طرف مغربی تہذیب کی نئی قوتوں سے محدود تعاون کی صورتیں نکالتی تھیں۔ انیسویں صدی کے آخری عشروں میں کچھ تو تعلیم یافتہ ہندوؤں کی دیکھا دیکھی، کچھ انگریزوں کی جدید پالیسی کی بدولت، اور کچھ اس لئے کہ قوم نے انگریز کا زبردست اقتدار تسلیم کر لیا تھا اور اسی کے سائے میں رہ کر باعزت زندگی کی سبیل کرنی تھی، مسلمانوں میں بھی تقریباً اسی طرح کی نئی تحریکوں کا آغاز ہوا جن کی سطح کے نیچے یہی دو مقصد کارفرما تھے۔ بے لگام حکومت اور بے تحاشا ساری تہذیب کے لئے مدافعت اور بچاؤ کی ایک دیوار قائم کرو اور زندہ رہنے اور قدم جمائے رکھنے کے لئے محدود تعاون کی صورت بھی پیدا کرو۔

لیکن جیسا کہ ہر نئی تحریک میں ہوتا ہے، یہاں بھی ہوا۔ جدید حالات میں جدید تر تحریکوں کو افراط اور تفریط کا سامنا کرنا پڑا۔ بنگال میں نئی روشنی کے ترقی یافتہ ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے نے ہندوؤں کی مذہبی اور معاشرتی اصلاح کے لئے جو کام شروع کیا تھا وہ کچھ دن بعد ہی کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا۔ برہمو سماج، برہمو سماج آف انڈیا، پرارتھنا سماج (بمبئی)، راناڈے کی سارود جنک سبھا اور ان سے الگ لوکمانیہ تلک کی دکن ایجوکیشنل سوسائٹی وغیرہ اصلاح، تجدید اور احیاء کے الگ الگ درجوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ آہستہ آہستہ باشعور اور قوم کے دردمند تعلیم یافتہ ہندوؤں میں خیالات کے جھکاؤ کے لحاظ سے تین صفیں قائم ہوگئیں۔ ایک میں وہ اعتدال پسند تھے جو مغرب کی نئی تہذیب کو اپنے یہاں کی سوسائٹی کے لئے قوت اور روشنی کا ایک سرچشمہ بنانا چاہتے تھے اور انگریزوں کی انتظامی مشنری میں ایک کارآمد اور اہم پرزہ بن کر کام کرنا چاہتے تھے۔ دوسری صف ایسے لوگوں کی تھی جو انگریز کی معاشرتی، تہذیبی اور انتظامی پالیسی سے توہم آہنگ ہونے کو تیار نہ تھے مگر قوت کے نئے خزانوں سے فیض اٹھاتے ہوئے اپنی قدیم تہذیب اور قدیم تاریخ اور قدیم تعلیم میں ضرور اصلاح و ترمیم کرنا چاہتے تھے۔ تیسری صف مذہب، تہذیب اور سیاست میں انتہا پسندوں کی صف تھی جو جدیدیت کی گاڑی میں اس کے شاندار ماضی کا گھوڑا باندھنا چاہتے تھے اور اسی طرح انگریز کی دھیرے دھیرے بخشش کی پالیسی کو نفرت سے دیکھتے تھے۔ اسے سیٹھا زہر سمجھتے تھے اور سیاسی محاذ پر کوئی سمجھوتہ کرنے کو رضامند نہ تھے۔

تیسری صف کے انتہا پسند لوکمانیہ تلک، لالہ لاجپت رائے، اور سوامی دیانند سرسوتی کے گرد جمع ہو گئے جو آزادی کے حربے کو مستقبل کی جنگ کے لئے کافی سمجھتے تھے اور قدیم سے قدیم تر تہذیب، تاریخ اور تعلیم کو قوم کے زندہ اور گرم رکھنے کا سبیل سمجھتے تھے بعد ہر جدید ادارے اور جدید وضع کو نقالی اور زمانہ سازی سمجھ کر نفرت و تمسخر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

تقریباً اسی طرح کی تقسیم ۱۸۵۷ء کے بعد درمیانی طبقے کے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں پیدا ہوئی۔ پہلی صف میں سرسید، امیر علی اور حالی کا نام لیا جا سکتا ہے، دوسری میں شبلی کا اور تیسری صف میں مولانا محمود اسیر مالٹا ـــــ سے کر اکبر تک مختلف حالات کے لوگ آتے ہیں جو سرسید کی مصلحانہ کوششوں کو بھی صرف اس وجہ سے نہ سراہ سکتے تھے کہ ان کے خیال میں یہ بات بھی برطانوی شہنشاہیت کے تہذیبی مقصد کی ایک کڑی تھی۔

کہا کسی نے یہ سید سے آپ اے حضرت — نہ پیر کو نہ کسی پیشوا کو مانتے ہیں
جواب انھوں نے دیا ہم ہیں پیرو قرآں — ادب ہر اک کا ہے لیکن خدا کو مانتے ہیں
جواب حضرت سید کا خوب ہے اکبر — ہم ان کے قول درست و بجا کو مانتے ہیں
ولیکن اس نئی تہذیب کے بزرگ اکثر — خدا کو اور نہ طریق دعا کو مانتے ہیں
ثنا تو کہتے ہیں سب کچھ مگر حقیقت میں
وہ صرف قوت فرماں روا کو مانتے ہیں

"قوت فرماں روا" کے خلاف جوان بزرگوں کا صالح اور ایماندار غصہ تھا وہ افراط میں داخل ہو گیا اور اس نے ان کے دل و دماغ کو ایسا متاثر کیا کہ وہ ہر نئی چیز کو اسی کی نگاہ سے دیکھنے اور اسی کی طرح مشتبہ سمجھنے لگے اور "کتاب دل" کو رہنما ماننے پر قناعت کر گئے۔

کتاب دل مجھے کافی ہے اکبر درس حکمت کو — میں اسپنسر سے مستغنی ہوں مجھ سے مل نہیں ملتا

اکبر اگر عدالتی مسلیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ (Spencer) اور (Jhon mill) اور (James Smasl mill) کا مطالعہ بھی کرتے جاتے تھے تو شبلی کی طرح ان پر یہ حقیقت کھلتی کہ جدید تعلیم کی خامیاں کہاں پوشیدہ ہیں۔ برطانوی سیاست کی جڑیں کونسے مفاد کام کر رہے ہیں اور جدید فلسفہ کن گہرائیوں کا حامل ہے لیکن جو دیو بند کی شریعت تھی وہی اکبر کی بھی تھی۔ ان کی نگاہ مظاہر تک پہنچ کر رک گئی۔ اندرونی حقائق کی کھوج نہ کر سکی۔

اس کا سبب کچھ یہ بھی ہے کہ مظاہر بجائے خود بڑا دردناک منظر پیش کر رہے تھے اور ان کی تاریکی میں آگے کا راستہ ٹٹولنا بہت مشکل تھا اور یہ پتہ چلانا اور بھی مشکل کہ ماضی کو مستقبل سے کس طرح جوڑا جائے۔ بقول آل احمد سرور

"اکبر نیک نیت بھی تھے اور تھوڑے سے تنگ نظر بھی۔ طوفان آتے دیکھا تو سمجھے کہ سب کچھ فنا ہو جائیگا یہ بھول گئے کہ اس کے اثر سے زمین بھی زرخیز ہو جائے گی۔"

جدید تعلیم آئی تو زیادہ تر ایسے لوگوں کے ہاتھوں آئی جنھوں نے روشن خیالی اور آزادہ روی کے بجائے قوم سے بے رخی ماضی سے بے تعلقی اور با اقتدار اجنبیوں کی نقالی پر زیادہ زور دیا۔ اسے اکبر اگر انگریز کی دوسری ساخت کی توپ نہ سمجھتے تو کیا سمجھتے۔

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے — جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

....

جو بات بتائی جاتی ہے وہ کیا؟ فقط بازاری ہے　　　جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

اور تعلیم نسواں کے حامیوں میں بھی کثرت ایسے لوگوں کی تھی جو تعلیم یافتہ لڑکیاں تیار کر رہے تھے قوم کا معیار علم اونچا کرنے کے لئے نہیں بلکہ تعلیم یافتہ عہدے دار نوجوانوں کے جدید ڈرائنگ روم سجانے کے لئے۔ سو اکبر کا ان سے چڑنا ضروری تھا۔

ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی　　　یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

چنانچہ تعلیم یافتہ خواتین مشرق کو آرائش کے سوا اگر کچھ اور مصروفیت تھی تو کلب اور سوسائٹی کی۔ اکبر کے نزدیک پرانے قسم کی گھریلو عورت مجسمہ تھی ان تمام خوبیوں کا جو ایک اچھی بیوی، اچھی ماں اور اچھی بیٹی میں پائے جاتے ہیں۔ اخلاق، محبت، پاکیزگی اور خدمت۔ اس لئے وہ چراغ خانہ نظر آتی تھی اور جب اس چراغ میں مغربی تہذیب اور جدید تعلیم کی گیس پہنچ جاتی تھی تو گھر میں اس کا سمانا مشکل تھا۔

حامدہ چمکی نہ تھی مغرب سے جب بیگانہ تھی　　　اب ہے شمع انجمن، پہلے چراغ خانہ تھی

لیکن اکبر اس سے آگے نہ دیکھ سکے، وہ یہ نہ دیکھ سکے کہ قدیم تعلیم اور قدیم رسوم سے بھی تو قوم کا مداوا ہونے والا نہیں ہے۔ عورت کا جو آئیڈیل ان کے سامنے تھا اسے انھوں نے مشرقیت کا نام دے دیا۔ مگر عورت کی یہ "مشرقیت" نئے حالات میں مفلوج ہوئی جا رہی تھی۔ عورت کو محض گھر کی خدمات بجا لانے والی مشین کا نئے سماجی حالات میں پست ہو جانا یقینی تھا۔ چلمن کے پیچھے جس ناموس کو وہ محفوظ سمجھ رہے تھے جب وہ بھی غیر محفوظ نظر آیا تو وہ درد اور احساس شکست سے چیخ پڑے۔

حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی　　　سپر بنیں گی یہ چلمن کی تیلیاں کب تک

"ہندستانی عورت دور تنزل میں جہالت، بیماری اور علاج کے بے جا قیود کی وجہ سے ایک اعصابی مزاج کی دبی دبائی مخلوق بن کر رہ گئی تھی۔ انگریزی تہذیب نے اسے بغیر ان تحفظ کی قوتوں کے، جو انگریز عورتیں رکھتی ہیں۔ گوشۂ عافیت سے باہر کھینچ کر زندگی کی مشکلوں اور تحریصوں میں ڈال دیا۔ صرف اس کا پردہ ہی نہیں توڑا بلکہ وہ فصل جو ایشیائیں مردوں اور عورتوں میں ہمیشہ رہا ہے دور کر دیا۔ صرف اسے گھر سے نکالنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ کلب میں لے جا کر ناچنے کے لئے کھڑا کر دیا۔ اس "آزادی" کے ناگوار نتائج کا رد عمل اور زیادہ افسوس ناک تھا۔ مغرب زدہ عورتوں کی مثال نے عام طور پر ہندستانیوں کو عورتوں کی تعلیم اور آزادی کی مصلحانہ اور ذمہ دارانہ تحریکوں سے بدظن کر دیا اور ان کی ترقی میں رکاوٹ ڈالی"

ڈاکٹر عابد حسین نے ہندستانی سماج کے طبقاتی فرق کو مد نظر رکھے بغیر اگرچہ "ہندستانی" کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس طبقے کا ذکر ہے گنتی میں کم ہونے کے باوجود ہندستان میں انگریزی دساوری تہذیب کا نمائندہ اور حامی طبقہ تھا اور اکبر اسی کا نام لے کر لڑکیوں کی تعلیم پر برستے ہیں۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی　　　ڈھونڈھ لی قوم نے فلاح کی راہ

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین　　　پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

جس سین کو اکبر نے دیکھا اور جسے وہ مغربی تہذیب اور جدید تعلیم یا تعلیم نسواں کا نمائندہ سمجھ وہ نمائندہ تھا ہی نہیں۔ اگر اس بات کو اکبر پہلے ہی سمجھ جاتے تھے تو بعد میں اپنے رویہ کی یہ کہہ کر اصلاح نہ کرتے۔

انجن آیا نکل گیا زن سے　　　سن لیا نام آگ پانی کا!

بات اتنی اور اس پہ یہ طومار　　　غل ہے یورپ کی جانفشانی کا

علم پورا اگر سکھائیں ہمیں تب کریں شکر مہربانی کا

سید ...... جس چیز کو وہ زیادہ بڑا خطرہ سمجھ رہے تھے وہ تھی جدید انگریزی تہذیب جو خشت سے اک سے ساتھ ... میل پار کرچکنے کے بعد اد ... انگریز ... کے حواریوں کے دامن میں پل کر اپنی تاثیر بدل چکی تھی۔ دھا تیز اور ... بنیر ہو کر رہ گئی تھی اور با اقتدار انگریزوں سے ظاہری قرب اور ممتاز عہدے حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بن گئی تھی۔

مغربی ذوق ہے اور وضع کی پابندی بھی اونٹ پر بیٹھ کے تھیٹر کو چلے ہیں حضرت

وہ اس "امی ٹیشن" اور دکھلاوے پر فخر کرتے تھے جو خود اندر سے خالی تھا اور ماضی سے صرف اس لئے بے نیاز کہ ماضی سے بے خبر بھی تھا اور اسے بے اقتدار بھی سمجھتا تھا۔

ہرچند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

انھیں ایسے چھچھورے مغربی نقادوں کے مقابلے میں وہ مشرقی یعنی درمیانی طبقے کے ہندوستانی مسلمان اور ہندو ... جو اپنے مستقبل کو صرف اس لئے قربان کئے دے رہے تھے کہ اپنے ماضی سے شرمندہ نہ تھے، اس سے بے خبر نہ تھے ... نے انھیں اندھا نہ کیا تھا اور جو اپنی تمناؤں کے گرد اونچی چہار دیواری کھڑی کر کے انھیں محفوظ سمجھ رہے تھے۔

یہیں موقع ہے کہ اکبر کی طنزیہ شاعری کے ایک اور تیکھے پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا جائے۔ یہ ہے ان کا اپنے طبقے اور اپنے آئیڈیل کو بے نقاب پیش کرنا۔

بالزاک کی طنز نگاری کی تعریف کرتے ہوئے ایک موقع پر اینگلس نے لکھا ہے کہ اس کی دلی ہمدردی تو قدیم شرفا اور نوابین کے زوال آمادہ طبقے کے ساتھ ہے اور وہ خود کو انھی سے وابستہ سمجھتا ہے لیکن جب طنز کرنے پر آتا ہے تو ان لوگوں کو اصلی روپ میں پیش کرتا ہے اور انھیں بھی اپنے طنز کا نشانہ بناتا ہے اور نئے زمانے کے بے تہ لوگ جن سے اسے دلی نفرت ہے اور جن کا وہ طبقاتی مخالف ہے ان کے کردار کو جوں کا توں پیش کرتا ہے اور محض اپنے جذبات کی رو میں نہیں بہتا۔

اکبر کے طنز میں، خاص طور سے سیاسی اور تہذیبی زندگی کے جن عناصر کو وہ اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں، ان پر طنز کرنے میں اکبر نے اکثر اسی حقیقت نگاری کا ثبوت دیا ہے۔ اگرچہ ان کے ہاں حقیقت اتنی گہرائی کے ساتھ نہیں پائی جاتی تاہم اس کا شائبہ ضرور ہے۔

پاس کالج کے جو ہیں، ووٹ طلب کرتے ہیں پاس مسجد کے جو ہیں طاعت رب کرتے ہیں
غشرہ اُٹے مجی کے وہ ہوئے ہیں کشتہ یہ رخ سادگی طرز عرب کرتے ہیں
ان کو ہے بلندڈوسکی کی ضرورت اور یہ رفع بیابانی سے فقط خشکی لب کرتے ہیں
چاہتے وہ ہیں کہ اغیار سے جوڑیں رشتہ یہ ہیں سمٹے ہوئے اور حفظ نسب کرتے ہیں
وقت کو دیکھ کے اب آپ ہی انصاف کریں وہ ستم کرتے ہیں یا آپ غضب کرتے ہیں

....

مولوی ہرگز نہ چھوڑیں گے خدا گو بخش دے گھیر ہی لیں گے پولس والے سزا ہو یا نہ ہو

....

پردے میں ضروری ہے طوالت بے حد انصاف پسند کو نہیں چاہئے ہٹ

سب رس

تشبیہ بری نہیں اگر میں یہ کہوں — بیگم تو ہے جواں، لیلی سگرٹ

....

گر جائیں لاٹ صاحب، منبر پہ شیخ صاحب — بدعو فلاسفی کے کرے بھی سڑے ہیں

....

سید اٹھے جو گزٹ لے کے لاکھوں لائے — شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

....

اکبر کو تہذیب جدید میں ایک اور خطرے کا پہلو یہ نظر آرہا تھا کہ جن سماجی قدروں کے وہ عادی تھے وہی قدریں بدل رہی تھیں۔ عیب، ہنر اور ہنر عیب ہوا جا رہا تھا۔ جاگیرداری عہد کے اخلاق، مروت، براہ راست باہمی لین دین، آدمی کا آدمی سے سیدھا سماجی رشتہ ٹوٹ رہا تھا اور اس کی جگہ سکے اور بازار کا رشتہ قائم ہونے لگا تھا۔ یہ اچنبھے کی بات تو تھی ہی لیکن ان لوگوں کے لئے جو خود قدیم وضعداری کے پاسبان تھے وہ دردناک حقیقت بھی تھی۔ وہ قدروں کی اس تبدیلی کا خیر مقدم کسی حال میں نہیں کر سکتے تھے۔ شیکسپیئر سے لے کر آج تک کسی ادیب نے جو جاگیرداری کی مخمور اور سرپرستانہ آنکھیں دیکھ چکا ہو۔ آدمی، آدمی کے درمیان رشتے کی اس تبدیلی کو تحسین اور استقبال کی نظر سے کبھی نہیں دیکھا۔ جو کل فنکار تھا وہ آج دوکاندار بنا جا رہا تھا۔ اسے سماج میں اپنا یہ حیثیت پہلی نظر میں پسند نہ آئی اور اس نے مغربی تہذیب کو اس وجہ سے کوسا کہ وہ بے دردی کا ایک ایسا نظام زندگی ہے جو استاد و شاگرد، ارباب علم کے مقدس رشتے کو بھی بازار کی جنس بنا ڈالتا ہے۔ جو شاعری اور موسیقی کو فنی لطافت کے لئے نہیں بلکہ کھلے بازار میں بیچنے کے لئے خریدتا ہے۔

اکبر نے اس پہلو سے بھی انگریز کو اور اس سے متعلق انگریزی تہذیب کو زہریلے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

جو وہ بھی دن کہ خدمت استاد کے عوض — جی چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے
یا اب ہے یہ زمانہ کہ لڑکا پس از سبق — کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجئے

....

اکبر نے کہا سن لو یارو اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں — یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

....

عشاق کو بھی مال تجارت سمجھ لیا — اس قہر کو ملاحظہ اللہ کیجئے
بھرتے ہیں میری آہ کو فونوگراف میں — کہتے ہیں فیس لیجئے اور آہ کیجئے

....

اور سماجی و اخلاقی قدروں کے بدل جانے سے فن اور ادب کی روایات بھی بدلی جا رہی ہیں۔

مغرب نے خوردبین سے کمر ان کی دیکھ لی — مشرق کی شاعری کا مزا کرکرا ہوا

....

آخری قوت جسے وہ مشرق کی شاعری، مشرق کا کردار، مشرق کی خصوصیت اور دراصل مشرق سمجھتے تھے وہ تھا مذہب۔ وہ مذہب بھی وہ جو قدیم سے قدیم زمانے میں پایا جاتا تھا جو "کتاب دل" میں پڑھا جاتا تھا۔ فلسفی کو جس کی ڈور کا سرا نہیں ملتا اور مغرب کی مادیت پرستی کو جس کی ہوا نہیں لگی تھی ایک مغرب کی مادی قوت نے جس کی ساری روحانیت پر پانی پھیر دیا۔ اکبر بذات خود کوئی مذہبی آدمی نہ تھے۔ نماز روزے کے بھی ایسے پابند نہ تھے۔ ارباب نشاط کے کوٹھوں پر گھومتے پھرنے سے بھی راضی تھے۔ ستار کے بھی رسیا

تھے۔ سعد مرد کی زندگی بھی آزادہ روی کی تھی۔ لیکن مذہب کے معاملے میں ان کی شاعری میں جو شدت پائی جاتی ہے اس کا سبب یہ بھی ہے کہ ان کا خیال تھا کہ مذہب کے بدلتے تصور سے وابستہ رہنے میں "مغربیت" کے تہذیبی، تعلیمی، سیاسی اور فکری طوفان سے بچاؤ کے لئے ایک بند تیار ہو جاتا ہے اور اس بے تحاشا طوفان کا اقتدار، اس کا دبدبہ نظر میں کم ہو جاتا ہے اور اس کے کم کم، ان تصورات کی پسپائی جنھیں وہ "مشرقیت" سمجھتے تھے، بے عزت معلوم ہونے لگتی ہے۔ مذہب اور مغربیت کو انھوں نے باہم ایک دوسرے کی ضد کے طور پر جو پیش کیا اس کی وجہ یہاں تلاش کی جا سکتی ہے۔

خدا کے باب میں کیوں آپ مجھ سے بحث کرتے ہیں   خدا وہ ہے کہ جس کے حکم سے صاحب بھی مرتے ہیں

....

رات بنگلے میں مرے آئی تھی آوازِ اذاں   جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

....

مذہب کی یہ محبت صرف اخلاقی اور دینی عقیدوں کا ہی مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہ عبارت ہے پرانی پرسکون زندگی، انسانی ہمدردی، حیا، محبت، اخوت اور قومی آزادی سے۔ اکبر کے نزدیک مشرق، مشرقیت اور مذہب سب کا یہی ایک گڈمڈ تصور ہے اور جتنا جتنا وہ انگریز کے ظاہری اور باطنی عمل سے برافروختہ ہوتے جاتے ہیں اتنا ہی مشرقیت یا مذہب یا قدیم نظام زندگی سے والہانہ محبت بڑھتی جاتی ہے اور جس قدر یہ محبت بڑھتی ہے اتنا ہی وہ انگریز کی سیاست سے بیزار ہوتے جاتے ہیں۔ یہ عمل ردعمل کا سلسلہ ہے جس نے اکبر کی شاعری کو ۳۰، ۲۵ برس اپنی گرفت میں رکھا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکبر نے سوراج پارٹی پہ طنز کیا۔ کونسلوں اور سرکاری کمیشنوں کو قبول کرنے والے ان کے تمسخر کا نشانہ بنے اور ان تمام لوگوں کو جو کچھ لے دے کر انگریز سے معاملے کرنے پر رضامند تھے اکبر نے قابلِ طنز سمجھا۔

کونسلوں میں سوال کرنے لگے   قومی طاقت نے جب جواب دیا

جس لیڈر کا وہ مذاق اڑاتے ہیں وہ یہی لیڈر ہے جو قومی ایجی ٹیشن کو استعمال کر کے صاحب بہادروں پر سکہ جماتا ہے اور اپنے لئے رعایتیں اور آسائشیں حاصل کرتا ہے۔

قوم کے غم میں ڈنر کھاتا ہے حکام کے ساتھ   رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

....

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہے جواں بھی   شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

....

انھیں تلک اور گاندھی جی اس وقت عزیز تھے جب ان کی پالیسی قومی تحریک میں گرم پالیسی سمجھی جاتی تھی۔

مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا   اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

....

جب اعتدال پسندوں اور لبرلوں کی جماعت سلف گورنمنٹ مانگ رہی تھی اس وقت اکبر کی ذہنی انتہا پسندی یوں سوچ رہی تھی۔

کام اس ملک میں جو سلف گورنمنٹ سے کیا   زہر کو ہضم کرے کوئی پیپرمنٹ سے کیا

سرکاری عہدے پر قائم رہتے اور اس سے پنشن پانے کے زمانے میں اکبر اس سے زیادہ کھل کر اپنی انتہا پسندی کا اظہار نہ کر سکتے تھے۔ ان کی انتہا پسندی کی تلوار کہ خلاف جہاں ظرافت کا ملمع وہاں اس نے دھار مذہب کی پائی۔ انھوں نے

مذہب کے نقطۂ نظر سے کافی کام لیا اور کلام کی تاثیر بھی بڑھائی۔

ان کے نزدیک جدید تعلیم اس لئے بھی مطعون ٹھیری کہ اس سے مذہبی پختہ کرداری میں خلل پڑتا ہے۔

عقلِ دل محوِ طلسمِ رنگِ کالج ہو گیا ذہن کو تپ آگئی، مذہب کو فالج ہو گیا

اور مذہبی اخلاق کے ماننے والے قدیم مشترکہ خاندانوں کے گھریلو تعلقات پہ اثر پڑتا ہے۔

ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

مذہب اس لئے بھی انھیں عزیز ہے کہ وہ بکھرے ہوئے لوگوں کو ایک رشتے میں پرو کر دشمن کے مقابلے کے لئے تیار کرتا ہے اور قربانی کا جذبہ عطا کرتا ہے اور چونکہ نئی تہذیب اسے مٹائے یا اندر سے کھوکھلا کئے دیتی رہی ہے اس لئے وہ اور بھی قابلِ نفرت ہے۔

کر گئی کام نگاہِ بتِ پرفن کیسا تج چلے دیر و حرم شیخ و برہمن کیسا

....

نئی تہذیب میں دقت زیادہ تو نہیں ہوتی مذاہب رہتے ہیں قائم فقط ایمان جاتا ہے

حالانکہ مذہب میں ایمان ہی وہ بے بحث اعتقادی ایسی چیز ہے جو اس شمشیر میں فولاد کا کام کرتا ہے۔

نہ ہو مذہب میں جب نورِ محبت تو وہ کیا ہے فقط اک فلسفہ ہے

اور فلسفے کو مشین اس طرح دبا لیتی ہے کہ وہ بے جان رسوم کا ایک مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے۔

اک دن وہ تھا کہ دب گئے تھے لوگ دین سے اک دن یہ ہے کہ دین دبا ہے مشین سے

دین اور مشین کے تاریخی تعلق کو سمجھے بغیر اکبر نے دونوں کو ایک دوسرے کا حریف جانا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ادھر تو مشین کی ہماہمی بڑھتی گئی، بمبئی میں پہلی جنگ کے زمانے اور اس کے بعد روئی کے کارخانے، مغربی یوپی میں شکر کے کارخانے اور بنگال میں پٹ سن کی صنعت پھیلنے لگی، علی گڑھ کالج قوم کی نگاہوں کا مرکز بنتا گیا، کونسلیں آباد ہونے اور سیدوں اور برہمنوں کی تقریروں سے گونجنے لگیں اور نئی زندگی کے دھندلکے سے مردانِ خرد مند بھی برآمد ہونے لگے، اکبر کو اپنے جذبوں اور اپنی تمناؤں کی مستقل شکست کا سامان روز بروز زیادہ نظر آنے لگا۔ اکبر کی آواز میں جس طرح احتجاج سے غصہ پیدا ہوا تھا اور غصے سے نفرت اور بیزاری کے نعرے بلند ہوئے تھے، اب اسی آواز میں کراہ پیدا ہونے لگی۔ یہ کراہ تنہا اکبر کی نہیں تھی بلکہ ان تمام لوگوں کی کراہ تھی جو دیوبند کے ذریعے علی گڑھ کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے، دین کے ذریعہ مشین کو پسپا کرنا چاہتے تھے اور قدیم جاگیرداری کے زنگ خوردہ حربوں کی مدد سے جدید پیچ در پیچ سرمایہ داری تہذیب کو شکست دینا چاہتے تھے۔ اکبر کی آخری عمر انہی کراہوں کے لئے وقف ہو کر رہ گئی۔

غریب اکبر نے بحث پردے کی کی بہت کچھ مگر ہوا کیا نقاب الٹ ہی دی اس نے کہہ کر کہ کر ہی لے گا مرا ہوا کیا

....

تائیدِ وضعِ ملت و دیں کی کروں گا میں چاہے زمانہ لاکھ ہنسے مجھ غریب پہ

....

وعظ کالج میں جو دیتے آتے ہیں اکبر جا کر کیا یہ گرتی ہوئی دیوار کو تھام آتے ہیں

گرتی ہوئی دیوار کو اپنا پشتہ بنا کر اکبر کو بالآخر یہی دن دیکھنا تھا۔ اگر جدید سرمایہ داری ہتھیاروں کے مقابلے کے لئے اعلیٰ جدید تر صنعتی ہتھیار بن جاتے، اگر وہ ماضی کو لاش سمجھ کر سینے سے نہ لگائے رہتے بلکہ اس کی صالح روایتوں کو ایک زندہ امانت سمجھ کر اس کے لئے نئے سر و سامان کی تلاش کرتے اور کچھ دن اور جیتے رہتے تو انھیں اپنے طبقے کے وضعدار مگر زخم خوردہ "شرفا" کی لے میں ہم

اپنی شکست کی آواز بلند نہ کرنی پڑتی۔

شعرِ اکبر کو سمجھو نہ یادگارِ انقلاب   یہ اسے معلوم ہے تھی نہیں آئی ہوئی

اور بالآخر یہاں تک خوف زدہ تھے۔

آثار کہہ رہے ہیں گوشِ دلِ حزیں میں   جیتا رہا تو تو بھی مل جائے گا انھیں میں

انھوں نے اس پر مجبور کرنے کی کوشش کی تھی کہ عہد جدید کے فرزند جو چاہیں کریں مگر

ہاں ایک محض بندۂ عاجز کا رہے یاد   اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

لیکن اس شرط پر بھی سمجھوتہ انھیں مشکل نظر آیا اور بالآخر انھوں نے سینے پہ پتھر رکھ کر اپنی شکست کا اعتراف اور آنے والے زمانے کی نئی چمن بندی کا دکھی دل سے اعلان بھی کر دیا۔

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے   نئی تہذیب ہو گی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی یہ پردے کی پابندی   نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہوں گے

....

ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہو گی   لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے
بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں   زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب کے کم ہوں گے
کسی کو اس تغیر کی نہ حس ہو گی نہ غم ہو گا   ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے

تمہیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن کہ تم ہو گے نہ ہم ہوں گے

اردو شاعری میں ماضی قریب اور ماضی بعید کا نہ ایسا عاشق پیدا ہوا اور نہ ایسا ہنسا ہنسا کر رونے والا اور نہ ایسا کوئی مرثیہ لکھا گیا۔

لیکن اکبر نے طنز نگار اور قدامت کے مرثیہ گو کا ہی فرض ادا نہیں کیا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے کے مختلف رجحانات کی سچی عکاسی کی۔ قدیم کی حمایت میں اور جدید کی مخالفت میں اس درجہ شدت سے کام لیا کہ لوگوں کو افراط و تفریط، حد سے زیادہ اور حد سے کم، نقل اور اصل کے درمیان تمیز کرنے کی طرف توجہ ہوئی اور ماضی سے بیزاری کا وہ رجحان کم ہو چلا جو چھچھورے پن اور جدید کی اندھی تقلید سے پیدا ہوا تھا اور ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھ کر لپکنے والوں کے لئے ہچکچاہٹ کا ایک سامان تیار ہو گیا۔ یہی ان کا سماجی رول ہے۔ اکبر اگر نہ ہوتے تو اکبر کی نقل کرتے کرتے اقبال کو اتنی آسانی سے نیا راستہ کیسے ملتا۔

ڈاکٹر سلامت اللہ

ناول نگار پریم چند

ناول نگاری کی دنیا میں پریم چند کا درجہ بہت اونچا ہے۔ وہ اردو اور ہندی کے تو چوٹی کے ناول نگار مانے جاتے ہیں۔ دنیا کی بڑی زبانوں کے ناول لکھنے والوں میں بھی ان کا شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ یورپ کی بعض زبانوں مثلاً انگریزی اور روسی، چیک وغیرہ میں ان کے فن کی جانچ پرکھ کی گئی ہے اور اسے بہت سراہا گیا ہے۔

پریم چند نے کل تیرہ ناول لکھے ہیں۔ ان میں سے آخری ناول "منگل سوتر" ادھورا ہے۔ وہ اس کے صرف چار باب ہی لکھ سکے تھے کہ ان کی زندگی کا چراغ جو توانائی کی کمی سے بہت عرصے سے ٹمٹما رہا تھا گل ہو گیا۔

پریم چند نے جو غیر معمولی مقبولیت حاصل کی ہے۔ اس کا راز کیا ہے؟ پریم چند اپنے زمانے اور ملک کے سچے ترجمان ہیں۔ وہ جس فضا میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے، اس میں ہندستان کا دل دھڑکتا ہے اور ضمیر بولتا ہے۔ دیہات جن میں ہمارے ملک کے بیشتر لوگ زندگی بسر کرتے ہیں، پریم چند کی شخصیت کے لئے تانا بانا فراہم کرتا ہے اور کسان ان کے شعور اور احساس کو جگاتا اور سنوارتا ہے۔ پریم چند نے گاؤں کی زندگی کو ایک فلسفی کی عینک سے بے تعلق ہو کر نہیں دیکھا اور اس کی ترجمانی کرنے میں خیالی پلاؤ نہیں پکایا بلکہ وہ خود اس زندگی میں سے ہو کر گذرے اور انھوں نے اس کی جیتی جاگتی تصویر کھینچی۔ انھوں نے خود محسوس کیا تھا کہ غریب کسان کس طرح ہر آن زہر کے گھونٹ پیتا ہے۔ وہ قدم قدم پر کن مجبوریوں اور محرومیوں سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کی کیا آرزوئیں اور تمنائیں ہیں، اس کے دل میں کیا حوصلے اور ولولے دبے ہوئے ہیں اور وہ اپنی بے کیف اور پژمردہ زندگی کو کس طرح بدلنا چاہتا ہے۔ غرض پریم چند ایک ناول نگار کے ناتے ہندستان کے ادب میں پہلی بار اس کسان کے نقیب بن کر آگے بڑھے جو مظلوم تو ہے لیکن پست ہمت نہیں، جو توہمات کا شکار اور گھناؤنی رسموں کا قیدی تو ہے لیکن انسانیت سے یکسر بے بہرہ نہیں جو بڑی سے بڑی ذلت جھیل جاتا ہے لیکن پھر بھی سکتا ہے اور اور اپنی قسمت کو خود بدلنے کا اہل بھی ہے۔ یہ پریم چند کا کمال ہے اور یہ ہندستانی ادب کو ان کی بڑی دین ہے کہ انھوں نے اس کسان کو جسے ہمارے ادیبوں نے اب تک قابل اعتنا نہ سمجھا تھا، ادب میں اس کا جائز مقام بخشا۔ پریم چند کی آواز دراصل کسان کی آواز ہے اور وہ آواز آج اردو اور ہندی ادب ہی میں نہیں بلکہ ہندستان کی تمام زبانوں کے ادب میں گونج رہی ہے۔

پریم چند کے ناولوں میں ہمیں ان حالات کی جھلک نظر آتی ہے جو بیسویں صدی کے ہندستان میں بدیسی حکومت اور سامراجی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ جنتا ان حالات سے نڈھال اور بے چین ہو رہی تھی۔ ہندستانی سماج کے مختلف طبقوں میں کشمکش تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ وہ طبقے جو سامراج کے بل بوتے پر اقتدار کے مالک بن بیٹھے تھے، اپنے ذاتی مفاد کی حفاظت کیلئے عوام کو کچل رہے تھے۔ چنانچہ آزادی کی جنگ جو بدیسی حکومت کے خلاف لڑی جا رہی تھی، کہیں کہیں طبقاتی جدوجہد کی صورت اختیار کر رہی تھی۔ زمینداروں اور کسانوں میں، ساہوکاروں اور قرض داروں میں، سرکاری افسروں، پولیس والوں اور عام لوگوں میں، مل مالکوں اور مزدوروں میں۔ غرض سماج کے مختلف گروہوں میں جگہ جگہ تناؤ بڑھ رہا تھا اور کہیں کہیں اور کبھی کبھی ان میں کھلم کھلا ٹکر بھی ہو جاتی تھی۔ پریم چند نے ان پیچیدہ سماجی مسائل سے آنکھیں نہیں چرائیں۔ دکھی انسانیت کی کراہ اور چیخ پکار سے کان بند نہیں کئے، جابر و ظالم قوتوں سے ڈر کر اپنی زبان پر تالا نہیں لگایا۔ بلکہ انھوں ...... نے ایک حساس دل اور روشن دماغ کے ساتھ

صورت حال کو سمجھنے اور فنی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔

ہر ناول افراد کے عمل اور رد عمل سے عبارت ہوتا ہے۔ یہ افراد ایک ایسے سماج کے پس منظر میں کچھ کرتے، ٹکراتے اور چلتے پھرتے ہیں جس میں ایک کا فائدہ اور دوسرے کا نقصان ہے، جس میں ایک کے لئے جو چیز آب حیات کا درجہ رکھتی ہے وہی دوسرے کے لئے زہر ہلاہل ہے۔ موجودہ دور میں سماج اور افراد کا باہمی توازن ختم ہو گیا ہے۔ اس صورت حال میں ناول نگار کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص نقطۂ نظر سے اپنے ناول کو ترتیب دے۔ اس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ سماج میں تبدیلی کا رخ کیا ہے۔ ناول نگار اپنے کرداروں کے ذریعے یہ کام انجام دیتا ہے۔ ان کرداروں کے راستے میں جگہ جگہ پگڈنڈیاں اور بھول بھلیاں ملتی ہیں اور کرداروں کے سامنے صحیح راستے کے انتخاب کا سوال آتا ہے۔ یہ انتخاب ناول نگار کی نظر اور فکر کی آئینہ داری کرتا ہے۔ یہ نظر اور فکر سماج کی ابھرنے والی طاقتوں کی بھی ترجمانی کر سکتی ہے اور ڈوبتی ہوئی قوتوں کی بھی ہمنوا ہو سکتی ہے۔ یہی وہ کسوٹی ہے جس پر بھلے اور برے، کھرے اور کھوٹے فنکار کی تمیز کی جا سکتی ہے۔

اس لحاظ سے دیکھئے تو پریم چند کے ناولوں میں ان کی ترقی پسند فکر اور وسیع نظر کا کافی ثبوت مل سکتا ہے۔ ان کے کردار سماجی اور سیاسی بے راہ روی اور ناانصافی کے خلاف بغاوت کا جھنڈا اٹھاتے ہیں۔ سامراجی حکومت، نوکر شاہی اور اس کے پٹھوؤں کے ظلم و تشدد کا مقابلہ کرتے ہیں اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ پریم چند اپنے کرداروں کے ذریعے سماجی حقیقت کی ہو بہو تصویر کھینچ کر ہی مطمئن نہیں ہو جاتے بلکہ وہ اس کے ارتقائی عمل کو بھی دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ حقیقت انسانی جدوجہد کی بدولت کس طرح تبدیل ہو رہی ہے۔ لیکن وہ حال کے آئینہ میں مستقبل کی صرف ایک دھندلی سی اور ادھوری تصویر دیکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی فکر و نظر دیہاتی زندگی کی حدود میں گرفتار ہو کر رہ گئی۔ وہ اس قوت کا صحیح احساس نہ کر سکے جو ہندوستان میں صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ مزدوروں کی شکل میں رونما ہو رہی تھی۔ پریم چند کی اس کوتاہی کی وجہ سے ان کے ناولوں میں سماجی حقیقت پوری طور پر ہمارے سامنے نہیں ابھرتی۔ سماج کے بدلنے میں جو محنت کش مزدور طبقے کا رول ہے وہ نظر انداز ہو جاتا ہے۔ لیکن غالباً پریم چند کی یہ کوتاہی بھی ان کے حق میں اس لحاظ سے مفید ثابت ہوئی کہ انھوں نے انجانے میدان میں چھلانگ لگانے کی جسارت نہیں۔ ورنہ یہ خطرہ تھا کہ وہ محض تخیل کے بل بوتے پر سماجی ارتقاء کی ایک بے بنیاد عمارت کھڑی کر دیتے جیسا کہ ہمارے بعض ادیبوں نے اس زمانے میں کیا ہے اور اس طرح ان کی تصنیفات یقین آفریں ہونے کے بجائے بے اثر ہو کر رہ جائیں۔

آئیے، اب ذرا پریم چند کے چند ناولوں کا اس خیال سے جائزہ لیں کہ ان میں جو حقیقت ابھرتی ہے وہ کس نوعیت کی ہے۔

"بازارِ حسن" پریم چند کے ان ناولوں میں سے ہے جن میں ان کے اصلاح پسندانہ رجحان کی عکاسی ہوتی ہے۔ یہاں انھوں نے اس تہذیب کے گھناؤنے روپ کو بے نقاب کر کے دکھایا ہے، جو عورت کی عصمت کو بھی دوسری تجارتی چیزوں کی طرح خرید و فروخت کی جنس سمجھتی ہے۔ اس کا بھی بازار میں اسی طرح مول بھاؤ ہوتا ہے جس طرح کھانے پینے اور استعمال کی دوسری چیزوں کا۔ اس ناول میں ہمارے سماج میں اس عورت کے دکھ درد اور بے عزتی کی دل ہلا دینے والی داستان ہے۔ جو ماں کی شکل میں انسانی زندگی کو جنم دیتی ہے۔ بہن کے روپ میں ایثار اور قربانی اور انسانی صفات کی دیوی ہے اور بیوی کی حیثیت سے محبت کا مجسمہ، زندگی کی رفیق اور غمخوار ہے۔ یہاں سماج کی ان کھوکھلی قدروں پر تیکھا وار کیا گیا ہے جو انسان کو حیوان بنا دیتی ہیں۔ لیکن اس وقت پریم چند کے سامنے اس صورت حال سے چھٹکارا پانے کا کوئی واضح راستہ نہیں اس لئے ناول کی ہیروئن سمن آخرکار ایک آشرم میں جا کر پناہ لیتی ہے۔

"گوشۂ عافیت" پریم چند نے ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان لکھا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ پہلی جنگ عظیم کے نتیجے کے

طور پر تمام دنیا ایک بڑے اقتصادی سنکٹ میں مبتلا ہو گئی تھی اور ہندستان میں سامراجی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے یہ سنکٹ اور بھی زیادہ گہرا تھا۔ ترک موالات کی سیاسی تحریک عام تباہی کے احساس کا ایک عملی روپ تھی۔ اس پس منظر میں پریم چند نے ہندستان کی ادبی تاریخ میں پہلی بار دیہاتی کسان کی بغاوت کو اس ناول میں پیش کیا ہے۔ اس میں ہندستانی سماج کے ان تمام عناصر کو بے نقاب کیا گیا ہے جو کسانوں کی لوٹ کھسوٹ میں حصہ لیتے ہیں اور جب کسان متحد ہو کر اس کی مخالفت کرتے ہیں تو انھیں ظلم و تشدد کے ذریعے کچل دیا جاتا ہے۔ اس ناول میں پریم چند نے بہت صفائی کے ساتھ دہشت انگیزی اور تشدد کے خلاف عوامی اتحاد اور جد و جہد کی ضرورت کو پیش کیا ہے۔ ناول کا ہیرو بلراج روسی انقلاب سے انسپریشن حاصل کرتا ہے اور وہ کسانوں کے اندر ان کا لیڈر بن جاتا ہے۔ اگرچہ اس ناول میں دیہات کی زندگی کی ایک سچی جھلک دکھائی دیتی ہے لیکن آخر میں مسائل کا جو حل پیش کیا گیا ہے وہ حقیقت کے بجائے آدرش پرستی پر مبنی ہے۔ ناول کے تمام برے کرداروں کی قلب ماہیئت ہو جاتی ہے اور وہ ایک دم بھلے مانس بن جاتے ہیں۔

ترک موالات کی تحریک کی ناکامی نے تحریک کی کمزوریوں کو اجاگر کیا۔ پریم چند نے اپنے ناولوں میں ان کی تصویر کھینچی ہے۔ "رنگ بھومی" میں جو کہ ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۹ء کے بیچ میں لکھا گیا ہے۔ ہم ایک ایسے لیڈر سے دو چار ہوتے ہیں جو عوام کو دھوکا دے کر اپنا الّو سیدھا کرتا ہے اور عوام کے ساتھ غداری کرتا ہے۔ اس قسم کے کردار پریم چند کے بعض دوسرے ناولوں مثلاً "کایا کلپ" "غبن" اور "کرم بھومی" میں بھی ملتے ہیں۔ یہاں ان کی کردار نگاری، فنی حسن اور اثر سے بھرپور ہے۔ سماج کے اس کوڑھ کے خلاف پریم چند حقارت اور نفرت کا جذبہ بڑی کامیابی کے ساتھ ابھارتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خود کس قدر حب وطن کے جذبے سے سرشار تھے۔

"گئودان" پریم چند کا آخری اور سب سے بڑا شاہکار ہے۔ یہاں ہمیں ان کے شعور کی پختگی اور فن کے رچاؤ کا گہرا احساس ہوتا ہے۔ ناول میں جو کردار پیش کئے گئے ہیں وہ ایسے ٹائپ ہیں جن کی شکل و صورت کو ہم اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ وہ ہمیں سارے ہندستان میں پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس ناول میں یہ حقیقت بہت موثر انداز میں نمایاں ہوتی ہے کہ جاگیرداری نظام کی عمارت جو سامراج کے سہارے کھڑی ہے اپنی اندرونی کمزوریوں کی وجہ سے کس طرح گر رہی ہے اور کسانوں کا طبقہ اپنی زمینوں سے بے دخل ہو کر کیسے کھیت مزدور اور مل مزدور بن رہا ہے۔ اور اس عمل میں بلا کی کشمکش، الجھن اور مصیبت ہے۔ دوسری طرف اس ناول میں سرمایہ داری کا بھرم بھی کھلتا ہے کہ یہ نظام کس کس ڈھب سے مزدوروں کو لوٹتا کھسوٹتا ہے اور دوسرے محنت کش لوگوں کی بربادی کا سبب بنتا ہے۔ لیکن یہاں بھی پریم چند نے کسان کی تباہ حالی پر اپنے قلم کا زور صرف کیا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اس دنیا کو مٹتا ہوا دیکھ رہے تھے جس سے انھیں جذباتی لگاؤ تھا، جس کا کہ وہ خود ایک حصہ تھے۔ مگر ان کے سامنے نئی دنیا کی کوئی واضح شکل نہیں تھی۔ اس سے ان کے دل پر جو کچھ گذرتی تھی، وہ جس کڑھن، جلن اور غم و غصہ کو محسوس کرتے تھے اسے انھوں نے اپنے کرداروں میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔

"گئودان" کا ہیرو ایک عام کسان ہے جس میں وہ تمام خوبیاں اور کمزوریاں موجود ہیں جو کسی کسان میں ہوتی ہیں۔ ہوری ان تمام اخلاقی اور سماجی قدروں کا پابند ہے جو اس کے طبقے کی میراث ہیں۔ وہ زمیندار، کارندے، ساہوکار اور پروہت سبھی کی ہوس کا شکار بنتا ہے۔ یہاں تک کہ خود اپنے بھائی کے حسد کا نشانہ بنتا ہے۔ لیکن وہ انسانیت کا دامن اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ یکے بعد دیگرے اس پر جو آفتیں نازل ہوتی ہیں ان کا وہ جواں مردی کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔ طرح طرح کی مصیبتیں جھیلتا ہے لیکن اپنی عزت آبرو کا پاس رکھتا ہے۔ ہوری کی دھنیا اس کے مقابلے میں زیادہ لڑاکا اور زوردار کردار ہے۔ وہ اونچے طبقے کی زوال پذیر عورت نکمی، بین اور بےبسی کی تصویر نہیں بلکہ ایک ایسا کردار ہے جسے اپنے زور بازو پر بھروسہ ہے اور جو ہر ناانصافی کے خلاف لڑتی ہے۔ ہوری کے لڑکے گوبر میں ہمیں ایک باغی نوجوان کی روح کا احساس ہوتا ہے جو فرسودہ سماجی بندھنوں کو بے باکی کے ساتھ توڑتا ہے۔

یہ کردار نئی پود کا نمائندہ ہے۔ رائے صاحب کے کردار میں جاگیرداری کا بھدا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ رائے صاحب ایک بڑے زمیندار ہیں وہ مکر و فریب اور سازش کے پتلے ہیں۔ پریم چند نے نہایت فنکارانہ انداز میں ان کی شرافت اور دیش بھگتی کا پول کھولا ہے۔ اس طرح کھنہ کا کردار جو ایک شکر کے مل کا مالک ہے۔ سرمایہ داری کے بھیانک روپ کو بے نقاب کر دیتا ہے۔

غرض "گئودان" میں ہماری موجودہ سماجی زندگی کی ایک جیتی جاگتی تصویر موجود ہے۔ اس میں مختلف کرداروں کے باہمی سماجی رشتے واضح خطوط میں دکھلائے گئے ہیں۔ اس ناول میں پریم چند کے فن کردار نگاری کا ایک اچھا نمونہ ملتا ہے۔ ان کے کردار گراموفون ریکارڈ کی طرح اپنے ماسٹر کی آواز نہیں معلوم ہوتے بلکہ وہ خود اپنی بولی بولتے ہیں۔ وہ کٹھ پتلیوں کی طرح مصنف کے اشارے پر نہیں ناچتے بلکہ اپنی فطرت کے مطابق حرکت کرتے ہیں۔ وہ اسی جانی پہچانی دھرتی کے باشی ہیں۔ آسمانی فرشتے نہیں ہیں۔ یہ ہے پریم چند کی حقیقت نگاری کا کمال اور اس کے لئے لکھنے والے کو بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔

"گئودان" کے ہوری، دھنیا اور گوبر انفرادی جدوجہد کے ذریعہ شعوری لحاظ سے بہت ترقی کرتے ہیں لیکن وہ اس قابل نہیں ہو جاتے کہ اپنی مانگوں کے منوانے کی کوئی موثر تدبیر کر سکیں — یہ معذوری دراصل اس وقت کی تحریک آزادی کے کردار کو ظاہر کرتی ہے جب کہ پریم چند نے یہ ناول لکھا تھا۔ یہ اس صدی کی چوتھی دہائی میں قومی آزادی کی جدوجہد کی کمزوری اور تنگی کی دلیل ہے۔

پریم چند ہمارے دور کے عظیم فن کار ہیں۔ انھوں نے اپنے فن کو دولت مندوں کے بے جا اثر سے پاک اور آزاد رکھا۔ انھوں نے آزادی کے اس غلط اور گھٹیا تصور سے خود کو محفوظ رکھا جس کی آڑ لے کر بہت سے ادیب ہر بری بھلی چیز لکھ کر دولت کماتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ فلمی دنیا سے بہت جلد بیزار ہو کر واپس آ گئے اور انھوں نے فراوانی اور فراغت کی زندگی پر غریبی اور تنگی کی زندگی کو ترجیح دی تاکہ وہ اپنے فن کو بے روک ٹوک عوام کی جدوجہد کا آلہ بنا سکیں کہ فن کار کی حقیقی آزادی کا یہی راز ہے۔

پریم چند اپنے ناولوں، افسانوں اور لیکھوں کی بدولت ترقی پسند ادیبوں کے ہراول دستے میں ہیں۔ غیر مذہبی جمہوریت، ہندو مسلم اتحاد، متحدہ قومیت کے وہ علمبردار ہیں اور چھوا چھوت، مذہبی ڈھکوسلوں اور فرسودہ رسم و رواج کے سخت مخالف ہیں۔ ان کی ہمدردی ہمیشہ مظلوم طبقے کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ ہر جگہ سماجی ناانصافی اور عدم مساوات کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ غرض ان کی تمام تحریروں میں ایک گہری اور ہمہ گیر انسان دوستی کی روح کارفرما ہے۔

پریم چند کا اسلوب سیدھا سادھا ہے۔ یہ ان کے افکار کی صفائی کی دلیل ہے۔ وہ جنتا کی بولی کو زیادہ سے زیادہ اپناتے ہیں۔ انھیں اس کے حسن اور معنویت کا احساس ہے اور وہ عوام کی بولی کو بڑی فنکارانہ چابک دستی اور بے تکلفی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں وہ مسئلہ کبھی پیدا نہیں ہوا جسے بہت عرصے سے ہندی اردو مسئلے کے نام سے بہت اچھالا اور بہت الجھایا جا رہا ہے۔ انھوں نے اپنے تمام ناول اور افسانے ایسی زبان میں لکھے ہیں جس پر ہندی کے پجاری ہندی سمجھ کر سر دھنتے ہیں اور جسے اردو کے طرفدار اردو کہہ کر سراہتے ہیں۔ اس لحاظ سے پریم چند کی حیثیت وہی ہے جو مذہبی اعتبار سے کبیر کی تھی جن کی لاش کو ہندو اپنا سمجھ کر جلانا چاہتے تھے اور مسلمان اپنا سمجھ کر دفن کرنا چاہتے تھے۔ اس میں ہندی اور اردو کے نام لیواؤں کے لئے ایک چیتاونی ہے۔

ادب اور کردار نگاری

عفت سراج صاحبہ

ایک بار الہ آباد جانے کا اتفاق ہوا تو ایک ادیب دوست نے جو ہندی کے مشہور افسانہ نگار ہیں ایک تازہ رسالہ میرے سامنے رکھ کر پوچھا: "میری یہ کہانی پڑھی؟" میرا جواب نفی میں پاکر انھوں نے شکایت بھرے لہجے میں کہا "آپ میری کہانیاں نہیں پڑھتے مگر یہ کہانی بہت شاندار ہے اسے ضرور پڑھئے۔ میں نے اس میں فلاں لیڈر کا فلاں پمفلٹ سارے کا سارا لکھا دیا ہے۔"

میں مسکرایا اور رسالہ ایک طرف رکھتے ہوئے بولا "معاف کیجئے گا میں نے وہ پمفلٹ پڑھ لیا ہے۔"

یہ پمفلٹ یا اخبار پڑھ کر کہانی لکھنے کی رو چار پانچ سال پہلے بہت زور سے چلی تھی اور ابھی تک چل رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے کہانی اور ناول میں کردار نگاری کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ ہم سیاسی یا سماجی نظریئے بیان کر کے ایک قسم کا تاثر پیدا کر دینا ہی کافی سمجھتے ہیں لیکن افسانہ اور ناول کی بہت سی جزئیات میں سے کردار نگاری ایک اہم جزو ہے۔ تکنیک اور اسلوب خواہ کچھ بھی استعمال کیا جائے اور اس میں فی زمانہ خواہ کچھ بھی تبدیلی واقع ہو جائے مگر ایک ادیب جب تک افسانہ نگاری پر پوری توجہ صرف نہیں کرتا وہ اپنے فرائض سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ گذشتہ دنوں چینی ادیبوں کا جو ایک وفد ہندوستان آیا تھا اس کے ڈپٹی لیڈر (نام یاد نہیں رہا) نے میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ کردار نگاری ادب کا اگر لازمی نہیں تو کم از کم ایک اہم جزو ضرور ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ چین میں کچھ کہانیاں ایسی بھی لکھی جاتی ہیں جن میں کردار نگاری کا فقدان ہوتا ہے مگر ایسی کہانیوں کی زندگی بہت مختصر ہوتی ہے۔ انھیں جلد بھلا دیا جاتا ہے۔"

کامریڈ کانسین مرحوم سابق صدر سوویت روس ادب کے بلند پایہ نقاد تھے۔ چند سال پہلے سوویت لٹریچر کے ایک شمارہ میں شیلوخوف نے ان سے اپنی ایک ملاقات شائع کی تھی جس میں کانیتی نے ادب میں کردار نگاری پر زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ چیخوف کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ ان کے کردار اس قدر زندہ اور حقیقی ہوتے ہیں کہ ایک بار پڑھنے کے بعد ذہن پر چھا جاتے ہیں۔ کبھی نہیں بھولتے۔ یہی وجہ ہے کہ چیخوف کی کہانیاں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور وہ ہمیشہ یاد رہتی ہیں۔ اس کے برعکس جن کہانی اور ناول میں کردار نگاری کمزور ہو انھیں ایک بار پڑھ لینا بھی ممکن نہیں ہوتا۔"

اردو میں ۱۹۳۶ء کے بعد نیا ادب کی جو تحریک چلی تھی اس میں ہیئت اور تکنیک کے بہت سے تجربے ہوئے اور اب بھی ہو رہے ہیں۔ پچھلے دنوں "شاہراہ" بمبئی کے سالنامہ میں اور "افکار" کراچی میں خواجہ احمد عباس کی ایک کہانی "مونتاژ" کے نام سے شائع ہوئی ہے جس کی پیشانی پر خود خواجہ احمد عباس کے یہ الفاظ درج ہیں: "بظاہر غیر متعلق ان مل بے جوڑ اور بے معنی مناظر میں ایک خاص ڈھنگ سے ربط پیدا کرنے کو فلمی تکنیک میں (Montage) کہتے ہیں ——— یہ افسانہ (جو حقیقت بھی ہے) اصلی واقعات کو اسی طرح ترتیب دے کر بنایا گیا ہے۔ اس افسانہ کو میں نے تخلیق نہیں کیا۔ یہ آپ سے آپ لکھا گیا ہے۔ میں صرف ترتیب دینے کا ذمہ دار ہوں۔ اس افسانہ کا ہیرو کون ہے اور ہیروئن کون ہے اس کا شاید فیصلہ نہ کیا جا سکے۔ مگر ویلن کے بارے میں کوئی شبہ نہیں۔"

وہ مواد بہرحال اس لئے نہیں کہ کہانی اخبارات میں وقتاً فوقتاً شائع ہونے والی خبریں جمع کر کے مرتب کی گئی ہے جن سے قاری کسی حد تک واقف ہو جاتا ہے کہ کانگریس راج میں بھی عوام کی حالت ذرا نہیں سدھری۔ لوگ کسمپرسی کی زندگی بسر کرتے ہیں، فاقے کرتے ہیں اور بے گناہ ہوتے ہوئے قانون کی نظروں میں مجرم ہیں۔ دوسری طرف عوام دشمن طبقے لوٹ کھسوٹ کے نئے طریقے اور حربے استعمال کرتے ہیں اور اپنی مجرمانہ حرکتوں کے باوجود قانون کی گرفت سے آزاد ہیں۔

افسانے کے اس تاثر اور اس کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں بلاشبہ یہ بہت بڑی حقیقت ہے۔ لیکن فنی اعتبار سے یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ افسانہ میں کردار نگاری کا یکسر فقدان ہے۔ اخبار کی خبریں بھی ایک تاثر ہوتا ہے۔ خواجہ احمد عباس نے بہت سی خبروں کو یکجا کر کے جس ڈھنگ سے انھیں پیش کیا ہے اس سے تاثر یقیناً شدید ہو گیا ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ افسانہ کو فنی اعتبار سے کامیاب بنانے کے لئے جو محنت درکار ہے خواجہ صاحب نے اس سے جی چرایا ہے۔ کردار نگاری تو ایک طرف کہانی میں ادیب کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ بھی شامل نہیں ہے۔ خواجہ احمد عباس کی کہانی تو صرف مثال کے طور پر پیش کی گئی ہے ورنہ تجربے اور مشاہدے کی کمی اور محنت سے جی چرانے کا رواج عام ہے اور بدقسمتی سے یہ رواج ادب کی ترقی پسند تحریک سے منسوب ہے حالانکہ ترقی پسند ادیبوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی تخلیقات میں ٹھوس متحرک اور مثبت کردار پیش کریں کیونکہ وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں اور وہ ادب میں عوام کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جب تک وہ عوام کی زندگی کا مطالعہ نہیں کریں گے ان کے مسائل، ان کی نفسیات اور فلسفۂ حیات کو اچھی طرح سمجھ نہیں لیں گے وہ عوام کو متاثر کرنے والا ادب پیدا کرنے میں قاصر رہیں گے پھر جب قاری کو ادب میں ایسے کردار ملیں گے جو اس کی اپنی زندگی سے مشابہت رکھتے ہیں جو اس کے اپنے جیسے ہیں۔ جن کے درمیان وہ زندگی بسر کرتا ہے جن سے اسے ہر روز واسطہ پڑتا ہے تو وہ ایسی کتابوں کو زیادہ دلچسپی سے پڑھے گا اور ان کرداروں کے ذریعے اس کی اپنی تربیت ہوگی اور جو افسانہ یا ناول میں بلند اخلاق کے مثبت کردار ہیں وہ زندگی کو بہتر بنانے کی جدوجہد میں اس کی رہنمائی کریں گے اور ان کرداروں کی مثال سے اس کے اپنے کردار میں استحکام اور عزم پیدا ہوگا۔ یوں ادب کی افادیت اور ادب برائے زندگی کے نظریہ کو ادیب عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہوگا۔

لیکن اس کے برعکس ہوتا یہ ہے کہ ہم عوام کی نمائندگی کا دم بھرتے ہیں۔ ادب کی افادیت کے قائل ہیں اور ادب برائے زندگی کا نعرہ لگاتے ہیں۔ لیکن جب کوئی ہماری تخلیق میں "عوام نکالتا" ہے۔ کردار نگاری کے فقدان کا عیب نکالتا ہے اور ہماری تخلیق کے پروپیگنڈا محض ہونے کی شکایت کرتا ہے تو ہم خود تنقیدی کے اصول کو ترک کر کے بڑے فخر سے کہتے ہیں۔ "جی ہاں، ہم پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ سارا ہی ادب پروپیگنڈا ہے۔" اور اگر ہمارا بس چلے تو ہم معترض کو رجعت پرست کہہ کر منہ چڑانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ایک دور تھا جب ہم معترضوں کو رجعت پرست کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتے تھے اور دوستوں کی چیزوں کو کلاسیکل کہہ کر اچھالتے تھے لیکن اب ادب کی ترقی پسند تحریک سترہ اٹھارہ سال کی نوجوانی میں قدم رکھ چکی ہے۔ اوائل عمر یا بچپن کا ابتدائی زمانہ بہت پہلے ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن ملک کے حالات ہی ایسے تھے کہ ہم نے جذباتی باتیں کرنا ہی بہتر سمجھا۔ لیکن اب وہ دور شروع ہوتا ہے کہ ہم پر ایک نئے عہد کی رہنمائی کا فرض عائد ہوتا ہے ہمیں اب اپنے قول اور فعل کے بارے میں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے ہمیں سیاست کی طرح ادب میں بھی جمہوری عناصر کا مشترکہ محاذ قائم کرنا ہے جنھیں ہم نے اپنے تعصب کی وجہ سے الگ کر دیا ہے انھیں ساتھ لانا ہے اور نوجوانوں کی صحیح رہنمائی کرنا ہے۔ موضوع اور کردار نگاری میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ جب تک موضوع کردار سے ہم آہنگ نہ ہو خواہ ہم اسے کتنی بھی خوبصورت اور دلچسپ زبان میں پیش کریں۔ ہماری تخلیق کو افسانوی ادب میں ایک مستقل حیثیت حاصل ہونا ممکن نہیں۔ اگر ہم ماضی پر نظر ڈالیں اور ایسے افسانوں کا نام یاد کریں جنھیں ہم نے کبھی بزعم خود کلاسیکل کہا تھا تو انھیں کوئی آج تیسرے درجے کا افسانہ ماننے کو بھی تیار نہ ہوگا اور جن لوگوں کو

افسانے کے "جنادری" سمجھا جاتا تھا ان کا فن اور کمال آج ہمیں انحطاط پذیر کیوں دکھائی دے رہا ہے حالانکہ ہوتا یہ ہے کہ افسانہ نگار کا جوں جوں تجربہ اور مطالعہ وسیع ہوتا ہے اس کے فن میں پختگی آتی ہے اس کے کردار ٹھوس اور واضح ہوتے جاتے ہیں۔ کسی دیس کی ادبی تاریخ پر نظر ڈال لیجئے ایسے ادیب جنھوں نے زندگی کی صحت مند قدروں کو لے کر لکھنا شروع کیا جوں جوں ان کا تجربہ بڑھا گیا ان کے نقطۂ نظر میں وسعت پیدا ہوئی ہے اور جتنا وہ اندرونی تضاد کو حل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں آخری عمر میں اتنے ہی اچھے شاہکار انھوں نے پیش کئے ہیں۔ ڈکنس، بالزک، اناطول فرانس، وکٹر ہیوگو، ترگنیف، چیخوف، گورکی، رداں رولاں، لوسون، ٹیگور اور پریم چند اس کی واضح مثالیں ہیں اور ان کے شاہکار اس لئے شاہکار بن سکے ہیں کہ انھوں نے جتنا عظیم موضوع منتخب کیا ہے ان کے پاس کردار نگاری کا فن بھی اتنا ہی عظیم ہے۔

مثال کے طور پر گورکی کا ناول "ماں" لیجئے وہ موضوع کے اعتبار سے عظیم ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں لیکن اگر اس کا ہیرو پاویل ایک زندہ کردار نہ ہوتا اور اس میں اس روسی مزدور کی تمام خوبیاں موجود نہ ہوتیں جس نے ۱۹۰۵ء کے انقلاب کی رہنمائی کی تھی تو گورکی کی اس تصنیف کو جو درجہ آج حاصل ہے وہ کبھی حاصل نہ ہوتا اور گورکی کے روسی نقادوں کا کہنا ہے کہ گورکی نے پاویل اور اس کی ماں کو فی الواقعی دیکھا تھا اور ان کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ گورکی کے اس ناول میں اس عہد کی روسی زندگی اپنی تمام حقیقتوں اور پیچیدگیوں کے ساتھ موجود ہے۔ حالانکہ گورکی پہلا ادیب ہے جس نے مزدور کو اپنی ناول کا ہیرو بنایا اور پرولتاری اخلاق اور کلچر کو بورژوا اخلاق اور کلچر کے مقابلے میں پیش کیا اور کسی کو یہ جراءت نہ ہو سکی کہ وہ "ماں" ناول کو پروپگنڈا کہے۔ دنیا کے بہترین ناولوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ موضوع خواہ کچھ بھی ہو اسے فنکارانہ ڈھنگ میں پیش کرنا ضروری شرط ہے اور فن میں اسلوب اور شوکت الفاظ سے کہیں زیادہ کرداری کو اہمیت حاصل ہے۔ زبان اور اسلوب کی خامیاں کسی حد تک برداشت کی جا سکتی ہیں لیکن کردار نگاری ایک ایسا اہم جز ہے کہ اسے نظر انداز کرنے والا ادیب ایک روز خود نظر انداز ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اسلوب اور بیان کی خوبیوں کے باعث وہ کچھ دن مقبول رہے (اردو افسانہ نگاری میں سدرشن اور راشد الخیری کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں) لیکن آخر میں اسے اور اس کی تخلیقات کو خواب کی باتوں کی طرح بھلا دیا جاتا ہے اور کردار نگاری کتابیں پڑھ کر سیکھنے سے نہیں آتی اس کے لئے زندگی کا مطالعہ اور مشاہدہ ضروری ہے۔ پھر ہم ترقی پسند یہ مانتے ہیں کہ خیالات مادے سے پیدا ہوتے ہیں۔ انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہے اس لئے انسان کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ اس کے ماحول اور مادی حالات کا مطالعہ بھی ضروری ہے تبھی ہم اس کے جذبات اور احساسات کی صحیح عکاسی کر سکتے ہیں۔ اگر ہم تفصیل سے لکھیں گے اور اپنے خیالات کو قاری تک پہنچانے کے لئے کردار کو محض کٹھ پتلی بنائیں گے تو ہماری تخلیق ناقص ہوگی۔ ادب میں حقیقت نگاری کی ابتدا سے پہلے قصہ گو یہ کر سکتا تھا کہ وہ کرداری نگاری کو نظر انداز کر کے قصہ کی دلچسپی برقرار رکھے اور اس کے ذریعہ اپنی بات کہتا جائے۔ ارسطو نے اپنی کتاب "بوطیقا" میں ٹریجڈی پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ڈرامہ میں کردار پر قصہ کو ترجیح دیجائے۔ قرون وسطیٰ تک یہی اصول قائم رہا لیکن الزبتھ کے عہد کے اور خصوصاً شیکسپیر کے ڈراموں کا جب تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان میں مقصد سے کہیں زیادہ کردار اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد کیا ڈرامہ، کیا کہانی اور کیا ناول سب میں ہمیشہ قصہ پر کردار نگاری کو ترجیح دی گئی ہے اور یہی حقیقت پسندی کے نام پر تخلیق ہونے والے ادب کی نمایاں خصوصیت ہے۔ بیسویں صدی کے آخر میں مختصر افسانہ نگاری کی ابتدا ہوئی۔ موپاساں اور چیخوف اس جدید افسانہ نگاری کے امام ہیں۔ لیکن موپاساں اور چیخوف میں نمایاں فرق یہ ہے کہ موپاساں قصہ اور خارجیت پر زیادہ توجہ صرف کرتا ہے۔ لیکن چیخوف میں قصہ اور بھی مختصر ہو گیا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں خارجیت اور داخلیت کا کچھ ایسا حسین امتزاج پیش کرتا ہے کہ اس کا کردار اپنے ماحول اور طبقہ کا صحیح نمائندہ بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس لئے ہمیں

انسانی فطرت کے مختلف رجحانات اور پیچیدگیوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ چیخوف کی کہانیوں میں کہیں ایک سطر بھی ایسی نہیں ملتی جو کردار کی فطرت اور اس کے خارجی ماحول سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ چونکہ چیخوف نے کردار نگاری کے فن کو اپنے عروج پر پہنچایا ہے اس لئے افسانوی ادب میں چیخوف کو جو بلند مقام حاصل ہے کوئی دوسرا ادیب اس کے آس پاس بھی نہیں پہنچتا۔ ٹالسٹائے کے "وار اینڈ پیس" اور "اینا کرینینا" ناولوں میں سینکڑوں کردار ہیں وہ اپنے ماحول اور طبقہ کی خصوصیتوں کو بدرجہ اتم نمایاں کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہر کردار کی ایک انفرادی حیثیت ہے اور وہ ایک دوسرے سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ میکسم گورکی ادب میں کردار نگاری کی اسی شاندار روایت کا علمبردار ہے اور وہ اس سلسلے میں رقم طراز ہے :—

"ایک ادیب کا کام بہت ہی دقت طلب ہے۔ لوگوں کے بارے میں کہانیاں لکھنے کا مطلب محض "تانا بانا" بن دینا ہرگز نہیں۔ اس کا مطلب ہے الفاظ کے ذریعے لوگوں کی تصویر کشی کرنا جیسے کوئی پنسل یا برش کی مدد سے تصویریں بناتا ہے۔ اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ادیب کو اپنے موضوع پر پوری قدرت حاصل ہو اور وہ اپنے کردار کے ہر عمل کو بخوبی سمجھتا ہو اور پھر وہ ان سب باتوں کو سادہ اور واضح الفاظ میں یوں تحریر میں لائے کہ قاری کو چھپے ہوئے الفاظ کے پیچھے سے زندہ انسان کا چہرہ ابھرتا ہوا دکھائی دے اور اس کی حرکات و احساسات میں ایک قدرتی امتزاج نظر آئے۔" (آرٹ اینڈ لائف)

ہم ایک قدیم ملک کے باشندے ہیں اور ایک قدیم تہذیب کے وارث۔ ہمارے افسانوی ادب کی ابتداء دیومالا سے ہوتی ہے اور ہماری دیومالا نے سینکڑوں ایسے عظیم اور لافانی کردار پیش کئے ہیں جو صدیوں سے زندہ ہیں اور عوام کے ذہن پر نقش ہیں۔ پھر رامائن اور مہابھارت ایسی لازوال مثنویاں ہیں جن میں سینکڑوں، ہزاروں کردار ایسے پیش کئے گئے ہیں جو نیکی، بدی، حق و باطل اور شرافت و کمینگی کے مجسمے ہیں۔ جن میں سے کسی کی ہم پرستش کرتے ہیں اور کسی سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کرداروں کے اب تک عوام کے ذہنوں پر چھائے رہنے کی وجہ یہ ہے کہ انھیں مصنفا نے انتہائی خلوص کے ساتھ پیش کیا ہے اور وہ ہمارے کلچر کی تمام خوبیوں اور خامیوں کے علمبردار ہیں۔ رامائن اور مہابھارت کی مقبولیت اور شہرت کی بنا پر شکوہ عبارت یا عجیب و غریب ہیئت اور تکنیک نہیں بلکہ بلند پایہ کردار نگاری ہے۔

ہم رامائن، مہابھارت اور اپنی دیومالا سے کردار نگاری کے سلسلے میں بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ پھر پنچ تنتر کو لیجئے گو وہ جدید افسانوی تکنیک پر پوری نہیں اترتی لیکن وہ دنیا بھر میں کہانیوں کی پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اسے وشنو شرما نے اسّی سال کی عمر میں بہت سے تجربے، مشاہدے اور مطالعے کے بعد لکھا تھا اور اس کی تمہید میں مصنف نے لکھا ہے کہ "جب تک آدمی بہت سے جیس اور بھاشا کو دیکھ سمجھ نہیں لیتا اس کا علم مکمل نہیں ہوتا۔" گو کہانیاں بیشتر جانوروں سے متعلق ہیں۔ لیکن اس میں مصنف کا تجربہ اور مشاہدہ پوری طرح موجود ہے۔ اس نے ہزاروں جانوروں کے جو نام اور کردار تخلیق کئے ہیں ہمارے سماج کے مختلف انسانوں پر ان کا جوں کا توں اطلاق ہوتا ہے۔

گو یہ ٹھیک ہے کہ جدید افسانہ نگاری کی ابتداء سائنس کی ترقی کے ساتھ یورپ میں ہوئی۔ فرانس اور روس نے اسے عروج پر پہنچایا۔ انگریزی زبان کے ذریعہ اس کی ابتداء ہمارے دیس میں پہلے بنگال میں پھر سارے ہندستان میں ہوئی لیکن حقیقت پسند افسانوی ادب کو ملک کے حالات اور روایات سے الگ رکھ کر ترقی دینا ممکن نہیں۔ اگر ہم اپنے دیس کے دو عظیم فنکاروں ٹیگور اور پریم چند کو لیں تو یہ صحیح ہے کہ انھوں نے مغربی ادب سے متاثر ہو کر جدید صنف کے افسانے اور ناول تخلیق کئے لیکن ان کے سوچنے کا تصور بالکل ہندستانی تھا۔ بیسویں صدی میں سرمایہ داری کے زوال کے ساتھ افسانوی ادب کا بھی زوال

ہوا ہے۔ حقیقت نگاری اور کردار نگاری کی جگہ لفظی شعبدہ بازی اور ہئیت کی جدت پسندی نے لے لی ہے لیکن پریم چند اور ٹیگور بیسویں صدی کے ان زوال پسند بورژوا ادیبوں کے بجائے انیسویں صدی کی پیداوار ٹالسٹائے، رو ماں رولاں، ڈکنس، بالزک اور چیخوف سے متاثر تھے اور انھوں نے مغربی ادب کی بہترین روایت کو اپنایا تھا اور اس کے ساتھ انھوں نے اپنے دیس کی روایات اور زندگی کا بھرپور مطالعہ کیا تھا چنانچہ اپنی نظریاتی خامیوں کے باوجود ان کی تخلیقات میں انسان دوستی کی روح جاری وساری ہے اور ان کے کردار زندہ کردار ہیں۔ ٹیگور کا کابلی والا 'گورا' چندرمنی اور پریش بابو کسے متاثر نہیں کرتے۔ پریم چند نے دھنیا' چھنیا' منوہر' بلراج ' گوبر' ہوری' امرکانت اور مایا ہندستانی عوام کے نمائندہ ایسے سیکڑوں کردار دیئے ہیں کہ اپنی اصلاح پسندی کے باوجود پریم چند آج ہمارے کلاسک میں شامل ہیں اور جیسے جیسے عوام میں تعلیم پھیلے گی انھیں ان کے کھوئے ہوئے حقوق ملیں گے اور وہ اپنے کلچر کے آپ وارث ہوں گے۔ پریم چند کا مرتبہ بڑھتا جائے گا اور ہمارا موجودہ ادب پریم چند کی روایات اپنا کر ہی آگے بڑھ سکے گا اور اس روایت میں کردار نگاری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں خود پریم چند رقمطراز ہیں:۔

> "واقعہ نگاری کا رجحان یہاں تک روبہ ترقی ہے کہ آج کا افسانہ ممکن حد تک مشاہدے سے باہر نہیں جاتا۔ ہم محض اس خیال سے تسکین نہیں پاتے کہ نفسیاتی اعتبار سے یہ سبھی کردار انسانوں سے ملتے جلتے ہیں بلکہ ہم یہ اطمینان چاہتے ہیں کہ وہ واقعی انسان ہیں اور مصنف نے حتی الامکان ان کی سوانح عمری لکھی ہے۔"
>
> (خطبۂ صدارت ۱۹۳۶ء)

آج اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہم نے ٹیگور اور پریم چند کی روایت کو کہاں تک آگے بڑھایا ہے۔ ان کے بعد ہمارے افسانوی ادب نے کہاں تک ترقی کی ہے؟ تو اس کی ایک۔ اور صرف ایک کسوٹی یہ ہے کہ ہم نے کتنے زندہ اور عظیم کردار تخلیق کئے ہیں۔ ہئیت اور تکنیک کے تجربے کرنا یا جنگ، امن اور بین الاقوامی موضوعات پر لکھنا ترقی کا کوئی معیار نہیں۔ اخباروں کے ایڈیٹوریل ہمیشہ انھیں باتوں پر لکھے جاتے ہیں۔ ممکن ہے آپ نے بہتر زبان استعمال کی ہو لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے ہئیت اور تکنیک کے تجربہ کی دھن میں حقیقت کو مسخ کر دیا ہو۔ ترقی پسندی کرداری نگاری کی منافی نہیں۔ چونکہ ترقی پسندی کا مطلب ادب کا زندگی اور عوام سے براہ راست تعلق قائم کرنا ہے اس لئے کردار نگاری کے معاملے میں ترقی پسند ادیب کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ایک ادبی تخلیق صحافت اور فلسفے سے اس ضمن میں مختلف ہوتی ہے کہ اس میں ایک خیال کو مجسم کر کے انسانی روپ میں پیش کیا جاتا ہے ایک ادبی تخلیق میں ایک سماجی اور سیاسی نظریہ اور ایک تضاد ایک انسان کی ـــ ایک کردار کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے اور وہ کردار اپنے دور کے ایک قطعی خیال کا بہترین نمائندہ ہوتا ہے، اگر کوئی ادیب ایسا کرنے سے قاصر رہتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کا زندگی اور سماج کا مطالعہ ناقص ہے۔ کردار نگاری کے معاملے میں مارکس کا کہنا ہے۔

> "انسان کا کردار اپنے ماحول کی پیداوار ہے۔ تمہیں ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھنا ہوگا اگر تم کردار تخلیق کروگے۔"

ایک انسانی کردار کی وضاحت حرکات وسکنات اور اس کے اعمال کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اینگلز نے لکھا ہے " ایک شخص کا کردار صرف اسی بات پر منحصر نہیں کہ وہ کیا کام کرتا ہے بلکہ اس پر منحصر ہے کہ وہ اسے کیسے کرتا ہے۔"

اگر ہم کوئی کردار اپنے تخیل سے گھڑ لیتے ہیں تو یہ تو ممکن ہے کہ ہم اپنے تخیل سے اس کے ساتھ کوئی کام بھی وابستہ کر دیں لیکن محض تخیل سے یہ جان لینا ممکن نہیں کہ وہ اس کام کو کیسے کرتا ہے اس لئے جس ماحول اور جن انسانوں کو ہم نے دیکھا نہیں ہم ان کے بارے میں کہانیاں یا ناول بھی نہیں لکھ سکتے۔ اگر لکھتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہماری کوششیں ناکام رہتی ہیں اور لوگ بجا طور انھیں *

---

* نعرے بازی کا نام دیتے ہیں۔ اب اس خامی کو دور کر کے ہی ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔

برائے بحث

اقبال اور اُن کی شاعری

عالم خوندمیری

پچھلے دنوں انجمن عوامی مصنفین (حیدرآباد) کی جانب سے "اقبال اور ان کی شاعری کے عنوان پر ایک سمپوزیم رکھا گیا تھا جس کی ابتداء اس مضمون کی شکل میں عالم خوندمیری نے کی تھی۔ طے یہ ہوا تھا کہ پوری کا بحث کسی رسالے میں شائع کروائی جائے لیکن ان ساتھیوں نے جنھوں نے بحث میں حصہ لیا تھا اور خود اپنے خیالات قلمبند کر کے دینے والے تھے ابھی تک اپنا وعدہ پورا نہیں کیا اس لئے مجبوراً عالم صاحب کا مضمون ہی اشاعت کے لئے روانہ کیا جا رہا ہے۔

سلیمان اریب
سکریٹری انجمن عوامی مصنفین

اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اس کے باوجود اقبال کی شاعری اور ان کے پیام کے بہت سے رخ ایسے ہیں جن پر ابھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ اگر اقبال اردو کے سب سے بڑے شاعر نہیں بھی ہیں تو اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ اردو کے ایک بہت بڑے شاعر ہیں اور اگر غالب نہ ہوتے تو شاید اقبال ہی اردو کے سب سے بڑے شاعر ہوتے ان کی عظمت اور ان کے کمالِ فن نے کسی نقاد کو بھی یہ جرأت عطا نہیں کی کہ وہ ان کے پیام اور ان کی شاعری پر تنقید کر سکتا' اقبالیات کا اکثر حصہ اقبال کی تفسیر سے زیادہ نہیں' اور اقبال کے خلاف جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں صوبائی تعصب اور گروہ بندی کے خطرناک اور زہریلے رجحانات کی کارفرمائی کے سوا کچھ اور نہیں۔ میری نظر سے صرف سردار جعفری کی کتاب "ترقی پسند ادب" ایسی گذری جس میں انھوں نے اقبال کے مقام کو متعین کرنے کی صحیح کوشش کی ہے۔ اب تک یہ ہوتا آیا تھا کہ یا تو اقبال کو کلیتہً قبول کر لیا جاتا تھا یا پھر اکثر رائے پوری کی طرح انھیں فاشسٹ اور رجعت پسند کہہ کر پوری طرح نظرانداز کرنے کی کوشش کی جاتی تھی لیکن پہلی بار سردار جعفری نے اقبال کے ترقی پسند ورثہ کو پیش کیا ہے۔ بدقسمتی سے پچھلے چند دنوں سے یہ صدا بلند کی جا رہی ہے کہ اقبال کا پیام تمام کا تمام رجعت پسند تھا۔ وہ جمہوریت کے دشمن تھے اور فاشزم کے علمبردار تھے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں ایسے نقاد اقبال کے منفرد اشعار کے نمونے پیش کر دیتے ہیں اور اپنی دانست میں مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انھوں نے اقبال کی فاشسٹ ذہنیت کو ثابت کر دیا۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال کے تصورات میں ہمیں جا بجا تضادات نظر آتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک سماجی اور معاشی مسائل کا تعلق ہے ان کے سامنے کوئی واضح اور صاف نصب العین نہیں تھا۔ وہ پرانے نظام سے بیزار تھے انھیں اس نظام کی تباہ کاریاں صاف نظر آتی تھیں' جاگیرداری اور سرمایہ داری نظم معیشت کی انسان دشمنی اور ان نظاموں میں انسان کی رسوائی کو انھوں نے پوری طرح محسوس کیا اور یہ بھی دیکھا کہ اس نظام نے انسان کی ساری تخلیقی صلاحیتوں کو ختم کر دیا ہے اور سارے تخلیقی سوتوں کو خشک کر دیا ہے۔ اس لئے انھوں نے اس نظام کے خلاف نعرہ بلند کیا اور اس جنگ میں ایک

یہ مصالحت آمیز رویہ یہ آخر وقت تک قائم رہے لیکن ساتھ ہی کسی ایسے قابل عمل نظام کی نشاندہی نہ کر سکے جو اس پرانے اور فرسودہ نظام کی جگہ لے سکتا اور انسانیت کے موجودہ مصائب اور پریشانیوں کا خاطر خواہ علاج کر سکتا۔ انھیں پوری طرح احساس تھا کہ یہ سارا نظام معاشرت فرسودہ ہو چکا ہے اور اس میں زیست کی صلاحیت بالکل باقی نہیں۔ وہ نہ صرف ایک نئے سماج کے خواہاں تھے بلکہ اپنے لئے ایک نئی کائنات کی تخلیق کرنا چاہتے تھے جس میں ہر چیز نئی ہو' فلک بھی نیا اور ستارے بھی نئے ـــ قدیم سے اتنی شدید نفرت اور جدید سے اتنا والہانہ عشق' اقبال کے سوا کسی دوسرے شاعر میں نہیں ملتا۔ اردو تو کیا کسی دوسری زبان کے کسی شاعر نے بھی اس شدت کے ساتھ اپنے فرسودہ ماضی کے خلاف اس قدر شدید بیزاری کا اظہار نہیں کیا۔ اقبال کے سوا کسی دوسرے شاعر نے اس قدر یقین کے ساتھ ایک نئی دنیا کی تعمیر کی نشانیوں کو نہیں دیکھا۔ مثلاً ؎

چشم بکشائے اگر چشم تو صاحب نظر است　　　زندگی در پئے تعمیر جہانے دگر است

پرانی سیاست' پرانی معیشت اور پرانے نظام حیات کی زوال پذیری کا اتنا صاف نقشہ کسی نے پیش نہیں کیا جو اقبال کی مشہور نظم ساقی نامہ میں ہمیں ملتا ہے ؎

پرانی سیاست گری خوار ہے　　　زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا　　　تماشہ دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے　　　ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے

لیکن افسوس ہوتا ہے کہ ماضی سے بیزاری اور قدیم سے نفرت کے باوجود اور ماضی کے تمام اصنام ڈھا دینے کے بعد اقبال نے اسلام کے پرانے نظام کی طرف دعوت دی اور اسی میں انسانیت کو اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے کی جانب ابھارا۔ سچ تو یہ ہے کہ اقبال کی یہ آواز کہ ؎

شراب کہن پھر پلا ساقیا　　　وہی جام گردش میں لا ساقیا

ان کی ماضی سے بیزاری سے کسی طرح ہم آہنگ نہیں ہوتی۔ لیکن محض اس بنا پر انھیں (Renaissance) احیاء پسند نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ان کے نزدیک اسلام خود ایک جامع نظریۂ حیات کا نام نہیں تھا بلکہ ان کے تخلیقی تصور اور خلاق ذہانت نے اسلام کو بھی ایک نئے روپ میں پیش کیا۔ یہاں ایک ایماندار نقاد کو ان کے فکر کے اس تضاد کو عیاں کرنا چاہیئے بجائے اس کے کہ ان پر ماضی پرستی کا غلط الزام عاید کیا جائے۔ ہمیں اقبال پر یا کسی دوسرے پرانے شاعر' ادیب یا مفکر پر تنقید کرتے ہوئے یہ نہ بھول جانا چاہیئے کہ شاعر' ادیب اور مفکر زمانہ ساز ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کی پیداوار بھی ہوتا ہے اور وہ پوری طرح ان حدبندیوں کو توڑ نہیں سکتا جن میں اس کا شعور ترقی پاتا ہے۔ انسانی شعور کسی خلاء میں پرورش نہیں پاتا بلکہ ایک خاص سماجی سرزمین پر شعور کی نشوونما ہوتی ہے۔ خاص مادی' سماجی اور سیاسی حالات سے الگ کر کے کسی کے شعور کو پرکھنے کی کوشش' شعور کی ماہیت سے لاعلمی کا ثبوت ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ کہاں تک اس شاعر یا مفکر نے اپنے زمانے کے ترقی پذیر تمدن کی تائید کی اور کہاں تک اس نے انحطاط پذیر سماج کو بے نقاب کیا' اس نے اپنے دور کی سب سے بڑی عوام دشمن اور جمہور کش قوت کی مخالفت کی یا اس کا ساتھ دیا' عوام کو نسل' رنگ' فرقہ اور مذہب کی بنیادوں پر تقسیم کیا یا انھیں متحد کرنے کی کوشش کی' انھیں فن برائے فن کے طلسم میں اسیر رکھا یا اپنے فن اور اپنے شعور کو زندگی کا خدمت گزار بنایا' عوام کو عمل اور جدوجہد پر ابھارا یا انھیں سلانے کی کوشش کی' شاعر کی حیثیت سے اپنے پیام کو خوبصورت انداز میں پیش کیا یا محض تک بندی کی شاعری اور فن کی صحت مند روایات کی پابندی کرتے ہوئے انھیں ایک نئی زندگی دی اور نئی روایتوں کی تخلیق کی یا محض پرانی روایات کی پرستش کرتا رہا۔ اپنے فن کے ساتھ ایمانداری کا ثبوت دیا یا فن کو ناروا مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ان معیارات پر اقبال کے کلام اور ان کے پیام کو جانچئے

کی کوشش کی جائے تو اس کے بیشتر حصے میں ہمیں خوبصورت اور صحت مند عناصر ملیں گے۔

یہ ایک اتفاق نہیں بلکہ ہندستان کے خاص تاریخی، تہذیبی اور سماجی حالات کا نتیجہ تھا کہ ہندستان کے اس صدی کے دو بڑے شاعر اور مفکر ٹیگور اور اقبالؔ دونوں اپنی انسان دوستی اور جمہوریت پسندی کے باوجود تصوریت اور رجعیت کے فلسفہ کے علمبردار تھے۔ ان کی عظمت اس سے کم نہیں ہو جاتی لیکن ان کے فکری تضادات کے سمجھنے میں اور ان کے حدود کا ادراک کرنے میں ہمیں اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔ ان کی عظمت کا ثبوت یہ ہے کہ ان کی رجعیت پسندی نے انھیں عوام سے روگردانی کرنے کی جانب مائل نہیں کیا بلکہ وہ اپنی فلسفیانہ کوتاہ نظری کے باوجود عوام اور جمہور کا ساتھ دیتے رہے اور ان کے دشمنوں کے خلاف نہ صرف آواز اٹھائی بلکہ مستقل جہاد کا نعرہ بلند کیا۔ ان کی تصوریت نے انھیں سامراج دشمنی اور آزادی پسندی کے راستہ سے ہٹایا تو نہیں لیکن ان کے بنیادی انسان دوستی کے جذبہ کو اس کی آخری اور منطقی حد تک پہنچنے نہ دیا۔ ٹیگور اگر ویدانت کے فلسفۂ وحدت الوجود سے اکتساب فیض کرتے ہیں اور "ہمہ اوست" سے انسان دوستی اور انسانی مساوات کا سبق اخذ کرتے ہیں تو اقبالؔ اسلامی تعلیمات اور قرآن سے عمل، جہد، تسخیر کائنات، انسان کی عظمت، آزادی کی اہمیت اور انسانی مساوات کے پیام کو تلاش کرتے ہیں۔ انسان کے بنیادی مسائل اور اس کی مصیبتیں دونوں کے پیش نظر رہتی ہیں۔ ٹیگور مندر اور معابد میں خدا کی تلاش کرنے کے بجائے مزدور کی محنت میں خدا کا جلوہ دیکھتے ہیں اور سامراج کے خلاف اہل وطن کی لڑائی میں اور ایک نئی زندگی کی تعمیر کی جدوجہد میں انھیں انسان کی عظمت اور برتری کا راز نظر آتا ہے۔ سوویت یونین کے اشتراکی نظام میں انھیں نئی زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ اسی طرح اقبالؔ کو سوویت یونین میں "آفتاب تازہ" نظر آتا ہے اور وہ انقلاب روس کا خیر مقدم کرتے ہیں ؎

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا — آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

سوویت یونین سے ان کی وابستگی اور دلچسپی آخر وقت تک قائم رہی۔ چنانچہ ضرب کلیم کی ایک نظم میں ان کا یہی بنیادی خیال کارفرما نظر آتا ہے جب وہ کہتے ہیں کہ ؎

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم — بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار

اقبال پہلے اردو شاعر ہیں اور ایشیا کے ان چند شاعروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کا خیر مقدم کیا اور بندۂ مزدور کو ایک نئی دنیا کی بشارت دی جس میں سرمایہ دار حیلہ گر اس کی محنت کا استحصال نہیں کر سکتا اور جہاں "لیس للانسان الا ما سعیٰ" کا تصور پہلی بار صورت پذیر ہو سکا تھا۔ انھوں نے سوویت انقلاب اور سوویت اشتراکیت میں ان اسرار کو بتدریج کھلتے ہوئے اور ظاہر ہوتے ہوئے دیکھا جنھیں اب تک انسان کی ہوس نے چھپا رکھا تھا اور جن پر بڑے بڑے تالے پڑے ہوئے تھے۔ اقبالؔ کا بے رحم ترین نقاد بھی اقبالؔ کی شاعری کے اس دور کو نظر انداز نہیں کر سکتا جب کہ انھوں نے پہلی بار انقلاب کا لفظ صحیح اور حکیمانہ طریقہ سے استعمال کیا ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعل ناب — از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب! انقلاب! اے انقلاب!

من درونِ شیشہ ہائے عصر حاضر دیدہ ام — آں چناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب

انقلاب! انقلاب! اے انقلاب!

لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اقبال کا پیام یکساں نہیں۔ اس میں ہمیں بے شمار ناہمواریاں نظر آتی ہیں اور اس کا سبب ان کا بنیادی تصوری فلسفہ ہے۔ وہ کائنات کو ایک روحانی نظام تصور کرتے ہیں اور اسی لئے وہ ہر جگہ سبب کو نتیجہ اور نتیجہ کو سبب تصور کرنے لگا ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کی عریانی، میخواری اور افلاس کو وہ ایک خاص نظام معیشت سمجھنے کے بجائے ان مظاہر کو دور حاضر کے انسان کی بے بصری اور کوتاہی ذہن سے تعبیر کرتے ہیں۔ موجودہ تمدنی بحران کو معاشی اور سیاسی بحران کا نتیجہ قرار دینے کے بجائے وہ اسے معاشی اور سیاسی بحران کا سبب قرار دیتے ہیں اور اسی لئے انسانی ذہنوں میں انقلاب کو وہ ایک صحیح علاج تصور کرنے لگتے ہیں۔ ان کی بنیادی مدعا

ہنیت ان کے پیام کو صحیح معنوں میں پڑھنے اور نشو و نما کرنے کی اجازت نہیں دیتی اور کچھ دور جا کر ان کا خیال مقید ہو جاتا ہے۔ انھوں نے ایک مشہور اسلامی مفکر عراقی کے بارے میں لکھا تھا کہ "وہ اپنے خیال کے پورے لوازمات (implications) کا ادراک نہ کر سکے۔ کچھ تو اس لئے کہ وہ ریاضی داں نہ تھے اور کچھ تو اس لئے کہ وہ ارسطو کے اس خیال کے حامی تھے کہ کائنات ایک جامد وجود ہے"۔ کسی تبدیلی کے ساتھ اقبال کی یہ تنقید خود ان پر بھی صادق آتی ہے۔ اقبال بھی اپنے فکر کے لوازمات کا پوری طرح ادراک نہ کر سکے کچھ تو اس لئے کہ ان کو "اقتصادیات" کے پہلے مصنف ہونے کے باوجود معاشی اور سیاسی مظاہر کے بارے میں نقطۂ نظر پوری طرح سائنٹفک نہیں تھا اور کچھ تو اس لئے کہ وہ بنیادی طور پر کائنات کو ایک روحانی نظام تصور کرتے تھے۔

اقبال کے نزدیک یہ کائنات بنیادی طور پر روحانی ہے اور مادہ محض قوتِ عمل کو ابھارنے اور "روح" کو پوری طرح اجاگر کرنے کے لئے ایک ضروری رکاوٹ ہے جسے خود روح نے پیدا کیا ہے۔

این جہاں چیست؟ صنم خانۂ پندار من است جلوۂ او گرو دیدۂ بیدار من است
ہمہ آفاق کہ گیرم بنگاہے او را حلقہ ہست کہ از گردش پرکار من است
ہستی و نیستی از دیدن و نادیدن من چہ زمان و چہ مکاں شوخیٔ افکار من است

اقبال کے اس بنیادی فلسفہ پر جرمن فلسفی فشتے (Fichte) کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے جس نے کائنات کو خود (Self) اور غیر خود (Non-Self) میں تقسیم کیا تھا جس میں (Non-Self) یا مادہ "خود" کو ابھارنے میں مدد دیتا ہے۔ اقبال کے نزدیک بھی کائنات کی ماہیت ایک وجود بسیط ہے جس کے اندر شعور اور ارادہ کی قوتیں پوشیدہ ہیں اور جس کی ماہیت خیال یا تصور سے زیادہ انسان کے ارادہ اور جذبہ سے قریب تر ہے۔ کسی شئے کی ہستی یا زندگی کا پیمانہ اس کی "خودی" یا ارادہ کا استحکام ہے۔ اقبال کی تصوریت میں تصور اور خیال سے زیادہ عمل اور ارادہ کی کار فرمائی ہے اور یہی بنیادی تصور ہے جو اقبال کو دوسرے تصوری فلسفیوں اور مفکرین کی طرح زندگی سے فرار اور بیزاری کی جانب راغب نہیں کرتا بلکہ مخالف قوتوں سے ٹکرانے، متصادم ہونے اور رکاوٹوں پر غالب آنے کی تعلیم کا باعث بنتا ہے۔ اقبال صحیح معنی میں نہ تو تصوریت پسند ہیں اور نہ مادیت پسند بلکہ "عملیت پرست" (Actionist) ہیں۔ لفظ (Word) یا تصور (Idea) نہیں بلکہ عمل (Deed) ان کے نزدیک کائنات کی ماہیت ہے۔ وہ بھی گوئٹے کی طرح یہ کہتے ہیں کہ "پہلے عمل تھا"۔ اقبال نے پہلی بار اردو اور فارسی شاعری میں اس نئی اور مختلف قسم کی رومانیت کو ابھارا اور اس لئے ان کا پیام اپنی رومانیت کے باوجود زندگی اور عمل کا نقیب ہے۔ فشتے کے اسی فلسفہ نے جرمنی میں گوئٹے کو ابھارا تھا اور گوئٹے کا مشہور رزمیہ "فاوسٹ" اسی فلسفہ سے اکتساب فیض کرتا ہے۔ اقبال کے نقاد یہ بھول جاتے ہیں کہ گوئٹے اپنی تصوریت کے باوجود رجعت پسند نہیں تھا بلکہ زندگی کے بڑھتے ہوئے اور پھیلتے ہوئے رجحانات کا نمائندہ تھا۔ اقبال کی شاعری میں ہمیں ایسی عظیم الشان روایات نظر آتی ہیں جو تصوریت کی تاریخ میں اتنی شدت اور وضاحت کے ساتھ پہلی بار ابھری ہیں اور جن کی بنیادی ترقی پسندی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اقبال کے نزدیک یہ کائنات ایک جامد وجود نہیں بلکہ یہ ابھرتی ہوئی اور ترقی پذیر کائنات ہے۔ ارتقا کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے بلکہ ارتقا جاری ہے اور ابھی نئی نئی دنیائیں اور نئی نئی منزلیں ابھرنے والی ہیں۔ ہماری آگے کی منزل آخری منزل نہیں بلکہ صرف قریب تر منزل ہے ورنہ تبدیلی اور جدت کائنات کا سب سے بڑا اور پہلا قانون ہے ؎

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرفِ محرمانہ قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ
مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

کائنات کے نامکمل ہونے اور ارتقا کے تسلسل کو مکمل وضاحت کے ساتھ انھوں نے اپنے اس شعر میں پیش کیا ہے ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

ان کے نزدیک یہ جہاں اسیر انقلاب ہے اور موت و حیات کی پیکار ہمیشہ ایک نئی حیات کی تخلیق کے سامان فراہم کرتی ہے ؎

جہانِ ما کہ جز انگارۂ نیست — اسیرِ انقلابِ صبح و شام است
ز سوزِ او قضا ہموار گردد — ہنوز ایں پیکرِ گل ناتمام است

اس بدلتی ہوئی کائنات میں انسان ایک تماشائی نہیں بلکہ وہ اپنے عمل سے اپنی جد وجہد سے کائنات کی تبدیلی میں مدد دیتا ہے اور اس لئے اقبال انسان کو ابھارتے ہیں کہ ؎

بہر نفس کہ برآری جہاں دگرگوں کن — دریں رباط کہن صورت زمانہ مگذر

کائنات کا یہ ارتقاء ہموار نہیں بلکہ تضادات کی باہمی کشمکش سے رونما ہوتا ہے جسے انھوں نے "ز سوزِ او قضا ہموار گردد" کے خوبصورت مصرعہ میں پیش کیا ہے۔ تضادات کی باہمی کارفرمائی اور اس سے ارتقاء کے عمل کو اقبال نے اپنی اردو شاعری میں بھی بار ہا پیش کیا ہے۔ چنانچہ بانگِ درا کی ایک نظم "ستارہ" میں تضادات کے ذریعہ ارتقاء کے اس خیال کو اس خوبصورت طریقے سے پیش کیا ہے ؎

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر — فنا کی نیند مے زندگی کی مستی ہے
وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل — عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں!

کائنات کا یہ تغیر تغیر محض نہیں بلکہ اس تبدیلی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں کہیں تکرار نہیں زندگی کے بارے میں ساقی نامہ میں کہا ہے ؎

یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی — عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی
یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر — مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر

بے نظیری ارتقاء کی ایک خصوصیت ہے "پسند اس کو تکرار کی خو نہیں"۔ ارتقاء کی ایک خاص خوبی ہے لیکن تضادات کی یہ ٹکر اور اضداد کا یہ تصادم محض اس کا دھوکا نہیں اور نہ صرف خیال اور فکر کی کارفرمائی ہے بلکہ یہ اصل حقیقت ہے یہاں اقبال ہیگل کی تائید نہیں کرتے جس کے نزدیک یہ تضادات صرف فکری ہیں۔ اقبال کا یہ نظریہ کہ "پسند اس کو تکرار کی خو نہیں" نطشے سے بھی انھیں بنیادی طور پر الگ کر دیتا ہے جس کے نزدیک زندگی نئی صورتیں نہیں پیش کرتی بلکہ بار بار وہی پرانی صورتیں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ اقبال نے نطشے کے اس ازلی تکرار (*Eternal Recurrence*) کے نظریہ کی بار بار مخالفت کی ہے اور زندگی کے نئے پن اور ابھار کو ہمیشہ اجاگر کیا ہے ؎

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی! — اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اقبال نے ایک دوسرے گمراہ کن اور انتہائی خطرناک تصوری رجحان کی بار بار مخالفت کی ہے جس کی رو سے یہ کائنات اور یہ عالمِ محسوسات بے حقیقت ہے اور صرف ہمارے ادراک کا کھیل ہے اور ہمارے ذہن کا محض ایک کرشمہ۔ وہ کائنات کو حقیقی سمجھتے ہیں اور افلاطون کے "عالمِ اعیان یا عالمِ مثالی" کے سخت نقاد ہیں جو ان کے قیاس میں انسان کی قوتِ عمل کو مفلوج کر دیتا ہے اور اسے زندگی سے بیزار کر دیتا ہے ؎

فکرِ افلاطوں زیاں را سود گفت — حکمتِ او بود را نابود گفت
بس کہ از ذوقِ عمل محروم بود — جانِ او وارفتۂ معدوم بود

منکرِ ہنگامۂ موجود گشت　　خالقِ اعیانِ نامشہود گشت
زندہ جاں را عالمِ امکاں خوش است　　مردہ دل را عالمِ اعیاں خوش است
قوم ہا از سکرِ او مسموم گشت　　خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت

افلاطون کے فلسفۂ اعیان پر اس سے کڑی تنقید شاید ہی کسی اور نے کی ہو۔ اقبالؔ کسی فلسفہ کی خوبی اس کی صداقت اور کذب کو ایک ہی معیار سے جانچتے ہیں اور وہ یہ کہ آیا یہ فلسفہ اور فکر انسان کے ذوقِ عمل کو ابھارتا ہے یا اسے خوابیدہ کرتا ہے۔ انھوں نے "مایا" کے اسی فلسفہ کی جس نے ہندستان کے فکری نظام کو اب تک جکڑ رکھا ہے بڑی شدت سے مخالفت کی۔ یہ فلسفہ عجیب طریقے سے ہماری شاعری اور ہمارے فکری نظام پر مسلط ہو گیا تھا چنانچہ غالبؔ جیسا زندگی سے محبت رکھنے والا شاعر بھی اس کائناتی تصور سے متاثر ہے اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ "عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے" کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف اقبالؔ نے کہا ؎

تو چشم بستی و گفتی کہ ایں جہاں خواب است　　کشائے چشم کہ ایں خواب خوابِ بیداریست

آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ "ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں" والا فلسفہ ٹھیک ہے یا اقبالؔ کا اقرارِ کائنات۔

اقبالؔ صرف فلسفہ کی خاطر فلسفہ کے قائل نہیں وہ اس فلسفہ کے بالکل عملی اسباب کی بنا پر مخالفت کرتے ہیں۔ فلسفۂ اعیان انسان کو خاموشی صبر پسندی اور قناعت کی تعلیم دیتا ہے اور اسے ناانصافی اور بے رحمی کے سماجی نظام کو من و عن قبول کر لینے اور مصیبت میں ہنسنے اور خوش رہنے اور تلخیٔ حیات کو خیال کی رنگینی سے خوشگوار بنانے کی جانب راغب کرتا ہے اور تعلیم دیتا ہے کہ "بسیار ادہ کہ بنیادِ عمر برباد است"۔ اقبالؔ نے حافظ کے اس تصور کی سخت مخالفت کی اور اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن میں حافظ کے بارے میں لکھا تھا ؎

مارِ گلزادے کہ دارد زہرِ ناب　　صید را اول ہمی آرد بخواب

اقبالؔ اس خواب آور فلسفہ سے کسی قیمت پر مصالحت کرنے کے لئے آمادہ نہیں۔ ان کے نزدیک زندگی شکستِ طلسمِ ایام کا نام ہے اور آزادی عمل سے اور کائنات کی تسخیر سے حاصل ہوتی ہے۔ آزادی کا عملی تصور ہماری شاعری اور ادب میں اقبالؔ نے ہی پہلی بار پیش کیا اور "اٹھ پھر آئے در کعبہ اگر وا نہوا" کے بجائے ایسے کعبہ کو ڈھانے کی تعلیم دی۔ آزادی ان کے نزدیک اس جہانِ آب و گل سے فرار کے ذریعہ حاصل نہیں ہوتی اور نہ نروان میں آزادی کا راز مضمر ہے بلکہ عمل اور فطرت کی قوتوں کو تسخیر کرنے کے ذریعہ سے ہی آزادی کا حصول ممکن ہے۔ وہ اسپنوزا اور ہیگل کے اس خیال سے پوری طرح متفق ہیں کہ کائنات کے جبر اور قوانین کے شعور ہی سے آزادی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن یہ شعور "مراقبہ" سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ عمل اور مخالف قوتوں کے ٹکراؤ کے ذریعہ بیدار ہوتا ہے۔ شعور کا منبع اور سرچشمہ عمل ہے نہ کہ تصور اور مراقبہ۔ خواہشوں کے مٹانے اور آرزوؤں کو دفن کرنے سے انسانیت کی شخصیت آزاد نہیں ہوتی بلکہ آرزوؤں کی تخلیق ہی آزادی کی ضامن ہے۔ آرزوؤں کا قتل نہ صرف غلط ہے بلکہ اقبالؔ اس نفسیاتی حقیقت سے واقف ہیں کہ ناممکن ہے۔ جاوید نامہ میں اسی خیال کو انھوں نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ فلکِ قمر پر ان کی گوتم بدھ سے ملاقات ہوتی ہے جہاں وہ اقبالؔ کو اپنا فلسفہ بتاتے ہیں کہ ؎

ہر چہ از محکم و پایندہ شناسی گذرد　　کوہ و صحرا و بر و بحر و کراں چیزے نیست
از خود اندیش و ازیں بادیہ ترساں مگذر　　کہ تو ہستی و وجودِ دو جہاں چیزے نیست

گوتم بدھ نے نہ صرف کائنات کی نفی کی بلکہ "انا" (Self) کی بھی نفی کی تھی کیونکہ یہی "انا" آرزوؤں اور خواہش کا خالق ہے اور اس لئے انھوں نے تعلیم دی کہ آزادی اور نجاتِ انا اور نتیجۃً آرزوؤں اور خواہشوں کو ختم کرنے میں مضمر ہے

اس لئے بدھا کا مردِ آزاد جد وجہد کی دنیا کا باعمل انسان نہیں بلکہ بھکشو ہے جو اپنے نفس کو ہر طرح ہلاک کرتا ہے۔ اقبالؔ کی ملاقات ایک رقاصہ سے بھی ہوتی ہے جس نے بدھا کے ہاتھ پر توبہ کی تھی اور دنیا کو ترک کیا تھا لیکن زندگی کی آرزو اور ہنگامۂ حیات کی جستجو ختم نہ ہو سکی اور پھر وہ زندگی کے کارزار میں واپس جانا چاہتی ہے اور اسے اپنی پرانی زندگی اور اس کے رنگین لمحات بری طرح یاد آتے ہیں۔ یہاں اقبالؔ کی انسان دوستی بھی پوری طرح ابھر آتی ہے۔ رقاصہ کے کلمات سنیئے۔

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بے قرار را   یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را
از تو درونِ سینہ ام برقِ تجلی کہ من   با مہ و مہر دادہ ام تلخیٔ انتظار را
ذوقِ حضور در جہاں رسمِ صنم گری نہاد   عشق فریب می دہد جانِ امیدوار را
تا بفراغِ خاطرے نغمۂ تازۂ زنم   باز بہ مرغزار دہ طائرِ مرغزار را
تیشہ اگر بہ سنگ زد، ایں چہ مقامِ گفتگوست   عشق بدوش می کشد ایں ہمہ کوہسار را

اقبالؔ کی یہ آواز کہ زندگی کی اصل آرزو ہے اور انسان آرزوؤں کے خاتمہ کے ذریعہ سے نہیں بلکہ ان کی تخلیق اور ان کی پرورش ہی کے ذریعہ عظمت حاصل کرتا ہے، پوری اردو اور فارسی شاعری میں ایک نئی آواز ہے اور ایک نیا پیغام ہے ؎

از تمنا رقصِ دل در سینہ ہا   سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا
ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم   از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

ان کے نزدیک زندگی لامحدود امکانات کی حامل ہے۔ انسان کی سعی کی کوئی منزل نہیں، اگرچہ یہ منزل منزل راہی کیوں نہ ہو کیونکہ انسان کی اصلی کشمکش ایک خام کائنات کے خلاف ہے اور جب تک یہ کائنات پوری طرح رام نہیں ہو جاتی انسان کو سکون میسر نہیں آ سکتا لیکن یہ کائنات ایک لامحدود کائنات ہے اور اس لئے اس سفر کا انجام نہیں۔ زندگی کہساروں میں اپنا راستہ بناتی ہے اور دنیا کے منتشر شیرازہ کو ایک منظم کائنات کا روپ عطا کرتی ہے ؎

جانم در آویخت با روزگاراں   جوئے است نالاں در کہساراں

یہاں اقبالؔ نے تمام تصوری فلسفیوں سے ہٹ کر اپنا راستہ بنایا ہے اور انسان کا ایک ایسا خوبصورت تصور عطا کیا ہے جو مشکل ہی سے کسی دوسرے تصوری فلسفی کے پاس مل سکتا ہے۔ اقبالؔ کا انسان زندگی کے کارزار سے ہٹ کر کسی نامعلوم خدا کی جستجو میں سرگرداں نہیں بلکہ وہ اسی کائنات کو حسین سے حسین تر اور زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے میں مصروف ہے۔ خدا نے ایک بے ڈھنگی کائنات دی تھی جس کی تہذیب کو خدا نے ادھورا چھوڑا تھا انسان اسی کی تکمیل میں مصروف ہے۔ اس تصور کو اقبالؔ نے پیام مشرق کی ایک مشہور نظم "محاورہ مابین انسان و خدا" میں بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے جہاں خدا انسان سے کہتا ہے ؎

جہاں را ز یک آب و گل آفریدم

انسان جواب دیتا ہے ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم

آخر میں انسان کی تخلیق کی انتہا یہ ہے کہ

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم   من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اس نظم میں اقبالؔ نے تہذیب کے معنی پر بھی روشنی ڈالی ہے کیونکہ تہذیب بنیادی طور پر فطرت کی خام اشیاء کو اپنے استعمال کی چیزوں میں بدلنے کا نام ہے۔

اقبالؔ نے زوالِ آدم کے تصور کے بخلاف عروجِ آدم کا تصور پیش کیا ہے جس کے عروج سے ساری کائنات میں ہنگامہ ہے

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں

انسان کو اس نے خدا کے مقابل کھڑا دیا ہے جس کے عمل کی جس کی تخلیق کی کوئی حد نہیں۔ خوب سے خوب تر، حسین سے حسین تر، مکمل سے مکمل تر کی طرف وہ رواں ہے اور اپنے جذبۂ عمل سے اور جذبۂ تخلیق سے ہر دم ایک نئی زندگی بلکہ ایک نئی کائنات کی تخلیق میں مصروف ہے۔

ز شرر ستارہ جویم، ز ستارہ آفتابے   سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

تخلیق کا یہ جوش اقبالؔ سے ہٹ کر ہمیں صرف گوئٹے کے ہاں نظر آتا ہے۔ اقبالؔ کے نزدیک بھی زندگی عبارت ہے نئی راہوں کی تخلیق اور نئی منزلوں کی جستجو سے۔ تقلید اور پرانی راہوں سے وابستگی ایک گناہ ہے۔ نئی زندگی کی تخلیق میں اگر کوئی کارِ نادر وقوع پذیر ہو اور اگر یہ گناہ بھی ہو تو اقبالؔ کے نزدیک ثواب ہے۔

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش   براہِ دیگراں رفتن عذاب است

گر از دستِ تو کارے نادر آید   گناہے ہم اگر باشد ثواب است

ان کے پیشِ نظر موجودہ سائنس اور اس کی بے پناہ ترقی تھی اور اس میں انھوں نے سائنس کی نام نہاد بے راہ روی کی مدافعت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہمیں بڑا دکھ ہوتا ہے کہ اقبالؔ اپنی انقلاب پسندی کو آخر وقت تک نباہ نہ سکے۔ تقلید کے خلاف نعرہ بلند کرنے والا اقبالؔ اور یہ کہنے والا اقبالؔ کہ

تقلید بود گر شیوۂ خوب   پیغمبر ہم رہِ اجداد رفتے

خود بھی تقلید کا شکار ہو گیا اور رسم و رہِ اسلاف کی عظمت کے راگ گانے لگا۔ حفظِ دینِ محمدی کے نام پر انھوں نے پرانی روایت پسندی کو بھی گوارا کرنے کی کوشش کی اور "تزکیۂ خودی" کے لئے تقلیدِ اسلاف کا انوکھا نسخہ دریافت کیا۔ وہ خود اپنے فکر کے بے پناہ امکانات سے گھبرا گئے اور

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست   پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست

کہتے کہتے یکدم سنبھل گئے، سنبھل کیا گئے، اپنے سارے فلسفے کو بھول گئے اور مومن و کافر کے روایتی فرق کو ابھارنے لگے جس کا افسوسناک مظاہرہ ان کا مضمون "ختمِ نبوت و قادیانیت" ہے۔ ان کا بنیادی روحانی نقطۂ نظر بار بار ان کے لئے ایک رکاوٹ بن جاتا ہے اور ان کے صحت مند جوش کو ان کی مذہبیت روک دیتی ہے۔ اقبالؔ مذہب کو اس بحران سے نکالنا چاہتے ہیں جس میں وہ آج گھر گیا ہے لیکن وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اس بحران کا سبب "مذہبی انسان کا مذہب فراموشی" اور روایات سے بے نیازی نہیں بلکہ اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ یہ بحران صرف تصوراتی نہیں بلکہ موجودہ سائنسی اور علمی ترقی اور معاشرتی تبدیلی کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھ پاتے کہ موجودہ تہذیبی بحران انحطاط پذیر سرمایہ دارانہ نظام کا نتیجہ ہے اور انسان اس بحران سے اسی وقت نکل سکتا ہے جب وہ معاشرہ کے موجودہ رشتوں کو تبدیل کرے۔ وہ اس انقلابی تبدیلی کی بجائے قدیم ادارات سے وابستگی کا درس دیتے ہیں اور یہاں اقبالؔ خود اپنے آپ سے دست و گریباں نظر آتے ہیں کیونکہ قدیم ادارے قدیم تقاضوں کی پیداوار تھے اور انسان کی خلاقی قدیم روایات اور اداروں کی حد بندیوں کو گوارا نہیں کر سکتی۔ ان کا یہ فکری تضاد ان کے بنیادی فلسفہ کا لازمی نتیجہ ہے جس سے مفر ممکن نہیں۔ اقبالؔ نے صحیح طور پر محسوس کیا کہ انسان کی خودی ([illegible]) ...... اجتماعی نظم و ضبط کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی ورنہ یہی خودی جو خلاق ہے اس خوبصورت کائنات کو اور تہذیب کے پورے ورثہ کو درہم برہم کر سکتی ہے۔ لیکن نظم و ضبط کے اصول بھی اجتماعی ہوتے ہیں جنھیں انسان اپنی اجتماعی کشمکش میں بناتے ہیں اور زندگی کی ایک منزل کے اصول

دوسری اور اعلیٰ تر منزل پر کارگر نہیں ہو سکتے۔ لیکن اقبال نے ایک بنے بنائے نظام کے تحت انسان کی خلاقیت کو جکڑنے کی کوشش کی اور سے

راہ آبا رو کہ ایں جمعیت است   معنیٔ تقلید ضبط ملت است

کا انتہائی گمراہ کن اور رجعت پسندانہ نصب العین پیش کیا۔ انھیں خود اقرار ہے کہ ماضی کے اداروں کا غلط احترام اور ان کے معنوی احیاء کی کوشش انسان کی آزادی کو کچل دیتی ہے لیکن یہ بھی ایک افسوس ناک واقعہ ہے کہ انھوں نے اپنے کلام کے ایک حصہ میں اسی غلط احترام کے جذبہ کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی ہے زندگی کے تسلسل کو باقی رکھنے کے لئے پرانی تاریخ اور روایات سے ربط ضروری ہے زندگی کی نئی منزل پرانی منزلوں کی نفی نہیں کرتی بلکہ اس کی اچھی اور صحت مند روایتوں کو اپنے اندر سمو لیتی ہے لیکن ہر قدم پر ان کا امتحان کرتا ہے اور رد و قبول کا عمل یکساں طور پر جاری رہتا ہے۔

اقبال اس راز سے ناواقف نہیں لیکن جہاں تک اسلامی روایات کا تعلق ہے وہ تنقیدی نظر سے ان کا امتحان نہیں کرتے بلکہ حجازی روایات کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جوں کا توں قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ خود اپنا دیا ہوا سبق ۔

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا   منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

بھول جاتے ہیں اور قدیم روایتوں کی حفاظت کے لئے کمربستہ نظر آنے لگتے ہیں۔ اس اندیشہ نے کہ مذہب کا بحران اتنا شدید ہے کہ اس کا علاج ممکن نہیں، اقبال کو سہما دیا تھا اور اسی خوف اور اندیشہ کی بنا پر وہ سائنس اور حکمت پر بھی برس پڑتے ہیں حالانکہ بنیادی طور پر وہ سائنس اور حکمت کے شیدائی ہیں کیونکہ سائنس وہ ہتھیار ہے جسے انسان نے تسخیرِ فطرت کی مہم میں بنایا ہے۔ اقبال کی شاعری کے پہلے دور میں ہمیں سائنس اور حکمت سے ایک والہانہ دلچسپی نظر آتی ہے کیونکہ یہ دور امید اور تخلیق کا دور تھا لیکن جوں جوں سرمایہ داری کا بحران گہرا ہوتا گیا اور مایوسی اور افسردگی کی فضا بڑھتی گئی۔ اقبال کا جوش و خروش بھی سرد پڑتا گیا اور عقل و عشق کی پرانی کشمکش اور حیات بخش کشمکش علی الاعلان عقل دشمنی اور علم کی مخالفت کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ وہی اقبال جنھوں نے کہا تھا کہ

علم از سامانِ حفظ زندگی است   علم از اسبابِ تقویم خودی است

علم و فن از پیش خیزانِ حیات   علم و فن از خانہ زادانِ حیات

ضربِ کلیم میں انتہائی (Synical) انداز میں کہنے لگتے ہیں۔ ع

بندۂ تخمین و ظن کرمِ کتابی نہ بن

حالانکہ زبورِ عجم اور پیامِ مشرق کے دور میں اقبال کے لہجہ میں یہ سختی اور قطعیت نہ تھی۔ وہ صرف "عقل" کے امکانات کی انتہا کے قائل تھے اقبال برگساں کی طرح "عقل" کو صرف عملی زندگی کا ایک ہتھیار تصور کرتے ہیں لیکن ان کے نزدیک عقل حقیقت (Reality) کا علم حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ فلسفیانہ خیال اس میں کوئی شک نہیں کہ انتہائی خطرناک رجحانات اور امکانات کا حامل ہے اور یہ اخرناشزم کی تصورات کی بنیادوں کی جانب رہنمائی کرتا ہے لیکن اقبال پہلے پہلے عقل کی مخالفت میں اتنے پرجوش نہ تھے۔ وہ اس سے بھی واقف تھے کہ خرد اور جذبہ کی کشمکش ایک خوشگوار ترکیب (Synthesis) پر حل ہو سکتی ہے اور یہ ترکیب ([illegible]) انسانی تجربہ ہے لیکن چونکہ اقبال کی فکر کی بنیادیں جدلیاتی نہ تھیں اس لئے وہ خرد اور جذبہ کی کشمکش میں الجھ کر رہ گئے اور یہ الجھاؤ انھیں بالآخر عقل دشمنی کی منزل تک پہنچا کر رہا۔ انسانی شعور نہ تو عقل محض ہے اور نہ جذبہ محض بلکہ خرد اور جذبہ دونوں شعور کے لازمی عناصر ہیں کسی کو کسی پر برتری یا تفوق حاصل نہیں۔ انسانی ذہن ایک ایسی کلیت ہے جس میں یہ سارے اجزا گھلے ملے ہیں۔ [illegible] اسی لئے کوئی تجربہ خالصتہً وقوفی (Cognitive) ہے اور نہ خالصتہً جذباتی یا وجدانی۔ ایک سائنسداں کا انتہائی ابرد تجربہ صرف ایک وقوفی (Cognitive) عمل ہے بلکہ ایک جذباتی عمل بھی ہے کیونکہ وہ صرف کائنات کے ایک راز کو بے نقاب نہیں کرتا بلکہ

ساتھ ہی اس راز کو بے نقاب کرنے کی تمنا اس کی قوتِ عمل کو ابھارتی ہے اور اسے بے چین کر دیتی ہے۔ اس جدلیاتی عمل کو اقبال نے ایک حد تک محسوس کیا جب انھوں نے کہا ؎

ہر دو بہ منزلے رواں، ہر دو امیرِ کارواں   عقل بہ حیلہ می برد، عشق برد کشاں کشاں

لیکن یہ دوئی غلط ہے۔ عقل اور عشق الگ الگ کام نہیں کرتے بلکہ ساتھ ساتھ کام کرتے ہیں۔ یہ حریف نہیں بلکہ رفیق ہیں۔ ایک منزل پر عشق عقل میں تبدیل ہو جاتا ہے اور عقل عشق میں۔ جب عقل محض (Cold Intellect) ٹھنڈی عقل نہیں رہتی اور عشق یا جذبہ محض (Blind Impulse) اندھا رجحان نہیں رہتا۔ مقصدی عمل (Purposive action) میں ان دونوں کا تصادم نہ صرف رفع ہوتا ہے بلکہ یہ دونوں مل کر امیرِ کارواں بن جاتے ہیں۔ انتہائی جذبہ تخلیق میں بھی عقل ہمیں روابط (Relations) کی اس دنیا سے باخبر رکھتی ہے ورنہ پاسِ گریباں باقی نہ رہتا۔ خود اقبال کو اس کا احساس ہے چنانچہ ایک جگہ عقل کے اس عمل (Function) کو انھوں نے بڑی خوبی سے پیش کیا ہے ؎

با چنیں ذوقِ جنوں پاسِ گریباں داشتم   در جنوں از خود نرفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

لیکن رفتہ رفتہ اقبال اس جدلیاتی عمل سے بے پروا ہوتے گئے اور بالآخر انھوں نے عقل کی مکمل تردید کے غلط نقطۂ نظر کو اپنا لیا۔ خوش قسمتی یہ کہ اقبال کی شاعری کا یہ دور مختصر رہا ورنہ ان کی بہترین شاعری اس دور کی پیداوار ہے جب وہ تخلیق کے جذبہ سے سرشار تھے اور تسخیرِ کائنات اور شخصیت کی مکمل ترقی اور بھرپور ارتقاء کا درس دیتے ہیں۔ اس لئے اقبال کو محض اس ایک افسوس ناک پہلو کی بنا پر فاشسٹ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اقبال بنیادی طور پر ارتقاء کے اور تسخیرِ کائنات کے شاعر ہیں اور شخصیت کا بھرپور ارتقاء اور مکمل اظہار ان کی فکر اور شاعری کا ایک بنیادی تصور ہے۔ فاشزم ارتقاء کا اور تسخیرِ کائنات اور شخصیت کے اظہار کا دشمن ہے۔ جہاں انفرادی آزادی اور فردیت کے ارتقا کا جوش و ولولہ ہو وہاں فاشزم کا گمان کیسے کیا جا سکتا ہے کیونکہ فاشزم فرد کی ترقی سے زیادہ سماجی استحکام پر زور دیتا ہے۔ فرد فاشسٹ مملکت میں بقول مسولینی تمام غیر ضروری، مہمل اور بے بنیاد آزادی سے محروم کر دیا جاتا ہے اور اس کے برخلاف اسے مملکت کے احکام کی پابندی پر مجبور ہونا پڑتا ہے لیکن اقبال انسانوں کی تعمیرِ خودی کے علمبردار ہیں اور ان کے نزدیک تہذیب اصل میں احترامِ آدمیت کا نام ہے۔ ان کے نزدیک خودی کی تعمیر کی بنیادی شرط یہی ہے کہ دوسرے افراد کی انفرادیت کا مساوی طور پر احترام کیا جائے لیکن وہ اپنے سماجی نقطۂ نظر کو پوری طرح ابھار نہ سکے وہ مذہب کا اس بری طرح شکار رہے کہ سماجی فلسفہ پر زیادہ وقت نہ دے سکے۔ یوں بھی اقبال جتنے بڑے شاعر ہیں اتنے بڑے مفکر اور فلسفی نہیں۔ انھیں اپنے فکری نظام کے مختلف اجزاء کو ترتیب دینے کا موقعہ نہ ملا اور نہ انھوں نے سنجیدگی سے اس کی کوشش کی۔ اس لئے جا بجا ہمیں تضادات نظر آتے ہیں۔ انھوں نے عمل اور عملیت کا فلسفہ تو پیش کیا لیکن کسی ایسی سماجی منزل کی نشاندہی نہ کر سکے جو ہمارے عمل کی مقصود ہو۔ انھوں نے انسان کو تو ابھارا اور انھیں "از خوابِ گراں خیز" کی تعلیم دی لیکن یہ نہ بتا سکے کہ بیدار ہونے کے بعد کریں کیا؟ اس کام کے لئے ایک بڑے مفکر کی ضرورت تھی جو نہ صرف روایتی فلسفہ کا اچھا عالم ہو بلکہ جس نے عصری، سماجی اور سیاسی علوم کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہو۔ وہ اپنی ناواقفیت کی بنا پر بعض مرتبہ یہ تصفیہ نہ کر سکے کہ کون زمانہ کی واقعی آگے کی طرف رہنمائی کر رہا ہے اور کون ارتقاء کے قدم روکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ انفرادیت اور خودی کی ترقی کے جوش میں یہ بھول جاتے ہیں کہ صرف انفرادیت کی ترقی مقصود نہیں بلکہ ایک خاص سماجی مقصد کا اسے تابع ہونا چاہیے اسی لئے وہ مسولینی سے بھی متاثر ہو جاتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں ؎

فیض یہ کس کی نظر کا ہے؟ کرامت کس کی ہے؟   وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب!

غلطی کی انتہا یہ ہے کہ "ندرتِ فکر و عمل" جیسی نادر چیز سے مسولینی کو متصف کر دینے میں بھی انھیں عار نہیں لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ انھوں نے مسولینی کی تعریف اس لئے نہیں کی کہ وہ فاشسٹ تھے یا فاشزم کے دوست تھے بلکہ مسولینی اور فاشسٹ جماعت

کے نام نہاد اور گمراہ کن اطلاعات نے ان کی غلط رہبری کی۔ اگر وہ فاشسٹ دوست ہو گئے تھے تو ابی سینیا پر مسولینی کے حملہ کے موقع پر خاموش بیٹھ جاتے لیکن ان کی بنیادی سامراج دشمنی نے انھیں خاموش نہ رکھا اور انھوں نے شدت کے ساتھ مسولینی کے خلاف آواز اٹھائی کیونکہ اس کی "خودی" ابی سینیا کے مظلوم انسانوں کی "خودی" کے ارتقا میں حارج ہو رہی تھی۔ اقبال کی سامراج دشمنی اور غلامی سے ان کی مخالفت ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے لیکن ان کی سامراج دشمنی اور غلامی سے ان کی مخالفت کسی ٹھوس سیاسی فلسفہ کا مطالعہ پر مبنی نہیں تھی۔ اس لئے وہ کبھی بھی جذباتی مخالفت سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ان کا نقطہ نظر ہمیشہ رومانوی رہا گو انداز بیان ہمیشہ کلاسیکی رہا۔ وہ صحیح طور پر تہذیب کو "احترام آدمیت" کا نام دیتے ہیں لیکن یہ نہیں بتا سکتے کہ کس سیاسی اور سماجی نظام میں اس اصلی تہذیب کا حصول ممکن ہے کیونکہ تہذیب کے سارے تاریخی اداروں میں کہیں بھی ہمیں "احترام آدمیت" کا جامع تصور نہیں ملتا اور نہ جامع عمل کے آثار نظر آتے ہیں۔ انھیں احساس تو تھا کہ تہذیبی اقدار معاشی اور سیاسی نظام سے وابستہ ضرور ہیں۔ لیکن ان دونوں کی گہری اور لازمی وابستگی کا انھیں پوری طرح ادراک نہ ہو سکا اس لئے جب وہ نئے سماج کی تشکیل کے بارے میں سوچتے ہیں تو مادی اقدار کے روحانی اقدار پر زور دینے لگتے ہیں اور سماج کی جدید تشکیل کے بجائے فرد کی صحیح تربیت کو مقدم قرار دینے لگتے ہیں حالانکہ فرد کی صحیح تربیت خود ایک صحت مند سماج پر موقوف ہے۔ اس لئے انسانوں کے معاشی روابط کو بدلنے کی بجائے ؎

جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے   اسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

کی قسم کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ وہ سرمایہ داری نظام سے نالاں ہیں لیکن انھیں معاشی اور سماجی مظاہر سمجھنے کے بجائے موجودہ انسان کی کم نظری اور روحانی اقدار سے اس کی دوری کو ان خرابیوں کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ انھیں افسوس ہے کہ باوجود سائنس اور حکمت کی ترقی کے انسان اپنی زندگی کی شب تاریک کو سحر نہ کر سکا لیکن اس کا سبب وہ اس کی کم نظری کو قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں مظاہر یعنی اس کی بے بسی اور بے بصیرتی ایک ہی علت کے معلول ہیں۔ ان تمام کمزوریوں کے باوجود اقبال بنیادی طور پر جمہوریت پسند اور عوام دوست ہیں۔ جو شاعر یہ کہہ سکتا ہو

اسے جمہوریت دشمن قرار دینا انتہائی ناانصافی ہے۔ ان کی فکر کی بنیادی کمزوری انھیں ایک مکمل اشتراکی اور (Communist) جمہوریت پسند بننے سے روک دیتی ہے لیکن وہ انتہائی شدت کے ساتھ تنگ نظر قومیت پسندی، نسل پسندی اور فرقہ بندی کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ نہ مشرق کے پجاری ہیں اور نہ مغرب کے دشمن بلکہ ساری دنیا کو ایک سمجھتے ہیں ؎

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر   فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اقبال نے اپنی شاعری اور اپنی تخلیقات میں آخر وقت تک اس معیار کی پابندی کی اور اس لئے انھوں نے ہر جمہوری تحریک کی تائید کی اور ہر سامراج دشمن تحریک کی مخالفت کرتے رہے۔ غلامی کے خلاف ان کی آواز غیر مصالحانہ رہی کیونکہ غلامی انسان کی تمام صلاحیتوں کو ختم کر دیتی ہے اور فرد کے ابھار کی سب سے بڑی دشمن ہے ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب   اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

....

تا کجا در ته بالِ دگراں می باشی!   در ہوائے چمن آزادہ پریدن آموز

لیکن اپنے سماجی علوم سے چونکہ ان کی واقفیت سائنٹفک نہ تھی اس لئے وہ "جمہوریت" اور "پارلیمانی جمہوریت" میں امتیاز نہ کر سکے اور بعض مرتبہ پارلیمانی جمہوریت کی مخالفت نے جمہوریت کی مخالفت کا رنگ اختیار کر لیا۔ انھیں موجودہ سرمایہ دارانہ جمہوریت کے نقائص کا بخوبی احساس ہے اور یہ جانتے ہیں کہ یہ صرف سرمایہ داری کا ایک ڈھونگ ہے جس میں صرف انسانوں کو گنا جاتا ہے۔ اطلاع نے

پارلیمان اور پارلیمانی اداروں میں جنگ زرگری کا مظاہرہ دیکھا۔

گمرسرکار نے کیا خوب کونسل ہال بنوایا　　　کوئی اس شہر میں تکیہ نہ تھا سرمایہ داروں کا

انہیں سرمایہ داروں کے نمائندوں کو انھوں نے "دہ صد خر" کے نام سے یاد کیا ہے۔ انحطاط پذیر سرمایہ داری سماج کے موجودہ بورژوا (Bourgeoisie) کے لئے "خر" سے زیادہ موزوں لفظ شاید اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا لیکن جمہوریت کی بنیادی اخلاقیات (Ethics) یعنی "فرد کا احترام" ان کی پوری شاعری اور فکر کی اساس ہے اور اس لئے انھیں سوویت تجربہ میں امید کی ایک کرن نظر آتی ہے۔ لیکن افسوس کہ وہ اس تجربہ کا پوری طرح ساتھ نہ دے سکے اور اپنی ایک خیالی دنیا میں پناہ لی جسے وہ خالص "اسلامی دنیا" سمجھتے ہیں۔ یہ ان کی شاعری کا سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو ہے ان کی "مجازیت" ان کی بے بسی کی نظیر ہے اور یہ بے بسی ایک متوسط طبقہ کے حساس فنکار کی آخری منزل ہے اگر وہ اپنی جماعت اور طبقہ کی زنجیروں کو توڑ نہ سکے۔ اقبال کی مجازیت اصل میں موجودہ دور سے ان کی بیزاری کا نتیجہ ہے انھیں انسانوں کی اجتماعی جدوجہد کا اندازہ نہ ہوسکا جو بجائے پیچھے کی جانب مڑنے کے اپنے لئے ایک نئی منزل کی تلاش اور تخلیق کرلیتی ہے۔ فرار کا دشمن اقبال بالآخر اس دنیائے رنگ و بو سے فرار کی جانب مائل نظر آتا ہے اور یہاں ان کی فکر کا ایک ایسا خطرناک موڑ تھا جہاں سے وہ واپس نہ آسکے اور اپنی فکر کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے وہ آہستہ آہستہ تمام انسانوں سے دور ہونے لگے اور آخر میں "نسیمے از حجاز آید کہ نیاید" کی الجھن میں گرفتار ہو گئے۔ لیکن ان کی مجازیت میں بھی ایک خلوص ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک تھکی ہوئی روح نے اپنی تخلیقی دنیا میں پناہ لے لی ہے لیکن ان کا فنکارانہ خلوص برابر انھیں اس تخیلی دنیا سے باہر کھینچ لاتا تھا اور وہ پھر ایک عجیب جوش کے ساتھ عام انسانوں سے مل جاتے تھے۔ چنانچہ ان کا آخری پیغام جو موت سے کچھ ہی دن پہلے انھوں نے دیا تھا ان کے خلوص کا آئینہ دار ہے۔

آخر میں اقبال کے ایک عظیم الشان ورثہ کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے جس نے اردو شاعری کے پرانے لہجہ کو بالکل بدل دیا۔ اور ایک نیا نقطۂ نظر اور ایک نئی آواز عطا کی۔ باوجود ان تمام تبدیلیوں کے جو اقبال کی شاعری میں ہمیں نظر آتی ہیں ایک چیز ایسی ہے جو ہمیشہ ان کی شاعری کا لازمی عنصر رہی اور وہ ان کا شاعرانہ نقطۂ نظر ہے۔ انھوں نے آخری وقت تک اپنی شاعری کو زندگی کی قوتوں کے ایک زبردست ہتھیار کی طرح استعمال کیا اور اپنی شاعرانہ عظمت کے باوجود کبھی بھی شاعری کو زندگی سے الگ نہیں کیا۔ انھیں مشرق کی قدیم شاعری اور ادب سے بجا طور پر شکایت ہے کہ ؂

موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں　　　زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار

وہ اپنی تصوریت کے باوجود "شاعری اور ادب" کی خودمختاری (Autonomy) کے خطرناک نظریہ کا کبھی بھی شکار نہ ہوئے بلکہ فن کو ہمیشہ زندگی کا خادم سمجھتے رہے۔ ان کے نزدیک نغمہ سے زیادہ نغمہ کا مقصد اہم ہے اور فن سے زیادہ اہم فنکار کا نقطۂ نظر ہے۔

اگر ہنر میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام　　　حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

زبور عجم میں فن اور ادب پر غلامی اور محکومیت کے تباہ کن اثرات کا انھوں نے بڑی خوبی سے جائزہ لیا ہے اور صحت مند اور مریضانہ فن کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

غلامی کی موسیقی کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں ؂

از نے او آشکارا راز او　　　مرگ یک شہر است اندر ساز او

ناتوان و زار می سازد ترا　　　از جہاں بیزار می سازد ترا

یا پھر غلامی کی مصوری کے متعلق ؂

می چکد از خامہ ہا مضمون موت　　　ہر کجا افسانہ و افسون موت

زندگی بخش موسیقی اور مصوری کی اس سے بہتر تعریف اور کیا ہو سکتی ہے

نغمہ می باید جنوں پروردۂ — آتشے در خونِ دل حل کردۂ
نغمہ گر معنی ندارد مردہ است — سوزِ او از آتشِ افسردہ است
حور او از حورِ جنت خوشتر است — منکرِ لات و مناتش کافر است
آفریند کائناتِ دیگرے — قلب را بخشد حیاتِ دیگرے

اقبال کے اس فنکارانہ نظریہ کی بنا پر بجا طور پر انھیں ہم اپنی جدید شاعری اور ادب کا امام کہہ سکتے ہیں اور اسی لئے ہم انھیں عہدِ حاضر کا سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں کیونکہ کسی دوسرے شاعر نے اس شدت کے ساتھ اور اتنے خلوص کے ساتھ اپنے فن اور ادب کو انسانوں کی خدمت اور ان کی ترقی کے لئے وقف نہیں کیا اور اسی لئے ان کی غلط کاریوں کو ان کا خلوص اور بے پناہ انسان دوستی کا جذبہ چھپا لیتا ہے۔ کیونکہ بالآخر کسی شاعر یا فنکار کی عظمت اور بزرگی کا پیمانہ اس کا مجموعی تاثر اور مجموعی پیام ہے اور اس معیار پر اقبال کو جانچا جائے تو انھیں ہم بنیادی طور پر ان شاعروں کی صف میں پاتے ہیں جنھوں نے اپنے دور میں تہذیب و تمدن کی ترقی پذیر قوتوں کا ساتھ دیا اور زوال پذیر قوتوں کے خلاف آواز اٹھائی۔

فضل الرحمٰن

جنگ بازوں سے ایک سوال

میں کیا کہوں تم سے جنگ بازو کہ حکمرانی کا راز کیا ہے
حیات کے راگ جس سے نکلیں وہ امن و راحت کا ساز کیا ہے
دلوں کی کلیوں کو جو کھلا دے ہوا ہے وہ خوشگوار کیسی
خزاں کی زد میں نہ آسکے جو بہار ہے وہ بہار کیسی
اندھیری شب کو جو روز روشن بنائے وہ روشنی کہاں ہے
جو جان ڈالے ہزاروں بے جاں تنوں میں وہ زندگی کہاں ہے
فقیر گوشہ نشیں ہوں میں تم کو بادشاہت کا تجربہ ہے
میں ننگ عالم ہوں اور تمہیں عالمی سیادت کا تجربہ ہے
میں جانتا ہوں تمہارے دستِ کرم کا محتاج ہے زمانہ
تمہاری دولت کے آگے کچھ بھی نہیں ہے قارون کا خزانہ
تمہارا وہ لین دین ہے تم حکومتوں کو خریدتے ہو
حسینوں کا ذکر کیا ہے قوموں کی عصمتوں کو خریدتے ہو
تمہارے ادنیٰ اشاروں پر انقلاب آئے ہیں بحر و بر میں
غضب کی ہیں بجلیاں نگہ میں، ہیں زلزلے قہر کے نظر میں
مگر میں یہ پوچھتا ہوں تم سے نہیں سوال اور کوئی میرا
جواب دیتے ہوئے نہ سمجھو کہ ہے خیال اور کوئی میرا
جو اشک و خوں کے بہائیں دریا وہ کیسے خود شاد رہ سکیں گے
جہاں کو برباد کرنے والے کب آپ آباد رہ سکیں گے

علی منظور

مردہ فن و کہنہ مزار

(۱)

مرے دل کو دھڑکا کاتبوں سے نہیں
پریشان ہیں بت گروں سے نہیں
جلائے نظر خوبیاں اُن کی ہیں
میں بدظن نہیں خوبیوں سے نہیں

(۲)

مچا دی ان اشعار نے کھلبلی
یہ کہنے لگے مجھ سے سید ولی
دیا شعر کا اذن کس نے تجھے
ارے اس میں ایطا ہے — وہ بھی جلی

(۳)

کہا جب انھوں نے بگڑ کر "تجھے"
کہوں کیا میں، کتنا ہوا دکھ مجھے
نہیں شعرگوئی کا یہ دانہ پاس
جو ہے آگ سینے میں کیوں کر بجھے

(۴)

نہاں ان کے دل میں فنی نکات
زباں پر سخن گسترانہ ہے بات
نہیں ان کو رابطہ جذبات سے
وہی — فاعلن فاعلن فاعلات

(۵)

بہاریں فضا بھی ہویدا ہوئی
ہنسا گل تو بلبل بھی شیدا ہوئی
میں ابھرا ابھرتے ہی موجِ نشاط
امیدِ عیش کی دل میں پیدا ہوئی

(۷)

مری سمت رُخ بزم کا پھر گیا
میں "نرغے" میں احباب کے گھر گیا
پکار اٹھے سب ماہران عروض
ارے، عین تقطیع سے گر گیا

(۶)

جو اگلے زمانے کے ہیں یادگار
جنوں اُن کے سر پہ ہے اب تک سوار
جلی ان کے حق میں ہے جو مردہ فن
زمیں دوز اس کا ہے کہنہ مزار

●

نیاز حیدر

اقبال نے عوام سے کہا

یہ کرشمۂ خودی ہے یہ کرشمۂ جنوں ہے!
کہ غرورِ میر و سلطاں ترے آگے سرنگوں ہے
تری روح میں ہیں رقصاں مرے قلب کے شرارے

مری شاعری جواں ہے ترے ذوقِ زندگی سے
مرا لحنِ انقلابی ہے نغوِ خواجگی سے
مرا شکوہ سو خداؤں کو زمیں پر اتارے

تجھے کہہ دیا ہے شاہیں، تجھے بال و پر دیئے ہیں
ترے چاک چاک دامن میں ستارے بھر دیئے ہیں
کبھی آنسوؤں کے تاروں میں پرو دیئے ستارے

یہی آب و گل کی دنیا مرا خواب جاودانی
تہ خاک مضطرب ہے مرا جوش نغمہ خوانی
تجھے پھر جگا رہے ہیں مرے جاگتے اشارے

وہ سیاست فرنگی تری زد پہ آ رہی ہے
وہ ترے دل و نظر پہ نئے امن چھا رہی ہے
وہ بدل گیا زمانہ وہ نکھر گئے نظارے

مرے میکدے میں آ جا مرا بادہ خوار بن کر
مری جستجو رہے گی ترا انتظار بن کر
"جو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوبروئے
تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے"

(اقبال)

سلیمان اریب

چاندنی رات اور جیل

دودھ کی سی ہے چاندنی چھٹکی
یاسمن زار بن گیا ہے جہاں
ہے سرِ چرخ مطربِ مہتاب
بربطِ خامشی پہ نغمہ کناں

اک دریچے میں ہوں اداس کھڑا!
آنکھ سنگین کی ہے ٹوکے ہوئے
کس طرح چاندنی میں رقص کروں
سنگ و آہن ہیں مجھ کو روکے ہوئے

کھوئے کھوئے ہوئے دم سادھے
بام و در نور میں نہاتے ہیں
گود میں اپنی دھرتی ماتا کے!
خاک کے ذرّے مسکراتے ہیں

دوست! لیکن ہم انقلابی جواں
یوں ہی محبوس رہ نہیں سکتے
ہم نے لے لی ہے ہاتھ میں شمشیر
اور ہم ظلم سہہ نہیں سکتے

کتنا گمبھیر ہے یہ سناٹا!
سحر بستہ ہو جیسے ہر اک شئے
دل کو محسوس ایسا ہوتا ہے
جیسے سنتا رہی ہو زیست کی لے

وہ زمانہ قریب ہے جب ہم
زیست کو انگبیں بنائیں گے!
حسن و الفت کے جوگ اور بہاگ
چاند کے ساتھ ہم بھی گائیں گے

لطیف ساجد

ہزیمت

جنگ کو فطرتِ انساں کا تقاضہ سمجھیں
ساغرِ خشک کو سرچشمۂ صہبا سمجھیں
درد کو کشمکشِ زیست کا تحفہ سمجھیں

صبح ہوتی ہے تو سنتے ہیں کہ پھر پھول کھلے
رات آئی کہ خرابِ دل مہجور ملے
وقت اک جنتِ بیدار ہے شکوے نہ گلے

کس قدر سادہ و رنگیں ہے ہمارا پیغام
جانے پھر کس کے اشارے پہ بھڑکتے ہیں عوام

زعمِ سرمایہ کو تدبیر کی منزل نہ ملی
کیجیے کیا کہ کوئی صورتِ حاصل نہ ملی

کون ہے پردہ درِ رازِ نہانی اے دل
کس کے سینہ میں مچلتی ہے جوانی اے دل
کس کے ہونٹوں پہ ہے طوفاں کی کہانی اے دل

بزمِ غربت بھی سنواری ہے وطن سے پہلے
دعوتِ زلف بھی دی دار و رسن سے پہلے
گیت گائے ہیں بیاباں کے چمن سے پہلے

زندگی امن کے سانچے میں ڈھلی جاتی ہے
جنگ کی بات بہت دور چلی جاتی ہے

ہم نے کیا کیا نہ کیا شوقِ جہانگیری میں
کوئی بھی منفق دل نہ ہوا پیری میں

کیا کریں وقت عجب آکے پڑا ہے اے دل
موت کو سامنا انساں کا ہوا ہے اے دل
امن کے ہاتھ میں گیتی کا دیا ہے اے دل
روشنی مرکزِ آئینِ جہاں ٹھیری ہے
زندگی مقصدِ ہر پیر و جواں ٹھیری ہے

●

کمال احمد صدیقی

چراغاں کریں گے ہم

تعمیر ایک عالم امکاں کریں گے ہم — ہر شمع آرزو کو فروزاں کریں گے ہم
یوں بزم زندگی میں چراغاں کریں گے ہم

اپنے تصورات کی دنیا ہے آج اور — سرمستیوں کا دور ہے اک سرخوشی کا دور
اس دور کو حیات کا عنواں کریں گے ہم

ہم جاوداں بنائیں گے فصل بہار کو — سینچیں گے اپنے خون سے ہر لالہ زار کو
رنگ رخ بہار نمایاں کریں گے ہم

سوکھے نہ کوئی ہونٹ کوئی چشم تر نہ ہو — آئین گلستاں میں خزاں کا گذر نہ ہو
یوں اہتمام جشن بہاراں کریں گے ہم

سرمستیوں کی بزم میں ہوں گی حکایتیں — ہم توڑ دیں گے تشنہ لبی کی روایتیں
"چہرے فروغ مے سے گلستاں کریں گے ہم"

ہر ایک چشم شوق میں اُمید کی ضیا — بھر دیں گے ہر جبین میں خورشید کی ضیا
ہر ایک لب کو لعل بدخشاں کریں گے ہم

حمایت علی شاعر

نذرِ دکن

معاف کر دو مرے وطن کے گلاب زارو
کہ میں نے تم سے عجب گھڑی بے وفائی کی ہے
تم آج اپنی صفوں کو ترتیب دے رہے ہو
اور آج میرے غرور نے جبہ سائی کی ہے

میں اپنی دھرتی سے دور اک دوسری زمیں پر
خود اپنی عظمت کی آپ تحقیر کر رہا ہوں
بہ فیضِ افلاس چند نان جویں کی خاطر
میں اپنے مرقد کی آپ تعمیر کر رہا ہوں

ہزاروں آہوں کے آنسوؤں کے خموش نالے
مرے عزائم پہ آج آوازہ کس رہے ہیں
میں لاکھ ہنس ہنس کے دے رہا ہوں فریب خود کو
پہ میرے احساس کو سنپولے سے ڈس رہے ہیں

کچوکے دیتا ہے ہر نفس کوئی اندر اندر
کوئی مسلسل لہو میں زہراب گھولتا ہے
تڑپ کے یکلخت چیخ اٹھتی ہے روحِ مضطر
کوئی کچھ اس طرح دل کو پیہم ٹٹولتا ہے

میں اپنے ہونٹوں کی قبر پہ مسکراہٹوں کے
حسین پھولوں کی چادریں کب تلک چڑھاؤں؟
میں خود کو اور اپنے پیش و پس کو فریب دینے
بجھی سی شمعِ نظر کی لو کب تلک بڑھاؤں؟

نہیں نہیں میں فریب خود کو نہ دے سکوں گا
یہ زہر قطرہ بہ قطرہ اب میں نہ پی سکوں گا
میں اپنے جمہور کی طرف سے نگاہ پھیرے
حیات کا دامنِ دریدہ نہ سی سکوں گا

میں دور رہ کر بھی تم سے نزدیک ہوں رفیقو
تمہارے بیتاب دل کی دھڑکن کو سن رہا ہوں
تمہاری آنکھوں میں جاگتا ہے جو خواب فردا
میں اس کی تعبیر کے حسیں پھول چن رہا ہوں

میں جانتا ہوں — جو ظلمتیں آج پھن اٹھائے
تمہارے خوابوں کے لالہ زاروں کو ڈس چکی ہیں
وہی بہ عنوانِ دیگر اس سرزمیں پر بھی —
ہماری صبحوں کی نوبہاروں کو ڈس رہی ہیں

یہاں بھی انسان کا وقار اک حقیر شے ہے
جو چند سکوں کے مول کانٹوں پہ تل رہا ہے
یہاں بھی تاریخ اپنا چولا بدل رہی ہے
خداؤں کا ناخداؤں کا پول کھل رہا ہے

حسین لفظوں کی اوٹ سے جھانکتی حقیقت
ضمیر کی سر بمہر خبریں اڑا رہی ہے
حرم کے محراب کے چراغوں کی اونگھتی لو
مآلِ افسانۂ مشیّت دکھا رہی ہے

عوام کے شب گزیدہ خوابوں کے سرد افق کو
ابھرتا خورشید اپنی کرنوں سے دھو رہا ہے
عقیدتوں کے سیاہ محبس میں دھیرے دھیرے
شعور انگڑائی لے کے بیدار ہو رہا ہے

میں عہد کرتا ہوں میرے بچھڑے ہوئے رفیقو
تمہارے ہر مورچے پہ پرچم بکف رہوں گا
میں اپنے جمہور کے قدم سے قدم ملائے
تمہاری جہدِ حیات میں صف بہ صف رہوں گا

عبدالرؤف عروج

دوسری جنگ کے بعد

جواں ولولوں کی ضیا باریوں سے — حسیں رو کلا کے کھنڈر جگمگائے
جنھیں جنگ کی آگ جھلسا گئی تھی — وہ چہرے بہ طرزِ دگر جگمگائے
اٹھا ہمہمہ — امن کا آشتی کا — خیالوں کے ویران در جگمگائے

یہی رو کلا ارض پولینڈ کا دل — یہیں امن کی پہلی للکار جاگی
مہکنے لگے آنچلوں کے کنارے — ضیا بخش گیتوں کی، جھنکار جاگی
سکوں کی پرستار، مجبور دنیا — بہ آہنگ احساس و کردار جاگی

ہٹاؤ دماغوں سے کہنہ لبادے — فسردہ خیالات میں گم کہاں ہو
اڑاؤ فضاؤں میں نیلے پھریرے — پرانی روایات میں گم کہاں ہو
جواں فکر دانشورو اور رفیقو — اس امنڈی ہوئی رات میں گم کہاں ہو

یہ مغرب کے آقاؤں کا فیصلہ ہے — "زمانہ پہ اک اور احساں کریں ہم"
کہیں اپنی فطرت گوارا کرے گی — کہ آگ اور بارود میں جل مریں ہم

بہت ہم نے سمجھا تھا ان نازیوں کو — یہ ممکن نہیں اب ان سے ڈریں ہم

زمانہ کہاں سے کہاں آگیا ہے — یہ مغرب کے آقا کہاں سوچتے ہیں
نہ دیکھی تھی دنیا نے ایسی تباہی — بنے کتنے انساں دھواں سوچتے ہیں
اگر جنگ ہوگی تو پھر کیا نہ ہوگا — کچھ اس طرح اہل جہاں سوچتے ہیں

شاعر

مرے منفرد گیت، مشہور نظمیں — ہیں خاکستر آرزو کے سوا کیا
ہزاروں ترانے لہو بن چکے ہیں — دلوں کی ابھرتی ہوئی سی نوا کیا
وہی سرد آنسو، وہی گرم تارے — گذشتہ لڑائی میں مجھ کو ملا کیا

مصوّر

بہت میں نے سمجھا ہے ناقدریوں کو — بہت میں نے دیکھے ہیں ایسے زمانے
یہ سادہ تصاویر، معصوم خاکے — نظر کی حکایت، وفا کے فسانے
میں ان کے لئے دل کو خوں کر چکا ہوں — سلامت رہیں میرے آئینہ خانے

موسیقار

ہواؤں میں آگ اور بارود ایسی — فضاؤں میں انگاروں کا رقص درہم کیوں
نئی سر اٹھاتی ہوئی کونپلوں پر — خزاں بار جھونکوں کی مشق ستم کیوں
مہکتا رہا پیار جس بنسری سے — وہی دے گی اب نفرتوں کو جنم کیوں

فلسفی

غرض کوش ارباب زر کے سہارے — مری فکر مجھولی پاتی رہی ہے
مرا فلسفہ جنگ لاتا رہا ہے — نظریات کی بات چلتی رہی ہے
مگر آگ جو بھی لگائی تھی میں نے — اسی میں مری روح جلتی رہی ہے

مزدور

بصد ہوشیاری سیاست گروں نے — مجھے کارخانوں میں دفنا دیا تھا
میں مجبور تھا اسلحہ سازیوں پر — مرا رنگ غربت الم آشنا تھا
کسے تھی خبر — میری محنت کا حاصل — ابھرتی ہوئی نسل کا خاتما تھا

سائنسداں

مری جستجو ارتقاء کا قدم ہے — مرے ولولے آشتی کے دیئے ہیں
زمانے کو خوفِ فنا دوں تو کیوں دوں — مرے تجربے زندگی کے لئے ہیں
کسے تھی خبر — میری "ریسرچ گاہیں" — ابھرتی ہوئی موت کے زاد ئیے ہیں

سپاہی

زمیں پر کچھ اس طرح سے بم گرائے — کئی زلزلوں کو جگایا ہے میں نے
ہر اک شہر و دیہات مسمار کر کے — جہاں میں تہلکہ مچایا ہے میں نے
وہی قحط، بیکاری، افلاس، فاقے — بتاؤ بھی کیا اور پایا ہے میں نے

مورّخ

سمندر میں جلتے ہوئے "تارپیڈو" — فضا پر جہازوں کی اونچی اڑانیں
ہر سمت گمنام لاشوں کے انبار — چیختی ہوئیں زندگی کی چٹانیں
نہیں مجھ میں ہمت کہ پھر لکھ سکوں میں — کسی تیسری جنگ کی داستانیں

عوام

ہم ان سامراجی نظر بازیوں کو — زمانے میں یوں عام ہونے نہ دیں گے
محبت ودیعت ہے فطرت میں اپنی — محبت کو بدنام ہونے نہ دیں گے
یہ تحریک ہے، امن کی زندگی کی — کسی طرح ناکام ہونے نہ دیں گے

●

عزیز قیسی

رجز

ہم ہیں مشرق کی شفق عارضِ مغرب کا نکھار
فصلِ رفتہ کے امیں گلشنِ فردا کی بہار
ہم ہیں فریاد، رجز، چیخ، نوا، گیت، پکار
ہم ہیں سینوں کی جلن، ہم ہیں نگاہوں کے شرار
بہاؤ میں نیل ہیں سختی میں ہمالہ ہیں ہم
اس سیہ خانۂ ہستی کا اجالا ہیں ہم
ہم سے آباد، کلیسا، حرم و بت خانہ
ہم سے ہے سجدہ گہِ شوقِ درِ جانانہ
ہم سے معمور ہے تہذیب کا ہر کاشانہ
ہم ہیں تاریخ کی عظمت کا حسیں افسانہ
چھپ گئے خاک میں سو بار پہ ہم زندہ ہیں
ہم جدھر سے بھی گئے نقشِ قدم زندہ ہیں
پوچھ لو زینتِ تاریخ ضیا کس کی ہے
داستانوں میں، فسانوں میں وفا کس کی ہے
گیت میں، نقش میں، مورت میں ادا کس کی ہے
یہ جہاں کس کا ہے، یہ خاک و ہوا کس کی ہے

نور و تنویر و تب و تاب و ضیا ہے ہم سے
لالہ و گل، چمن و سرو و صبا ہے ہم سے
ہم سے ہر خواب کو رنگینیِ تعبیر ملی
عشق کو سوز ملا حسن کو تنویر ملی
سم و زہرابہ کو تریاق کی تاثیر ملی
خاک کے ذروں کو افلاک کی تقدیر ملی
ہم نے فولاد کو بھی شہپرِ پرواز دیا
سنگِ پابستہ کو فرمانِ تگ و تاز دیا
حسن کو ہم نے محبت کے خزینے بخشے
زیب و آرائش و زینت کے قرینے بخشے
لعل و الماس و زمرد کے نگینے بخشے
دل ربائی کے یہ انداز ہمیں نے بخشے
زلف کو دے کے گہر کاہکشاں کر ڈالا
شبِ تاریک کو خورشید نشاں کر ڈالا
گیت ہم سے ہے نگاروں کی دل آرائی کے
حسن کے ناز کے انداز کے رعنائی کے
لذتِ وصل کے دردِ شبِ تنہائی کے
کوچہ گردی کے خرابات کے رسوائی کے
گیت جو تیغ بھی ہیں، زخم بھی مرہم بھی ہیں
کبھی لوری کبھی نعرہ، کبھی ماتم بھی ہیں
گیت جاگی ہوئی ہمت کی صف آرائی کے
تازہ دم ہوتے ہوئے عزم کی پسپائی کے
چوٹ کھائے ہوئے سینوں کی شکیبائی کے
علم و حکمت کے حکایات کے دانائی کے
کام تاریخ کا گیتوں سے لیا ہے ہم نے
[illegible] کو پابند کیا ہے ہم نے

یہ زباں جس کو زمانے نے فغاں بخشی ہے
اس کے اعجاز نے گونگوں کو زباں بخشی ہے
اس کے فرمان نے ذرات کو جاں بخشی ہے
خاک زادوں کو کواکب کی عناں بخشی ہے
اس کو کاٹا جو کسی نے تو لہو بول اٹھا
اک زباں بند ہوئی ہر بنِ مو بول اٹھا

جان دی نبضِ جہاں تجھ میں لہو بھر بھر کے
کتنے مُردوں کو جلایا ہے ہمیں نے مر کے
سرمہ کر ڈالا چٹانوں پہ ہتھیلی دھر کے
رکھ دیا آہن و فولاد کو پانی کر کے
یہ جو صد رنگ مناظر کا تماشہ ہے جہاں
خونِ دل قوتِ بازو کا کرشمہ ہے جہاں

ہم سے تعمیرِ ارم کر لئے شدادوں نے
تاج بنوائے ہیں ہم سے ہی وفازادوں نے
سختیاں پائی ہیں اہرام کی بنیادوں نے
بستیاں کتنی بسائیں ہمیں بربادوں نے
جیتے جی عرصۂ انساں تری تقدیر بنیں
ہم وہ سیماب ہیں مرجائیں تو اکسیر بنیں

ہم وہ نعرہ ہیں، فضا کانپ رہی ہے جس سے
ہم وہ بازو ہیں، جفا کانپ رہی ہے جس سے
ہم وہ سینہ ہیں، بلا کانپ رہی ہے جس سے
ہم وہ شانہ ہیں، ہوا کانپ رہی ہے جس سے
ہم وہ ہیں نام پہ الفت کے جو مرجاتے ہیں
جاوداں رسمِ وفا دہر میں کر جاتے ہیں

ہم سبک گام کسی کے بھی رکائے نہ رکے
دھوپ جھلسا دے کبھی آئے جو سائے نہ سکے

مسدس

راہزن کتنی دفعہ لوٹنے آئے نڈر کے
رہبروں نے بھی کئی دام بچھائے نڈر کے
وقت رفتار کو کھو دے جو قدم رک جائیں
دم الٹ جائے زمانے کا جو ہم رک جائیں

جب بھی بڑھتی گئی آرام کی ناوک فگنی
زندگانی کی تڑپ اور جواں سال بنی
جاں کنی، فاقہ کشی، تشنہ لبی، بے وطنی
سو دفعہ دیکھی ہے تاریخ نے یہ سینہ زنی
سو دفعہ لاکھ دفعہ ہم پہ ستم ہوتا ہے
ہم سے افسانۂ تاریخ رقم ہوتا ہے

خون جبھی ذرّوں پہ ٹپکا ہے جواں ویروں کا
کھل گیا ان پہ بھرم مہر کی تنویروں کا
جس جگہ نغمہ ابھرنے لگا زنجیروں کا
گھٹ گیا سینے میں دم کتنے جہانگیروں کا
یہ بجا ہے کہ ہمیں خون میں نہلا ڈالا
پس گیا زیر قدم ہم سے الجھنے والا

رات نے بڑھ کے بجھا دی جو کسی شمع کی لو
ہنس پڑی رات کی ناکامی پہ خورشید کی ضو
ہم جو مٹ جائیں ابھر آئیں کئی عالم نو
ہم جو مر جائیں تو بھی اٹھے ہمارا پرتو
موت کو کچھ نہ ملا اشکِ ندامت کے سوا
ظلم کچھ پا نہ سکا تازہ بغاوت کے سوا

وحید اختر

تنہائی

بہت ہی سخت مراحل ہیں زندگانی کے
ہر ایک گام نیا جادہ، مشکلات نئی
نئے تقاضے، نئے تجربے، نئے آلام
ہر اک مقام سفر پہ ہے کائنات نئی
وہی ستارے، وہی چاند اور وہی سورج
مگر نیا ہے ہر اک دن، ہر ایک رات نئی
عجیب بات ہے مرنے کی آرزو کر کے
کبھی کبھی تو ملی ہے مجھے حیات نئی
بزورِ جہدِ مسلسل، بہ فیضِ عزم و عمل
ہر ایک مشکلِ راہِ سفر ہوئی آساں
بہ تابِ شمعِ یقین و بہ گرمیٔ رفتار
ہر ایک منزلِ دشوار کے ملے ہیں نشاں
جنھوں نے مجھ کو سہارا دیا تھا آج تلک
وہ حوصلے وہ عزائم جوان ہیں اب بھی
جو تنگ تھے مری مشکل پسند ہمت پہ
وہی حدودِ زمان و مکان ہیں اب بھی
مگر حیات میں آیا ہے کونسا یہ مقام
ہوا ہے آج مرے دل کو شکوۂ آلام
بہت ہی سخت مراحل ہیں زندگی کے

مجھے عزیز ہے دل اور دل کی ہر دھڑکن
میں اپنے دل کے تقاضوں کو کیسے ٹھکراؤں
دلِ جواں سے عبارت ہے زندگی اپنی
مگر اداس ہے یہ کیوں نہ اس کو بہلاؤں
یہ جامِ شیشہ ہے، ٹوٹا تو جڑ سکے گا نہ پھر
اسی سے نشہ ہے کس طرح اس کو ٹھکراؤں
یہ کشتِ زار مرے ہی لہو نے سینچی ہے
اسے لٹا کے میں کس دل سے آگے بڑھ جاؤں
یہی رفیقِ سفر ہے، یہی ہے راہ نما
اسے ہی چھوڑ کے میں ٹھوکریں کہاں کھاؤں
اسی کے فیض سے ہے سیلِ زندگی جاری
اسی کے دم سے ہے آسان ہر ایک دشواری
بہت ہی سخت مراحل ہیں زندگانی کے
بغیر ہمرہیٔ دل نہ چل سکوں گا میں

نہ جانے کونسی منزل پہ آج آپہونچا
قدم اٹھانا بھی چاہوں تو چل نہیں سکتا
نہ جانے کس کا مجھے آج انتظار سا ہے
بتیر جس کے مرا دل بہل نہیں سکتا
میں خود کو جتنا بھی بہلا دے دینے کی خاطر
ہجوموں انجمنوں، محفلوں میں لاتا ہوں
مجھے کسی کی کمی اور ہوتی ہے محسوس
میں خود کو جتنا سبھوں سے قریب پاتا ہوں
اسی قدر مجھے احساس بُعد ہوتا ہے
ہر ایک خوش ہے اس آباد و شاد دنیا میں
پکارتا ہے یہ دل، کہ تو اب بھی تنہا ہے

اداس رات، طویل و خموش و نوحہ کناں
تمام مرحلۂ زیست خواب گاہِ عظیم
ہوا بھی چلتی ہے تھم تھم کے سسکیاں بھرتی
مہِ تمام کا بے نور و زرد رو چہرہ
دکھا رہا ہے غمِ دل کو جیسے آئینہ
چہار سمت اڑاتا ہے چاندنی کا غبار
کہ میرے دل پہ برستی ہے تیرگی کی پھوار
بہت گراں ہے شبِ ماہتاب و تنہائی
مرے خیال کی رعنائیو سہارا دو
یہ چاند تارے مرے دردِ دل کو کیا جانیں
تصورات کی برنائیو سہارا دو
فلک کی پست نگاہی سے ہے گلہ مجھ کو
ضمیرِ ارض کی اونچائیو سہارا دو
یہ تیرگی ہے کہ گھٹتا ہے دم اجالوں کا
دیارِ شعر کی پہنائیو سہارا دو
ہوائے یاس سے احساسِ غم بھڑک نہ اٹھے
مجھے امید کی پرچھائیو سہارا دو

خوشا کہ موجِ تصور ہوئی ہے بال کشا
مقامِ میکشی و بےخودی پہ آپہونچا
خیالِ یار کا پیکِ سبک خرام آیا
دیارِ دوست سے دل کے لئے پیام آیا
ٹھہر بھی جا کہ ستاروں کو نیند آتی ہے
جگا کے چاند کو ان کی سواری آتی ہے
سکوتِ شب کو بھی اذنِ نواگری دے دو
نفس نفس کو زبانِ پیمبری دے دو
بہت حسیں ہیں شب و روز و آفتاب و قمر
کسی کے حسن کا پرتو ہے یا عروجِ نظر
خیالِ یار کی رنگینیاں معاذ اللہ
وصالِ دوست کی ساعت گناہ پاکیزہ
کچھ اتنی مست ہوئی جا رہی ہے بزمِ خیال
تمام عشق کا پرتو، تمام عکسِ جمال
یہی صنم کدۂ ذہنِ شاعرِ تنہا
یہی ہے معبدِ فکر و نظر، یہی قبلہ
یہاں نہیں کبھی دل کو ملال تنہائی
ہجومِ ناز و ادا کی ہے محفل آرائی
غرورِ حسن ہے خود عشق کا تمنائی

بہت طویل ہے یوں تو حدیثِ بزمِ خیال
مگر زباں کی نہیں شرحِ حسنِ دل کی مجال

●

بہت عزیز سہی مجھ کو بزمِ فکر و خیال
بہت طویل سہی یہ حضوریِ جاناں
عزیز تر ہیں مگر زندگی کے ہنگامے
طویل تر ہے مگر ساعتِ غمِ دوراں
زمیں پہ کھینچ ہی لاتی ہے بے پناہ کشش
خمار ٹوٹ ہی جاتا ہے ایک منزل پر
جسے کیا تھا بہ مشکل اسیرِ دامِ خیال
نکل ہی جاتا ہے وہ دسترس سے پھر باہر
فقط خیال سے تنہائیاں نہیں کٹتیں
فقط بیان سے دشواریاں نہیں گھٹتیں

●

مرے صنم کدۂ ذہن کی حسین معبود
تخیلات کے پردہ سے باہر آ جاؤ
زمین کو ہی بنانا ہے جنتِ انساں
فرازِ جنتِ تخیل سے اتر آؤ
دماغ و دل کی نظر نے تو خوب دیکھ لیا
نصیبۂ نگہِ انتظار چمکاؤ
سمجھ نہ بیٹھے فریبِ گماں شعور تمہیں
نقاب چہرے سے اپنے ذرا تو سرکاؤ
تصورات کی محفل کو زندگی دے دی
اب حادثاتِ زمانہ پہ بھی ترس کھاؤ
نہ جانے کتنے فسانوں کا آج عنواں ہو
حقیقتوں کو بھی اپنا رنگ دکھلاؤ
ہزار روپ سے چھپ چھپ کے مسکراتی ہو
کسی بھی روپ میں اب سامنے تو آ جاؤ
ڈرا رہی ہے غمِ روزگار کی ظلمت
نظر نظر میں غمِ دل کی روشنی لاؤ
سفر طویل ہے، منزل ہے دور، سخت ہے راہ
اب اور سختیِ ہجراں میں یوں نہ تڑپاؤ
بہت ہی سخت مراحل ہیں زندگانی کے
رفاقتِ دلِ تنہا اب آ کے فرماؤ

●

تمہاری آنکھوں سے پیتا رہوں شراب اگر
ہر ایک زہر کو پی کر بھی جی سکوں گا میں
تمہاری زلف کے سایہ میں ہے پناہ اگر
بھڑکتی آگ کے شعلوں سے کیا ڈروں گا میں
متاعِ زیست گراں ہے اگر زمانہ میں
تمہارا حرفِ محبت حیات پرور ہے
بہت ہی تیرہ و مایوس کن ہے رات اگر
تمہاری اک نظرِ التفات رہبر ہے
نظامِ ظلم و تشدد، نظامِ زر داری
ہر اک نظامِ غلط کار کو بدلنا ہے
کچھ اور تیز ابھی ہوگی جہدِ آزادی
ابھی تو اور بھی دشوار راہ چلنا ہے
تمہارا ساتھ اگر ہو تو سہل ہے سب کچھ
بس اب تقاضۂ دل کو نہ اور ٹھکراؤ
پکارتا ہے تمہیں ہر نفس چلی آؤ

شاذ تمکنت

شکست

آج میں پیار کے مندر میں بچشمِ گریاں
آخری پھول محبت کے چڑھا آیا ہوں
مجھ کو تکتے تھے تمنا کے سلگتے تابوت
ان کو نومیدی سے چپ چاپ سلا آیا ہوں
اپنے اشکوں سے پرو دئیے ہیں خاک و گہرے
تربتِ عشق کو جی بھر کے سجا آیا ہوں
تیرا پیمانِ شکستہ ترا آزردہ کرم
میرے اس عشقِ دو روزہ کی امیدوں کا بھرم

آج بھی نام مرا تیری ہواؤں کو ہے یاد
جانتے ہیں مجھے تیرے شفق و ابر و باد
میری تنہائی کا سیلا ہوا آنگن ہے گواہ
دھیرے دھیرے چلی آئی تھی ترے قرب کی دھوپ
ڈھل گئی تھی مرے سینے میں ترے پیار کی اوس
کتنے رنگوں نے سنوارا تھا مری آس کا روپ

یاد ہے عقدۂ جاں کو ترے ناخن کی تراش
سرِ سودا زدہ بھولا نہیں تیرے در و بام
بن گیا پاؤں کی زنجیر مرا عہدِ وفا
بھول سکتا ہے کوئی تیری نگاہوں کا پیام
آنکھ کو یاد ہے اب بھی تری پلکوں کا جھکاؤ
دل نے دیکھا ہے ترے دھانی دوپٹوں کا چناؤ
آج بھی آتی ہے مجھ تک ترے دامن کی ہوا
مجھ سے شرماتی ہے اب بھی ترے ہاتھوں کی حنا
مجھ کو پہچانتی ہے تیرے شبستاں کی فضا
میں کہ تھا رمز شناسِ سخنِ راز نما
آج بھی ہے نگراں تیری کرم آمیز نگاہ
کتنا ویراں ہے مرا سلسلۂ شام و پگاہ
کونپل احساس کی شبنم میں دھلی جاتی تھی
میری قسمت خمِ ابرو میں تلی جاتی تھی

میری نظموں کی جبینوں پہ ترے رخ کی پھبن
میرے اشعار کے سینوں میں ترے غم کی چبھن
پُرفشاں ہے مری گفتار میں بھولی ہوئی چوٹ
میرے انفاس میں دکھتے ہوئے زخموں کی لَو
میری آنکھوں کی خلائیں ہیں کہ اجڑے بازار
میری نظریں ہیں کہ ہاری ہوئی آوارہ سپاہ

راگ چھیڑتے ہیں تو آہوں کو زباں ملتی ہے
دل کے دکھتے ہی رگِ سنگ تپاں ملتی ہے
صبح جب نام ترا لے کے چلی آئے گی
میرے غم خانے کی تاریکی میں کھو جائے گی
وقت جب تیرے تصور کو بھی گہنا دے گا
میرا ہر عہدِ جواں مجھ کو اُلہنا دے گا
ترے ایواں کے دریچوں کے مصفا شیشے
یاس کی دھند میں سنولائیں گے کجلائیں گے
جل نہ پائیں گی سرِ شام چراغوں کی لویں
کتنے معمورۂ شب تاب اجڑ جائیں گے
رات جب یاد دلائے گی دعائیں مجھ کو
کس قدر روئیں گی تاروں کی ردائیں مجھ کو
سرد ہو جائے گا جب نیم شبی کا پہلو
قطرہ قطرہ مری آنکھوں سے گریں گے آنسو

تیری ساحل پہ وہ ٹوٹے ہوئے معصوم سے خواب
تھام لیں گے مرا دامن تو میں کیا دوں گا جواب
نقشِ پا میرے ، تری رہ پہ بگولے بن کر
چاک کر دیں نہ کہیں نرم ہواؤں کا جگر
سوچتا ہوں کہ تری آنکھ سے اوجھل ہو کر
مدتوں بعد ترا سامنا ہو جانے پر
ایک اک لمحے کو ہنس ہنس کے دعا دیتا ہے
دلِ مرحوم کو رو رو کے صدا ... ہے

کس کو سمجھاؤں کہ یا وصفِ نشاطِ محزوں
سج گیا منظرِ فطرت میں مرا سوزِ دروں

پیڑ سہہ جاتے ہیں جھنکارتی لو کے صدمے
خنک افشانیِ دامانِ سحر کی خاطر
صحنِ برگِ گلِ شفاف سے شبنم جو اڑے
خوئے بالیدگیِ شاخ و شجر کی خاطر
دلِ تیشہ زناں سیرابِ خطِ موجۂ خوں
ولولہ خیزیِ مسجودِ نظر کی خاطر
صدفِ بحر شناں تھی پہلوئے حباب
عفّتِ قطرۂ نیسان و گہر کی خاطر
روح اک عمر سے ہے سہنِ ستم ہائے دگر
کن فلک ساز دعاؤں کے اثر کی خاطر

شورشِ دل ہدفِ طعنۂ اغیار ہنوز
اشک ہم مرتبۂ جنبشِ سیار ہنوز

نیم شب بڑھتی چلی جاتی ہے احساس کی لَو
گھٹ گئی ہے شبک انجم طلا فام کی ضو
راہ گیروں کے تھکے قدموں کی بیزار آواز
نیند اڑا دینے کا بن جاتی ہے سنگین جواز

مُو بہ مُو چُور سلگتی ہوئی بوجھل شامیں
آہ بھرتی ہوئی پیڑوں کی برہنہ شاخیں
میری جلتی ہوئی نبضوں کی نگہباں تو نہیں
میری ویرانیٔ خاطر سے پریشاں تو نہیں
اس شبِ درد میں کس غم کی فسوں زائی ہے
یا فقط میرا ہی اعجازِ خود آرائی ہے

دھوپ سے جھکی ہوئی دوپہروں کا سیلاب
گھر کی دہلیز پہ سناٹوں کو چھلکاتا ہے
یوں فضا ہوتی ہے جیسے کوئی مایوس دعا
اپنے فردا کے تصور سے لرز جاتا ہے

چاند کے عکس کی، پانی میں طلائی پھانکیں
جیسے آتش کدۂ موج میں ٹھنڈی آنچیں
نیلمیں پانی کے بہتے ہوئے چپلے فیتے
نیند کے ہاتھوں نے تعمیر کیا ہے جیسے
گھنے جنگل کہ جہاں خواب نمو پاتے ہیں
وہ ہوائیں کہ فرشتوں کے قدم آتے ہیں
کون سمجھے گا کہ اس منظرِ فطرت کا سبھاؤ
اور دہکاتا ہے بھولی ہوئی یادوں کا الاؤ
فاختاؤں کی صدائیں جو چلی آتی ہیں
میری تنہائیاں سوچوں سے لپٹ جاتی ہیں
تتلیاں اڑتی ہیں جس طرح شفق کے ٹکڑے
بھونرے گاتے ہوئے کاجل کی قبائیں پہنے
رقص کرتی ہوئی چڑیوں کے سہانے دو ہے
ان کی گونجوں پہ گماں ہوتا ہے غم خواری کا
دیدنی ہے یہ سماں دل کی طرحداری کا

کتنے تلخاب اتارے ہیں تہِ کامِ دہن
کتنے صحراؤں کی پہنائیاں کاٹیں میں نے
مدتوں بعد کھلا ہے یہ سلگتا ہوا راز
رونقیں بولی تھیں تنہائیاں کاٹیں میں نے

●

حسن نعیم

حسن و عشق

ھی کہہ لیں مرے ناصح، مرے احباب مجھے
ق کو جرم میں تسلیم نہیں کر سکتا
ں کی باتوں پہ یقیں کیسے کرے گا کوئی
ن کی دل سے جو تعظیم نہیں کر سکتا

عشق نے بدلا ہے ہر دور میں کردار جنوں
حسن نے بدلا ہے ہر دور میں انداز کرم
کنج خلوت سے نکل آئے ہیں بیدار حبیب
بنت عم، ہیں نہ وہاں آج کنیزانِ حرم

ان دنوں عام ہے ہر بزم میں توہین جمال
کوئے جاناں کے علاوہ بھی ہے رسوا غم دل
مجھ سے کہتے ہیں بصد جوش مرے بعض رفیق
"حسن کا نام نہ لو، چھوڑ دو ذکر محفل"

حسن معمار ہے، اب اپنے صنم خانوں کا
عشق آغاز ہے، اب جہد کا انجام نہیں
ہجر اب ـــــ ختم نہیں آہ سحر گاہی پر!
وصل اب جسم کی قربت کا فقط نام نہیں

ندگی جہد ہے، اک جنگ ہے لیکن اس میں
دن کہتا ہے نہیں عشق غم نو کا امیں؟
ُسن جلاد و ستم گر ہی نہیں دوست بھی ہے
لعبۂ نو کے لئے اس نے جھکائی ہے جبیں

وحشتِ دل بھی ہے اک منزل اور اک حیات
تار دامن بھی ہے اک سلسلۂ ہوش و خرد
اس پہ افشا ہی نہیں گلشن ہستی کے رموز
"آں زگل واقف اسرارِ گلستاں نہ بود"

مایر ہاشم

پس وپیش

تم بھی شاید اسی محفل میں چلی آئی ہو
لب و رخسار سے شعلوں کی لپک آتی ہے
میرا اک ایک نفس ڈھونڈتا رہتا ہے جسے
اسی ابرو، اسی گیسو کی مہک آتی ہے

اپنی آنکھوں کی شفق سے نہ گراؤ شبنم
تم میری یاد کی کلیوں کو مسل جانے دو
غیر کے ہاں تمہیں آسودگیٔ جسم تو ہے
دل فسردہ ہی سہی روح کچل جانے دو

جانتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے شکایت ہوگی
اس لئے آنکھ ملاتے ہوئے جی ڈرتا ہے
بے وفا مجھ کو سمجھتی ہو تو سمجھو لیکن
حال دل تم کو سناتے ہوئے جی ڈرتا ہے

میری ہمراز بس اک تم ہی نہیں ہو مجبور
سیکڑوں دل آج یہی جور و جفا سہتے ہیں
کتنی خاموش نگاہوں کو یہی شکوہ ہے
کتنے دل روز یونہی خون ہوا کرتے ہیں

یہ پس و پیش تھا کس طرح تمہیں اپناؤں
جب کہ خود فکر معیشت میں ہوں حیران حیراں
سوچتا تھا کہ محبت کے یہ معنی تو نہیں
اپنے ہمراہ میں تم کو بھی کروں سرگرداں

آج ہر گھر میں دہکتی ہوئی دوشیزائیں
مانگ سیندور سے محروم لئے بیٹھی ہیں
دل میں طوفاں ہے امڈتے ہوئے ارمانوں کا
شرم سے ہونٹ مگر اپنے سیئے بیٹھی ہیں

میری روداد سے افسردہ و غمگیں نہ ہو
ہر نفس جرعۂ زہراب کا میں عادی ہوں
میرے سینے کی جلن کا نہ مداوا سوچو
اس قدر تلخیٔ ناب کا میں عادی ہوں

ان گنت اور تمہاری طرح دوشیزائیں
رسم اور ریت پہ قربان ہوا کرتی ہیں
اپنے محبوب کی تصویر لئے سینے میں
ایک انجانے کو سینے سے لگا لیتی ہیں

خانگی ملک اور میراث کے اس مقتل میں
پیار مرجاتا ہے، ارمان کا خوں ہوتا ہے
منفعت بازی و بحران کے اس چکر میں
عصمتیں بکتی ہیں، انسانوں کا خوں ہوتا ہے

امام الدین یقین

آثارِ سحر

سینۂ خشک میں سہمی ہوئی آہوں کی قسم — خوں اگلتی ہوئی بے چین کراہوں کی قسم
سرد بجھتی ہوئی بے نور نگاہوں کی قسم — رہبر قوم کے معصوم گناہوں کی قسم
قسمت اہل وطن نوحہ کناں آج بھی ہے
فصل گل صورت بیداد خزاں آج بھی ہے

آج جمہور کے سیلاب کا رکنا ہے محال — وہ تموج وہ تلاطم وہ حرارت وہ جلال
عزمِ امروز میں لہراتا ہے فردا کا جمال — دستِ محنت نے بصد عزم اٹھائی ہے کدال
جاں بہ لب، خاک بسر شوکت دارائی ہے
کج کلاہوں سے کہو وقت جبیں سائی ہے

سنسناتے ہوئے جذبات کے دھارے کا بہاؤ — وقت و تاریخ کے بپھرے ہوئے دریا کا چڑھاؤ
کون سہہ سکتا ہے اب ظلم کی پتوار کے گھاؤ — اب تو ممکن نہیں سرمائے کی کشتی کا بچاؤ
فکر و احساس کے طوفان میں گہرائی ہے
ڈوب جاؤ کہ زمانہ بھی تماشائی ہے

کھل گئے وادیٔ مشرق میں تمناؤں کے پھول — کارگر ہو گئے بیمن کی قیادت کے اصول
شب کے پروردہ ستارے ہیں حزیں اور ملول — کوئی دم میں شفقِ صبح کا ہوتا ہے نزول
صبح کے ہاتھ میں گیتی کی زمام آئی ہے
مژدہ اے تشنہ لبو منزلِ جام آئی ہے

کچھ نہیں دار و رسن ظلم کی تدبیروں میں — میرے جمہور کی [illegible] کے عناں گیروں میں
مسکراتے ہوئے بڑھتے ہیں جو شمشیروں میں — برق بکھری نہیں جاتی کبھی زنجیروں میں
رہزنی، نوحہ گری، رات کے ڈھلنے تک ہے
"صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے"

فانی مرادآبادی

غم نے کہا

دیکھ ظلمات میں پھیلے ہوئے سناٹے کو
سینۂ شب سے ہی انوارِ سحر پھوٹتے ہیں
شب کی آغوش میں تجھ کو تو مایوس نہ ہو
اسی خاکسترِ ظلمت سے شرر پھوٹتے ہیں

عیش اک وہمِ تخیل کے سوا کچھ بھی نہیں
عیش کی سمت ترا ذہن لپکتا کیوں ہے
آ مری سمت ترا مونس و غمخوار ہوں میں
اجنبی راہوں پہ بے سود بھٹکتا کیوں ہے

کتنے عنوان کہانی کے لئے ہیں محفوظ
آ مرے پاس ابھی اور ہیں موضوعِ سخن
کتنے شہ پارے ترے واسطے ہیں چشم براہ
کتنے مضمونوں سے بھرپور ہے میرا دامن

اِن بپھر جانے دے کچھ اور بپھر جانے دے
یہ غمِ زیست کے بھڑکے ہوئے شعلوں کا جنوں
اپنے نغمات کے چہرے پہ بکھر جانے دے
لذّتِ درد کی مدہوش امنگوں کا فسوں

فن کے دامن پہ جگہ پائیں گے اَن مٹ بن کر
آنسوؤں کو تو نہ اس طرح سے بہ جانے دے
اس کی جھنکار کی قسمت ہے حیاتِ ابدی
شیشۂ دل کو ذرا چوٹ تو سہہ جانے دے

میرا ذمہ ہے کہ میں بڑھ کے نکھاروں گا تجھے
دوست! تاریخ کے سینے پہ ابھاروں گا تجھے

بشر نواز

رات ڈھلتے ہی

یہ خنک رات یہ موسم یہ ضیاپوش گھٹا
کہکشاں راہگذر جیسے ہو بل کھائی ہوئی
سحرِ خاموشی کہ ناہید نے چھیڑا نغمہ
چاند جیسے کوئی دوشیزہ ہو شرمائی ہوئی

حلقۂ ابر میں یوں چاندنی گھر جاتی ہے
دخترِ رز شیشے کی دیواروں میں جیسے محبوس
تارے، جس طرح اجالے کے ابلتے چشمے
جوں دمِ فکرِ تخیل کے سنہرے فانوس

جلتے جاتے ہیں مرے ذہن میں رنگین دیئے
یادیں ماضی کے جھروکوں سے مجھے جھانکتی ہیں
میری خوشیاں مرے آلام ترا قرب و فراق
چشمِ تخیل میں سب چیزیں کھڑی کانپتی ہیں

دور سے آئے ہوئے سرد ہوا کے جھونکے
دل کی ہر چوٹ کو سہلاتے ہیں دھیرے دھیرے
سازِ احساس کا ہر تار لرز اٹھتا ہے
نبضِ افکار میں رقصاں ہیں بھڑکتے شعلے

یہ خموشی یہ سکوں وقت کا بے پایاں سکوت
جنبشِ چشم سے بھی شب کی رگیں دکھتی ہیں
اور ایسے میں بڑے دھیمے سُروں میں باتیں
میرے ماحول کے سناٹے میں بچ اٹھتی ہیں

ناچ ناچ اٹھتی ہیں خاموش فضائیں جب بھی
بجنے لگتی ہے کہیں پاس ہی کوئی چھاگل
ٹوٹتا ہے کبھی ایسے بھی خموشی کا طلسم
سرسرا جاتا ہے آہستہ سے رنگیں آنچل

بند کرتا ہوں جو آنکھیں، ترا عکسِ رخسار
روح کے خاکوں کو رنگین بنا جاتا ہے
سوچتا ہوں جو کبھی، سایۂ گیسو تیرا
بڑھ کے تخیل کی ہر راہ پہ چھا جاتا ہے

بزمِ انجم کی خموشی میں سکوتِ مہ میں
تیری آواز کی جھنکار میں سن لیتا ہوں
مزرعۂ شب سے بفیضانِ جنونِ رسوا
کلیاں معصوم تبسم کی بھی چن لیتا ہوں

تیری قربت نہ سہی یاد بھی کافی ہے مگر
یہ بھی تیری ہی طرح مجھ سے بچھڑ جائے گی
دستِ تخیل کی فنکاری و محنت کی قسم
رات ڈھلتے ہی یہ محفل بھی اجڑ جائے گی

حمید الماسؔ

محلکے

خنک خنک فضا ہے ستاروں کی آنکھ بھاری ہے
یہ سرسراتی ہواؤں کے ریشمی جھونکے
اُلٹتے جاتے ہیں اوراقِ زندگانی کو
یہ گیت ابھرتے ہوئے چاندنی کے ہونٹوں پر
یہ ماہتاب کی دُزدیدہ چمپی نظریں
مری اداس طبیعت کو لوریاں دے کر
مری حیات کو زنجیر سی پنہاتی ہیں

یہ میرا جرم کہ میں نے کسی کو چاہا تھا
مری خطا کہ چُنی تھیں شرار کی کلیاں
مرا گناہ کہ ریگِ رواں تھی قبلۂ جاں
کہوں کہ مجھے تیرا آسرا نہ ملا
دیدۂ و دل کو کوئی خدا نہ ملا

●

راشد افسر

حسین انقلابی

ہر ادا تیری رباب شوق کی مضراب ہے
تیرا جوش گفتگو اک آتشیں سیلاب ہے
روح تیری رقص کرنے کے لئے بیتاب ہے
تیری فطرت برق ہے طوفان ہے سیماب ہے

"روح آزادی کو سینے میں جکڑ سکتا ہے کون
ناچتے سورج کی کرنوں کو پکڑ سکتا ہے کون" (سرداری جعفری)

جی رہی ہے غم کے ماروں کو جلانے کے لئے
زندگی کے جام بھر بھر کر پلانے کے لئے
ایک چنگاری تڑپ کر رنگ لانے کے لئے
بے قرار اک موج خار و خس بہانے کے لئے

اٹھتی آندھی کو تشدد سے دبا سکتا ہے کون
زیست کے شعلوں کو پھونکوں سے بجھا سکتا ہے کون

خاک میں جتنا شرارے کو ملایا جائے گا
جس قدر بجلی کو بادل میں چھپایا جائے گا
فطرت آزاد کو جتنا دبایا جائے گا
اتنی ہی شدت سے زندانوں کو ڈھایا جائے گا

بچ کے تنظیم بغاوت سے گزر سکتا ہے کون
انقلاب وقت کو اب زیر کر سکتا ہے کون

ابوالفضل صدیقی

بچہ

(ایک ناولچہ)

(الف) نوخیز (ب) ریس (ج) جیت

نوخیز

بچو میاں شہسوار نہ سہی تو خودرو قسم کے دھنگیا سوار تو تھے ہی۔ اور گھوڑسواری کی تعلیم نہ تو بیچارے نے "زینت الخیل" پڑھ کر مکتب میں حاصل کی تھی اور نہ انھیں اس کے عملی سبق ان کے بڑے بھائیوں کی طرح میدان میں استاد شہامت خاں نے دیئے تھے بلکہ مکتب کے زمانہ بچپن میں قصبہ کے چماروں، کسانوں، نائی کہاروں کے بچوں کے ساتھ دھوبیوں کمہاروں کے آوارہ چھوٹے گدھوں خچروں کو پکڑ کر کھیل میں ان پر سواریاں لیتے، کبھی دم کی جانب منہ کرکے، کبھی سر کی جانب منہ کرکے بھگاتے اور ہر سواری میں پٹخنیاں کھاتے گھنٹہ دو گھنٹہ کھیل کود کر گرد جھاڑ کے اور ہاتھ پاؤں دھوکر چلے جاتے۔ غرض مکتب کی زندگی تک کبھی کبھی یاران طریقت کے ساتھ یہ پروگرام چلتے رہے مگر اسکول میں داخل ہوتے ہی اس قسم کے کھیل میں شرم آنے لگی اور ساتھی اپنے کام کے راستوں پر پڑ گئے لیکن بچو میاں کا اندر والا اسپورٹس مین جوں کا توں رہا اور سواری کے لئے تڑپ بڑھ گئی۔ بچو میاں کے باپ چودھری کے دو اپنی ذاتی بڑی گھوڑیاں تھیں اور وہ سرکاری سانڈوں کا دارندہ تھا۔ دن رات اصطبل اور مویشی خانہ گھوڑے گھوڑیوں کی ہنہناہٹوں ہی سے جھنکارتا رہتا۔ مگر بچو میاں بیچارے اتنے چھوٹے تھے کہ دونوں سواری کی گھوڑیاں ان کے لئے بہت بڑی تھیں اور وہ اپنے باپ اور بھائیوں کو گھوڑیاں کداتے دیکھ کر من مار کر رہ جاتے اور ان کی ہمت تو پڑتی کہ چھنگی سوار بن کر وہ بھی چڑھیں مگر انھیں چڑھنے کون دیتا۔ ایک روز اسکول سے واپس آ رہے تھے اور آج جیب گرم تھی، ایک روپیہ تو فیس میں سے کورا بچا تھا، آٹھ آنے کتاب کے داموں میں سے کترے تھے اور ایک روپیہ جیب خرچ کا ملا تھا۔ راستہ میں قصبہ کے کانجی ہوس پر بھیڑ تھی اور منشی نیلام کی بولی بول رہا تھا "سوا دو روپے! سوا دو روپے! سوا دو روپیہ! سوا دو ایک سوا دو، دو — نسلی کاٹھیاواڑی، اصلی دیسی گھوڑی کے سوا دو روپیہ، سوا دو ایک سوا دو، دو —— پندرہ روپے کے دھن کے سوا دو۔" اور بچو میاں بھیڑ چیر کر گھسے تو شیخوں کے پیچھے پندرہ روز کی بھوکی پیاسی دبلی تاقی قیدی کاٹھیاواڑی گھوڑی دیکھی اور اونچائی کے لحاظ سے اپنے لئے بالکل فٹ دیکھ کر "ڈھائی روپیہ" کہا۔ منشی نے زمین دار کے بچہ کی بولی پر ڈھائی روپیہ میں تین کر دی، اور وہیں سے بچو میاں اپنی خودرو ٹریننگ کے مطابق بغیر لگام کے سوار ہو کر ایال پکڑے گھر تک آئے اور مویشی خانہ میں بندھوا دیا۔

اور کاٹھیاواڑی نٹیا مویشی خانہ میں دونوں گھوڑیوں کا پس خوردہ کھاتی۔ اصطبل سے جھاڑی ہوئی سانڈوں کی جوٹھن پڑا تو صاف کرتی اور بیلوں اور گایوں کے حصہ میں دو چار منہ حصہ پاتی چودھری کے چالیس پچاس مویشیوں سے بھرے مویشی خانے میں پلنے لگی۔ اور بچو میاں ڈھائی روپیہ کے شہسوار بن گئے، پچھلے سب ساتھی یہ زندہ کھلونا دیکھ کر جمع ہو گئے، اور اب تو لگام اور چار جامہ کسا جاتا اور باری باری سے ہر کا

ہوتے تھے۔ صبح شام معصومیت کے ساتھ سواری ہوتی اور بچومیاں کو کاٹھیاواڑی سے ایسا شغف بڑھا کہ چودھری کی اپنی پان پان سو کی پائدہ شادہ سے نہ تھا۔ گودام میں گھس جاتے۔ کبھی کالونڈا اور گڑ کا ڈھیلا چراتے اور کاٹھیاواڑی کے منہ میں چپکے سے دے دیتے، نوکروں کیلئے بیسن کی روٹیاں پکتیں باورچی خانہ میں ماما کی آنکھ بچاکر دو چار روٹیاں پائجامہ کے نیفے میں گھرس کر گودام میں تیل کے مٹکے میں ڈبو دیتے شام کو اسکول سے پلٹ کر چپکے سے نکالتے اور مویشی خانہ میں لے جاکر کاٹھیاواڑی کو کھلا دیتے، تمام دن جو ٹھنس پہ کاٹھیاواڑی کا منہ چلتا، صبح شام بچومیاں کے مال مسروقہ پہ ہاتھ مارتی اور تین ہی چار مہینے میں ڈھائی روپلی کی ٹٹیا رنگ پہ آگئی۔ رونگٹے رونگٹے پہ جیسی تیل چمک اٹھا، سٹی بھر ادنچی کاٹھ کچیل گئی۔

چودھری کے وسیع مویشی خانہ کی تقسیم تھی، اور یہ تقسیم چودھری کو جب سے دہ "دارندہ" ہوا تھا خاص توجہ کے ساتھ کرانی پڑی تھی۔ بیچوں بیچ سرکاری سانڈوں کا اصطبل تھا جس میں تمہی شمال رو بہ بڑے بڑے اِل تھے۔ ان میں تین سرکاری سانڈ رکھے جاتے تھے۔ ان تینوں سانڈوں کے اصطبلوں کے سامنے وسیع صحن تھا پھر تین سانڈ گدھوں کی کوٹھریاں تھیں جن میں تین سرکاری گدھے رکھے جاتے۔ اس سرکاری اصطبل کے کپاونڈ سے پورب کو لگا چودھری کے ذاتی جانور کا مویشی خانہ تھا اور پچھم کو نسل کشی کا احاطہ اور دونوں جانب کو دو دروازے تھے۔ پورب والا دروازہ مویشی خانہ میں کھلتا تھا اور پچھم والا نسل کشی کے احاطہ میں۔ مویشی خانے میں دو بڑے اصطبل چودھری کی ذاتی گھوڑیوں کے تھے اور بقیہ چودھری سائیس، چارہ کے گودام اور نوکروں کی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں اور وسیع صحن میں جگہ جگہ تھان بنے ہوئے تھے۔

سرکاری سانڈ گورنمنٹ (Husbendry Department) کی جانب سے چودھری کی سپردگی میں تھے اور عام نسل کشی کے لئے تھے۔ ہر سانڈ کا مقررہ خرچ چودھری اپنے انتظام سے کرتا تھی کہ سانڈوں کے سائیسوں کی تنخواہ بھی، اور ماہ بہ ماہ اخراجات کا بل بنا کر گورنمنٹ سے وصول کرتا رہتا، سائیسوں پہ ایک ہیڈ البتہ براہ راست گورنمنٹ سے تنخواہ پاتا اور چودھری نے اس جگہ پر اپنے پشتینی چابک سوار استاد شہامت خاں کا نام لکھا دیا تھا۔ آٹھ روپے ماہوار فی سائیس چودھری بل میں تنخواہ دکھاتا اور استاد شہامت خاں کے بیس روپے ماہوار بھی خود رکھ لیتا، دو روپے ماہوار فی سائیس ادا کرتا اور آٹھ روپے ماہوار استاد کو دیتا اور سائیس اور استاد چودھری کے یہاں دونوں وقت ڈلیا پہ روٹی کھاتے۔ ویسے تو ہر "دارندہ" کو شدید سرکاری احکام ہوتے ہیں کہ نسل کشی بالکل ؁ کیجائے مگر یہ رواج بھی عام ہوتا ہے کہ ہر گھوڑی کے مالک کو جس پر بڑا سانڈ گھوڑا چھوڑا جاتا ہے دو روپے اور چھوٹی کے جس پر گدھا چھوڑا جاتا ہے آٹھ آنے دینے پڑتے ہیں اور اس طرح پانچ چھ گھوڑے گدھے سانڈوں کے سائیسوں اور ہیڈ کو معقول یومیہ یافت رہتی ہے، اور چارہ دانہ راتب کا خرچ دارندہ اپنے کھیتوں سے پورا کرتا ہے جس کے ساتھ سال بھر میں اسے نسیدہ کی اتنی کھاد بچ رہتی ہے کہ کھیتوں کی پیداوار دوگنی ہو جاتی ہے اور سارا دہ بل کی رقم کوری دارندہ کے جیب میں چلی آتی ہے اور چودھری خوش حال قسم کا سیر دار زمیندار تھا وہ اس سرکاری خزانہ سے آئی ہوئی رقم کا بڑا حصہ سرکاری حکام کی تواضع میں خرچ کرتا رہتا اور سال کے سال ایک آدھ گھوڑی خرید کر الٹ پلٹ کرتا رہتا اور نفع پاتا رہتا اور ہر طرح سے اپنی چودہراہٹ کو اس اصطبل کے ذریعہ مضبوط کرتا رہتا۔

تین سرکاری سانڈ لارڈ سیکسن (Lord Saxon)، سرکمپل (Sir Campla) اور عرب نائٹ النعاف (Arab Knight Snaaf) تھے۔ لارڈ سیکسن تھارو انگلش برِیڈ (انگریزی النسل) تھا اور خاص انگلستان سے امپورٹ کیا گیا تھا۔ دیوانکا دیو کر اونچا، بڑا لمبا اور چوڑا، سفید رنگ جسے سبزا کہتے ہیں، جیا کٹی ہوئی بنڈی دم، چڑھے ہوئے تکاڑا سے پٹھے اور جسم کے لحاظ سے ذرا متناسب ہاتھ پاؤں، موزوں متکبرانہ انداز، نہایت شائستہ، سرکاری کاغذات میں بیس ہزار قیمت لکھی ہوئی تھی؛ سرکمپل آسٹریلین ولیر تھا اور وہیں سے امپورٹ کیا گیا تھا، گھوڑا کا ہے کو کسی دیوزاد ملک کے گھوڑوں کا بادشاہ معلوم ہوتا تھا۔ سرنگ رنگ (زردی مائل سرخ) قدلیے موٹا مدھنگا لمبائی چوڑائی اونچائی میں پہاڑ کا پہاڑ تگاڑا سے پٹھے اور اتنے تن و توش پر بھی موٹے بھدے ہاتھ پاؤں، تیور پریشان گوش قسم کے اور پیٹھ اتنی چوڑی کہ لمبے سے لمبے سوار کی ٹانگیں اوپری پھیل کر رہ جائیں، بقول شخصے چارپائی بچھا لو، سرکاری قیمت پچیس ہزار روپے

...دی تھی تیسرا سانڈ عرب نائٹ انصاف (Arab Knight Insaf) مشکی (سیاہ) عرب تھا۔ میانہ قامت، پھریرا جسم،
...انک ہاتھ پاؤں، گول گول خوبصورت بھرے ہوئے پٹھے، پتلی کمر لمبی متناسب گردن، گھٹنوں پر پھیلتے ہوئے ایال اور زمین پر لوٹتی ہوئی
...آنکھوں میں ہرنی کا سا بھولاپن اور تیوروں میں بجلی کی سی چمک، آواز میں سریلی جھنکار، سرکاری قیمت بیس ہزار درج تھی اور عراق سے
...ٹ کیا گیا تھا اور باقی تین گدھے تھے، فلسطینی، مصری اور آسٹریلین جن کی مجموعی قیمت پچیس ہزار درج تھی اور یہ ایک لاکھ کی سرکاری
...چودھری کی نگرانی اور پرورش میں ۱۰م نسل کشی کے لئے تھی۔ تینوں گھوڑے اپنے اپنے وسیع مربع اصطبل کے کمروں میں سرنے موٹے
...کے اڈنوں کے پیچھے کھڑے رہتے اور مقررہ چارہ دانہ کھا کر بڑے بڑے لاہوری نمک کے ڈھیلوں کو چاٹتے رہتے جو اصطبل میں لگے
...ئے تھے اور جب کوئی گھوڑی والا اپنی گھوڑی کو گابھن کرانے لاتا تو استاد گھوڑی کو دیکھ کر سانڈ تجویز کرتے۔ سائیس سانڈ کو موہرا لگا
...کر نکالتا اور احاطہ میں گھوڑی پر چھوڑ دیتا، اور چھوٹی گھوڑیوں اور خچریوں پر سرکاری احکامات کے مطابق گدھا چھوڑا جاتا۔ گورنمنٹ
...ت احکامات تھے کہ چھوٹی دیسی گھوڑیوں پر گھوڑا نہ چھوڑا جائے اور ان کے قد کے مطابق تینوں گدھوں میں سے کوئی بھی نر گدھا چھوڑا جاتا۔

(۲)

ساون کی ایک اندھیری رات میں سانڈوں کے اصطبل کا وہ پھاٹک کھلا رہ گیا جو چودھری کے مویشی خانے کی جانب تھا۔ ادھر
...یاں کی کاٹھیاواڑی کی رسی ٹوٹ گئی، گھوڑی اگر حاملہ نہ ہو تو ہر وقت "آنگ" (بہار) پر رہتی ہے اور بچہ دینے کے بعد چھٹے روز پھر
...پر آجاتی ہے اور گابھن ہو جاتی ہے، اور کاٹھیاواڑی تو مدتوں سے آنگ پر تھی، گھوڑوں کی بو لیتی مویشی خانے سے سیدھی اصطبل
...پاونڈ میں پہنچ گئی۔ گھستے ہی پہلا پل لارڈ ڈسکسن کا تھا۔ دروازے پر پہنچتے ہی آوازوں کے تبادلے کے بعد لارڈ نے بڑی بے چینی کا مظاہرہ کیا
...ورسے ٹاپیں ماریں۔ بار بار ہنہنا کر اڑگڑے تک لپکا۔ باہر سے کاٹھیاواڑی نے بھی ہرا ہرا کے مستانہ اداؤں کے ساتھ بلایا۔ آہستہ آہستہ
...اریں، اٹھلا اٹھلا کر سریلی آواز نکالی، ہاتھ بھرکے فاصلے سے بوسے لے کر لارڈ بیتاب ہو کر اندر زمین کاٹے پھونکتا تھا اور باہر
...یاواڑی بل کھا کھا جاتی تھی مگر اڑگڑا بہت مضبوط تھا اور لارڈ کے باہر نکلنے کی یا کاٹھیاواڑی کی اندر پہنچنے کی کوئی شکل نہ تھی اور لارڈ
...اڑگڑے کے اندر تھا مگر کاٹھیاواڑی تو آزاد تھی۔ دوسری طرف برابر والے اصطبل کے دروازہ پر پہنچی یہ سر کیمپل کی آرام گاہ تھی، دس
...من کی لاش بیچارے سر کیمپل بجز بھاری بھاری ٹاپوں کے جھرمٹ سے زمین کوٹنے کے اور کیا کر سکتے تھے، اڑگڑے پر بھاری سر
...ٹکر رہ گئے اور بھدی آواز میں اندر سے اظہارِ محبت ہی کرتے رہے اور اتنے میں برابر سے انصاف نے سن گن پا کر اور ناک لگا کر
سریلی جھنکار میں صدائے لبیک بلند کی اور کاٹھیاواڑی چند گز بڑھ کر اور سر کیمپل کو جوار بھاٹے میں چھوڑ کر .... انصاف
...دروازے پر صدا لگائی، موزوں جثہ اور کہربا صفت انصاف نے بڑی میٹھی محبت بھری ہنہناہٹ کے ساتھ کاٹھیاواڑی کا استقبال کیا
...پتلا نازک چپٹا منہ اڑگڑے سے باہر نکال دیا اور کاٹھیاواڑی کے نرم گرم تر نازک ہونٹوں پر اپنے دہکتے ہوئے نم ہونٹ چپکا دیئے اور
...، چیں چیں، پچاپچ گرما گرم بوسوں کا دو طرفہ بازار گرم ہو گیا اور یہاں تک کہ اپنے ہلکے جسم سے بیتاب ہو کر انصاف نے ایک پھرکی سی لی
...ٹ کر ایک بلند جست لگائی جس میں سر دروازہ کی ڈاٹ سے ٹکرایا اور سینہ اڑگڑے کے اوپر والے دو بانسوں سے جا ٹکرا اور
...ے ایک گھوڑے کی طاقت کے ٹکراؤ کے ردعمل میں اڑگڑے کے دونوں بانس ٹوٹے اور انصاف باہر آ گیا۔ جب تک سوتے ہوئے
...س اٹھ کر پہنچیں پہنچیں عرب کا کاٹھیاواڑی اتصال مکمل ہو گیا۔ سائیسوں نے بڑی چابک دستی سے بمشکل کاٹھیاواڑی کو ہنکا کر باہر کیا اور
...ت پھرتی سے پھاٹک بند کر دیا اور بے لگام انصاف کو پچکار کر اصطبل میں بند کرنے کی کوشش کی، اور سارا اصطبل ہنہناہٹوں سے
...اٹھا، اپنی اپنی کوٹھریوں میں سے گدھے تک ہنس پڑے، مویشی خانے میں پہنچ کر کاٹھیاواڑی نے پھر دعوت وصل دی۔ ساتھ ہی پارہ
...پارہ نے تاثیر کی اور مجنون عرب کو پھر اُبال آیا اور قابو پانا ناممکن ہو گیا، اب کی جست میں کمپاؤنڈ کی دس فٹ اونچی دیوار پھاند کر
انگاملے کی دیہاتی گلی میں جا گرا اور عرب کا کاٹھیاواڑی اتصال کی پھر تکرار ہوئی۔ اصطبل سے جمع ہو کر سائیس دوڑے، مویشی خانے میں

بدھو چودھری سے گھوڑا لے اور لپوانے بھاگے پڑے۔ اگر انصاف تو آج کسی کو پہچان ہی نہ رہا تھا اور بغیر لگام اور منہ بھرکے بچے ہوئے بے تو نہیرے ساچتے ساز کے قریب جانے کی کسی کی ہمت نہ تھی اور پچکاریاں بھی اس کے کان میں نہیں پڑ رہی تھیں۔ وہ تو آج اپنی سائیس کی آواز بھی نہ پہچانتا تھا۔ ہشیار رہے سب نے مل کر کاٹھیا واڑی کو اب کی مرتبہ ہنکا کر ایک کوٹھڑی میں بند کیا اور کاٹھیا واڑی تھنوں سے ادھ بھلی ہوئی اور ادھر انصاف کا جوش بھی کچھ ٹھنڈا ہوا۔ کوٹھڑی کے کواڑوں پر سر پیٹ رہا تھا کہ سائیس نے بڑی چالاکی سے منہ زورا چھلا لیا اور پھر لگام چڑھا دی اور جب قابو میں کر کے دیکھا تو سب کے ہوش اڑ گئے۔ انصاف کے دونوں نتھنوں سے خون کی دھاریں جاری تھیں، سر والی چوٹ رنگ لا رہی تھی اور سینے کی تو خیر نہ کھلی تھی کالے رنگ میں، دوڑ کر استاد شہامت خاں کے کواڑ پر پہنچے اور استاد گھبرائے ہوئے آئے، بیس ہزار کی گھوڑی کا ہانٹ۔ اور اس وقت انصاف گرم دودھ جیسا گیا تھا، خون ابل ابل کر مسام میں ٹھاٹھیں مارتا تھا، فوراً طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اگر سرکاری ڈاکٹر مویشی کو رجوع کرتے ہیں تو بات حکام تک پہنچتی ہے۔ یہاں سے وہاں تک جواب طلبیاں ہوتی ہیں پھر سر کی اندرونی چوٹ نہ معلوم کس کل اونٹ بیٹھے اور ادر کیا نتیجہ ہو۔ دور کی سوچنے والے استاد نے جلدی سے اپنی پرانی عطاری بیطاری دواؤں کی خورجی منگائی اور بہت سا ٹھنڈا پانی۔ بار بار دوائیں سنگھاتے رہے اور سر پر پانی بہاتے رہے، کہیں صبح ہوتے ہوتے خون بند ہوا اور چودھری بالا خانے پر سو رہا تھا نیند میں یہ تو نہ سمجھا کہ اصل حادثہ کیا گذرا ہے البتہ اتنا اندازہ تھا کہ بہت شور و شغب رہا ہے، فجر کی نماز پڑھ کر سیدھا مویشی خانے میں آیا، استاد نے رات کی سب روئداد بیان کی۔ اب انصاف ٹھیک تھا، سائیسوں کو ڈانٹا ڈپٹا اور پھر ذرا اشتیاق کے ساتھ کہا "ذرا بھوں، اور ہاں استاد ذرا انھیں تو دکھانا وہ آپ کے بچو میاں کی کاٹھیا واڑی جن سماۃ نے یہ قیامت برپا کر دی رات میں" اور ایک نوکر بند کوٹھڑی میں سے نکال کر کاٹھیا واڑی کو لایا اور چودھری دور ہی سے دیکھ کر بول پڑا "اجی استاد! اوں یہ تو ستارہ پیشانی!"

اور استاد نے چونک کر گھوڑی کے منہ پر نظر کی اور جب گھوڑی قریب آ کر کھڑی ہو گئی تو اس کے چہرے پر سے انصاف کا بھلکا یا ہوا جا خون انگلی سے کھرچتے ہوئے بولے "ہاں سرکار ستارہ پیشانی بھی اور اس کے ساتھ "بیڑا پھوڑ" بھی" اور پیشانی اور ناک کا بانسا اچھی طرح کھرچ کر صاف کرتے ہوئے بولے" اور سیال "ہینڈھا سنگین" بھی اور "عقرب" بھی" اور استاد ابھی پیشانی کی بھونریاں ہی دیکھ رہے تھے جب تک آنکھوں کے نیچے دو ترچھی ترچھی بھونریوں پر غور کرتے ہوئے چودھری بول پڑا "اور استاد "آنسو ڈھال" بھی دھری ہوئی ہیں" اور استاد نے چونک کر غور کیا تو بولے "ہاں" اور پھر چودھری نے گردن کی بھونریوں پر نظر کی اور بولا "استاد غضب سے غضب "ٹیک باگی" بھی ہے اور "ناگن" "سانپن" دونوں ابھار رہے ہیں" اور اب استاد خفیف سے ہونے لگے کیونکہ اصطبل ان کی نگرانی میں تھا۔ بات ٹالنے کی غرض سے بولے "اور سرکار بغیر منہ زورے لگام کا ساز چھوٹ گیا، پھر میونی سی گھوڑی، بھرپور دیا، اور یہ دیکھئے دانتوں سے تمام سر جھنجوڑ لیا اور یہ جو خون تمام سر اور چہرہ پر بہا ہے یہ سب انصاف ہی کا نہیں ہے اس میں اس کے سر سے بھی نکل کر مل گیا ہے، بلکہ سرکار یہیں سے مل کر بہا ہوگا۔" مگر چودھری گہری سوچ میں تھا بولا "اور استاد ذرا اس کا منہ تو کھولنا" یہ سالی "سیاہ تالو" بھی ہوگی۔" اور استاد نے منہ کھولا اور تالو پر نظر کی اور جھجکے ہی جھجکے بولے "جی سرکار خیال صحیح ہے۔ "سیاہ تالو" بھی ہے کمبخت" اور پھر چودھری نے اوپر سے نیچے تک نظر سے ہتالا اور اندازہ کر کے کہا "اور استاد ناپنا تو ذرا مجھے تو تیرہ تین معلوم ہوتی ہے۔"

استاد نے ناپ سے لے کر "مندھو" دلپشت کا اگلا حصہ تک بالشتوں اور انگلیوں سے ناپ کر حساب کیا تو ناپ میں تیرہ تین ہوئی، اور ناپنے ہی میں چودھری نے کہا "ذرا استاد پیٹ دیکھنا" یہ بھونری کیسی آئی ہے" استاد ذرا ٹھٹھارتے ہوئے بولے "ہاں سرکار میں نے بھی دیکھ لی "تنگ توڑ" بھی دھری ہوئی ہے اور "گندہ بغل" بھی ہے۔ اور کھسیا کر پچھلے پاؤں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نفرت کے ساتھ بولے "اور سرکار کیا بتاؤں میں نے کبھی ایسی دیکھی نہیں، ہوں "کھونٹا اکھاڑ" بھی ہے، جبھی تو نکاس ہوس میں آ کر نیلام ہوئی۔ جہاں جائے گی کھونٹا توڑ بھاگے گی" کہنے کو تو استاد کہہ گئے مگر اور بھونریوں کے اثبات پر مزید بحث آ جانے کے ڈر سے دل میں نادم سے ہو گئے۔ ستارہ پیشانی، ہینڈھا سنگین، ناگ سانپن، تو کھلی ہوئی خصم مار تھیں اور سیاہ تالو، آنسو ڈھال، ٹیک باگی ساری عمر مالک کو پریشان کر کے رلاتی رہیں۔ تنگ توڑ، گندہ بغل، مالک کو

گھر آکر بیٹھ گئے ...... اور چودھری اور استاد دونوں ہی ایک ایک بھونری کے مجرب خواص کے محرم تھے۔ دونوں دل ہی دل میں تجزیہ کر رہے تھے اور چودھری کا تلخ اور شکایتی تیوروں سے بولا "واہ استاد واہ! ــ یہی نئے عیب خرید لئے! ہوں' اور پھر مجھے تو آپ پہ حیرت ہے' ایسی آنکھیں موند لیں! اور میں تو آپ کے اصطبل مویشی خانے میں ذرا کم آتا جاتا ہوں' اور دیکھئے آج میں نے ایک نظر ڈالتے ہی بھانپ لیا' آپ نے میرے یہاں گھسنے کیسے دی؟! اور پھر چھ مہینے سے میرے تھان پہ باندھے پڑے ہیں۔ اگر لڑکا لے بھی آیا تھا تو ڈھائی روپے کی اوقات' میں تو گھسنے بھی نہ دیتا" اور پھر ذرا جواب طلب سے انداز میں استاد کی طرف دیکھا" استاد مجوب سے ہو گئے اور بولے "سرکار واقعی میری غفلت لڑکے کا کھیل سمجھ کر میں نے نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں" اور چودھری کا سینہ ایسی منحوس گھڑی کے ساتھ لڑکے کا نام سن کر دھک سے ہو گیا اور جب تک ایک مرغ بے ہنگام سائیس بول پڑا" اور میاں یہ کیسی ہوئی رات کو زمہ میں کھاج! بھرا بھر ساون گھوڑی کا بھی ہوئی اب وٹ ساون جائے بیائے گی" اور چودھری کے سینے پر دوسرا گھونسہ پڑا۔ جب تک ایک دوسرا بدتمیز سائیس بانگ بلند کر بیٹھا" ساون گھوڑی' بھادوں گائے' اگر بھینس بیائے آپ جائے نہیں تو مالک کو کھائے!" اور اب کی جیسے کنپٹی کے کتے پہ چودھری الٹ کر جا پڑا' اور کا ٹھیا واڑی کا مالک تو اس کا پیارا بیٹا بچو میاں تھا ـــ "ساون بیانت" گھوڑی کا مالک ...... اور ہاں بھونری کی نحوستوں میں کا ٹھیا واڑی کڑوا کریلا تھا تو ساون بیانت میں کا بھی ہو کر نیم چڑھا ہو گئی تھی' چھ مہینے سے نحوست کی پوٹ پل رہی تھی اور رات تو پاپ کی گھڑی بن گئی! ــ اور چودھری کے دماغ میں ضرب المثل کا اخیر حصہ گونجا" مالک کو کھائے" اور وہ اندر ہی اندر تھرا کر رہ گیا۔ استاد بیچارے اپنی غیر ذمہ داری اور غفلت پر گنہگار سے بنے سر جھکائے دم بخود تھے اگر چودھری کو ضرب المثل کی شرط والے حصے میں امید کی کرن نظر آئی "آپ جائے" مگر یکایک یہ بھی اس کے قابو میں نہ تھا بچو میاں اس کا لاڈلا چھوٹا بیٹا کاٹھیا واڑی کو چھ مہینے سے محبوب کی طرح رکھے ہوئے تھا' اور وہ جانتے تھے کہ ابھی کاٹھیا واڑی کو نکالنے میں کچھ وقت لگے گا۔ لہٰذا اپنا انتشار دبا کر ذرا ہمت کر کے نوکروں کو دکھانے کے لئے کہا" کچھ نہیں سب فضول توہمات! ہم نہیں مانتے ایک بھی! ـــ ہم تو یہ پوچھتے ہیں کہ بال بھونری کی منحوس گھوڑے گھوڑیاں کہیں گلیوں گھوروں ماری ماری پھرتی ہیں' وہ تو کسی نہ کسی اصطبل تھان پہ بندھتی ہی ہیں اور ساون بیانت گھوڑی کسی گھر میں ہی بیاتی ہے' جنگل میں تو بچہ دیتی نہیں' اور بھادوں ماگھ بیانت گائے بھینس بھی کسی نہ کسی کھونٹے پر ہی دودھ دیتی ہیں' کتیوں کی طرح گھر گھر ماری تو نہیں پھرتیں یہ سب برہمنوں نے ٹھگنے کی باتیں گڑھ لی ہیں"

اور ایک سائیس نے کہا" اور سرکار ہاتھ پاؤں اور رنگ ڈھنگ کی کیسی اچھی ہے بٹیریا" ـــ اور اس کی منہ سے بات لے کر دوسرا بول پڑا" اور میاں بڑی کڑوی اور تیکھی' ایسا دوگاما کاٹتی چلتی ہے کہ لوگ تماشا دیکھتے ہیں' بھرا کٹورا رکھ دو پیٹھ پہ مجال کیا جو بوند چھلک جائے" اور سب سائیس گھوڑی کی تعریف کرتے رہے' مگر استاد چپ رہے۔ وہ خوب سمجھ رہے تھے کہ چودھری لاڈلے بیٹے کی آزردگی کے سبب برائے گفتنی بات ہلکی کر رہا ہے ورنہ دل کا حال وہ خوب جانتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ ہرگز کبھی اسے تھان پر نہ رکھے گا ـــ اور اب کاٹھیا واڑی پہ سب کی نظریں ایسی پڑنے لگیں جیسے ناگن! چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اور یہاں تک کہ مویشی خانے سے حویلی تک جا پہنچیں۔ چودھری سے چودھری کی ماں نے استفسار کیا' اور چودھری تو اس خصوص میں خود ہی ان سے رجوع کر کے مدد طلب کرنے کی سوچ رہا تھا۔ لاڈلے پوتے پر دادی نے زور ڈالا کہ کاٹھیا واڑی نکال دے مگر بچو میاں تو مچل گئے۔ اور چودھری بیچارہ تو کیا چیز تھا اس کی ماں کے بھی قابو میں نہ آئے جن کے لاڈ کے زور پہ بچو میاں کی نگاہ میں بھائیوں بہنوں ماں اور باپ تک کی کوئی حقیقت نہ تھی ـــ اور اتفاقات کی ستم ظریفی! اسکول سے پلٹتے ہوئے بچو میاں بارش میں بھیگ گئے اور بڑا تیز بخار آیا اور ہفتے بھر بے ہوش رہے اور بخار کی شدت میں ہذیانی کیفیت ہوئی اور ہذیان میں بار بار "میری کاٹھیا واڑی' میری کاٹھیا واڑی!" بکے۔ دادی کا وسوسہ جٹا۔ بچو میاں کے ہوش میں آنے سے پیشتر ہی یکدم کاٹھیا واڑی قصبہ کے ٹھیکوان کرا دی اور سات بکرے قربانی کرائے اور ہفتہ عشرہ بعد جب بچو میاں چنگے ہو کر مویشی خانے میں پہنچے' روئے پیٹے سر میں خاک ڈالی' حویلی کے صحن میں ڈھاڑیں مار مار کر لوٹیں لگائیں مگر کیا کرتے اگر کسی ہاتھ کا ٹھیا واڑی باپ نے بیچ ڈالی ہوتی تو قیمت واپس کر کے پھر بھی لاتے وہ تو ٹھیکا کر دان کر دی تھی۔ باپ نے وعدہ کیا اور دلادی

خاص ہوئیں کتاب کی کاتکی اشنان کے میلے سے اس سے اچھا کاٹھیاواڑی ٹٹو خریدیں گے۔ بیچارے صبر کر کے بیٹھ رہے اور استاد نے سب منحوس مبارک بھونریں پر بچو میاں کو لکھوا دیا۔ ایک ایک کا خواص بالتفصیل سمجھایا اور اب کی مرتبہ کاتکی اشنان کے میلے سے ایسا گھوڑا خرید کر لانے کا وعدہ کیا جس کے ماتھے پر تلک ہو، گلے میں "کنٹھ من" ہو، سینہ پر "دیومن" ہو، ہونٹوں پر "ان مہو" ہو، پیٹ پر گنگاپاٹ ہو اور پاؤں میں پدم ہو اور پھر ان سب سعد بھونریوں کے مبارک اثرات بتائے کہ ماتھے پر تلک ہو تو مالک ہمیشہ سربلند رہے، کنٹھ من اور دیومن ہوں تو مالک کا گھر بھرا رہے ہونٹوں پر ان مہو ہو تو جتنی مرتبہ مالک چڑھے بارہ برس عمر بڑھے، پیٹ پر گنگاپاٹ ہو تو اگر مالک ہار بھی جائے تو ہار میں جیت کرائے اور پاؤں میں پدم ہو تو خود کبھی نہ ہارے، وغیرہ وغیرہ۔ مگر وہ بچوں کی فرقت کا اندمال نہ کر سکا اور وہ آرزو کرتے کہ کاش یہ سب مبارک بھونریاں ان کے کاٹھیاواڑی میں ہوتیں تو وہ کیوں گھر سے نکالی جاتی اور وہ کاٹھیاواڑی کو بھلا نہ سکے۔ اور استاد کی بتائی ہوئی مبارک بھونریاں اپنے خطاطِ تخیل میں کاٹھیاواڑی پر چسپاں کر کے اپنی تمناؤں کے باطل جال بنتے رہے۔

اور بچو میاں اپنی تقدیر سے تو بچ گئے مگر کاٹھیاواڑی کی تقدیر بگڑ گئی۔ کنھیا صبح تڑکے چڑھ کر بھیک مانگنے گاؤں گاؤں نکل جاتا اور دس بارہ گاؤں "بنجارا" مٹھی مٹھی "ست نجے"[1] کی پوٹیں "چٹکی پھینک"[2] آٹے کے تھیلے "پرشاد" کے پڑے "دان" کے چیتھڑے، "آتار" "ستے" کی مٹھائی لادے اوپر سے خود چڑھا شام کو گھر پلٹتا۔ اور سب مال لے کر گھر میں گھس جاتا اور باہر کاٹھیاواڑی کو موٹا موٹا "دھگنا" چرا کر گھوڑ دن گلیو پیٹ بھرنے کے لئے چھوڑ دیتا۔ تمام دن کاٹھیاواڑی کنھیا کے ساتھ مارا مارا در در پھرتی۔ بھیک مانگنے کی گڑگڑاتی ہوئی صدا اور دینے والوں کی جھڑکیاں کان ڈالے سنتی اور کنھیا کے تھیلوں اور پوٹوں میں چٹکی چٹکی مٹھی مٹھی پڑتے دیکھتی۔ اس دروازے سے اس دروازے اور اس سے اس پر گردش میں کہیں پر گھڑی بھر تانا بھی موقع نہ ملتا کہ موہنہ دو موہنہ چلتے ہوئے کسی جگہ گلی کلیارے، ہری سوکھی گھاس پر مارے پندرہ ہی دنوں میں چودھری کے یہاں کی سب کھائی پی نکل گئی اور مہینہ بھر میں تمام رنگ روپ اتر کر بھادوں ختم ہوتے ہوتے جیوں کی تیوں الگنی پر ڈالنے کی ہو گئی۔

اور دن زیادہ گذرے، فاقہ اور محنت، پیٹھ پر موٹے کنھیا باس اور چٹکی پھینک کے تھیلوں اور ست نجے کی پوٹوں کا بوجھ، پیٹ میں نجیب الطرفین عرب کی گراں قدر امانت کا حمل، کاٹھیاواڑی کو سر سے پاؤں تک زندگی بارِ بار ہو کر رہ گئی۔ خیر جاڑے تو سٹم پسٹم گھسیٹے، چیت بیساکھ ربیع کی نئی پیداوار کے ساتھ کنھیا کی توند اور کولھے بھی بھاری پڑے۔ تھیلے اور پوٹیں بھی وزنی ہوئیں، ادھر عرب کی امانت بھی بوجھل ہوئی اور کنھیا کی پھیری کا حلقہ بھی وسیع ہوا اور کاٹھیاواڑی کے پاؤں بھاری اٹھنے لگے اور جب نخ نخ کے زبانی جمع خرچ سے کام نہ چلتا دکھائی دیا تو کنھیا نے دوسرا کوڑا موٹی طرح باندھ کر بٹ لیا اور جیٹھ اساڑھ بھر کاٹھیاواڑی کے گھٹنے سے ٹوٹنے لگے اور اساڑھ گھسیٹ کر ساون آ ہی لگا، عرب کی امانت پیٹ سے پاؤں نکالتے دیکھی تو کنھیا نے وہ ایک دن پیدل پھیری کی اور گھوڑی تھان پر باندھ دی اور جب ایک صبح سو کر اٹھا تو تھان پر کاٹھیاواڑی کے ساتھ عرب کی امانت اچھلتی کودتی دیکھی اور کنھیا کے کھونٹے پر گھوڑی نے بھرا بھر ساون بیانت بچہ دیا جس کی پیدائش کی خوشی نہ مرجانے کا غم البتہ اتنا اطمینان ضرور کنھیا کو ہو گیا کہ چلو ٹٹیا ہلکی ہوئی دو تین روز سے پیدل گھسٹتا تھا۔ چکی بھر سونٹھ زیرہ ڈال کر دو ایک روز گڑ تیل کی کلونی پلائی اور ہفتہ بھر کے اندر چیٹا کر کے کاٹھیاواڑی کنھیا کی باربرداری کے لئے پھر تیار ہو گئی اور بدستور کام پر لگ گئی۔

اور اب دو سے تین ہو گئے۔ پیچھے پیچھے بچہ، آگے آگے کاٹھیاواڑی، اوپر کنھیا، گاؤں گاؤں گھر گھر پھیرا پانی میالت پت "ست نجے" کی پوٹیں اور "چٹکی پھینک" کے تھیلے بدستور، کنھیا کی تانبی توند اور لنگاڑا سے کولھے جہاں کے تہاں، اور ستم بالائے ستم، اوپر سے یہ دبادا اور نیچے سے کھنچا

---

[2] "چٹکی پھینک" یو۔پی دیہات کے اندر ہر چولھے کے قریب ایک مٹی کی ہانڈی رکھی ہوتی ہے۔ روٹی پکانے کے لئے آٹا گوندھنے سے پیشتر ایک چٹکی اس میں ڈال کر بقیہ آٹا گوندھا جاتا ہے اور ہفتہ کے ہفتہ یہ "چٹکی پھینک" آٹا کنھیا کو دان کر دیا جاتا ہے۔ [1] "ست نجا" چکی میں اناج ڈالنے سے پیشتر ایک کول دو مٹھی بھر اخیرات کا ایک مقررہ ڈلیا یا مٹی کی مٹکی میں علیحدہ رکھے جاتے ہیں اور چونکہ یہ مختلف النوع اناج ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسے ست نجا کہتے ہیں۔ روہیلکھنڈ میں دونوں دیہاتی اصطلاحیں خیرات کی ہیں۔

ہو ورولنہ وہ جہاں کا ٹھیا واڑی ٹھہرنے بچہ سو کے تھنوں پہ چسکے لگائے، جس سے کنھیا کا کرڑا اور شخ شخ ہی نجات ولا ــــــ ئے، اور اب ٹھیا واڑی کو دیتے دو چند کھلنے لگے اور بھوک کے حصے پیار کرنے لگے مگر کنھیا کے کوڑے کے سہارے بڑھتی رہا۔ بچو کا ایک ایک تھیلا اور ٹ کنھیا کی جیبی کا ایک ایک بوٹلا، حتیٰ کہ ناج کا ایک ایک دانہ اور آنے کی سہو چکی، کنھیا کا روکھا روکھا کا ٹھیا واڑی پہ الگ الگ بارسا معلوم ہونے لگا اور ایک ایک پاؤں ایک ایک من کا ہو گیا۔ سر سے پاؤں تک مکھیاں اور ڈانس، لیکھوں اور جوؤں کی کھینڈیں تو جو ستی ہی تھیں اور رب کی سردھری امانت ابھر آکر اور خون چوسنے لگی۔

اور کنھیا برہمن کو تو دنیا بھر کے زیادہ سے زیادہ نقصان اور زیادہ سے زیادہ نفع رساں تھے، برسات کا ہیضہ پنڈت جی کا سب سے بڑا روزی رساں تھا اور چیت کا طاعون ان کا سب سے بھاری سمت۔ سارے جہاں کی نحوستیں ان کے گھر میں دنیا بھر کی برکتیں نازل کیا کرتی تھیں ور نیستی ہی کے نتیجوں سے روزی پیدا کر کے کھانا باٹتے تھے۔ اور بھگوان کی کرپا سے ان کے پرتی جمانی کے حلقہ میں ان بیداواروں کی کمی نہ تھی۔ اور ان کے حق میں موت کے لق و دق میدان اور نحوستوں کی کھیتیاں بدستور شاداب و زرخیز تھیں۔ کاٹھیا واڑی مرے یا بچے انھیں کیا غم!؟ کہیں سے موت کا زریں پنجہ دستگیری کرے گا اور تیرھویں میں ان کی سواری کے لئے بیلوں کی جوٹ اور ریلو (بیل تانگا) بھیج دے گا۔ اور نحوست ب کی کا ٹھیا واڑی نہ سہی دکنی گرہوائی کہیں سے نکال کر ان کے گھر چھوڑ جائے گی! اور پھر پنڈت جی کا ٹھیا واڑی کو لادتے بھی تھے تو کیا ڈر تھا، اور تین کی جگہ تیرہ گونوں بھاتے تو کیا بات تھی، چودھری کے اوپر پڑنے والی ساری نحوستوں کے ٹھیکہ پیا سے اپنے سر لیا بھی تو تھا اور اس بھاؤ چودھری کو بہت ستا چھڑایا بھی تو تھا اور ان دا موں ہاتھ آ جانے میں وہ اسے اپنے تھان پر باندھے۔ جب تک چلے چلائے جاؤ، دال چھلکیا کھائے جاؤ، یہ حامی تھے اور جب تک کاٹھیا واڑی چل رہی تھی وہ چلا رہے تھے اور "ست بجے" کی دال اور "چٹکی چینک" کی چھلکیاں کھا رہے تھے اور اب تک تو گھوروں اور اور گلیوں میں آگے آگے کاٹھیا واڑی پیچھے پیچھے بچہ گھاس کوڑے سے پیٹ بھر بھر کر چلائے جا رہے تھے۔

(۳)

اور ایک روز چودھری، استاد شہامت خاں اور بچو میاں شام کی چہل قدمی سے واپس آ رہے تھے۔ بستی کے قریب گھورے کے ڈھیروں پر چرتی ہوئی ایک گھوڑی ان کے جانب موہنہ اٹھا کر بڑے زور سے ہنہنائی اور دھنگنے سے بندھے ہوئے اگلے پاؤں سے کودتی دو جست ان کی جانب کو بڑھی اور چودھری اور استاد نے تو نہ پہچانا مگر کاٹھیا واڑی تو چھ مہینے کے گھی گڑ کے ملیدے اور چکنی چپڑی روٹیاں نہ بھولی تھی اور نہ بچو میاں ہی کا آسن ایس کے دوگامے اور پو قدمے کے مزے بھولا تھا، پہچان کر بے ساختہ موہنہ سے نکلا "اوہو! میری کاٹھیا واڑی! چہ چہ چہ! کتنی دوبلی، ابا جان میری کاٹھیا واڑی!!" اور چودھری "میری کاٹھیا واڑی" سنتے ہی اچھل سا پڑا ـــ اور گھوڑی کی جانب دیکھ کر ان کے موہنہ سے بے ساختہ نکلا "نہیں بیٹا! کنھیا کی کاٹھیا واڑی" ـــ اور پھر کاٹھیا واڑی کو ڈری ڈری، چڑی چڑی نگاہوں سے دیکھا اور بیٹے کے "میری کاٹھیا واڑی" کہنے پہ اس کے دل میں وسوسہ گذرا اور کاٹھیا واڑی کی جانب سے نفرت کے ساتھ موہنہ پھیر لیا۔ اور ذرا تیز سی نگاہ سے بیٹے کی جانب دیکھا، مگر بچو میاں محو تھے اور پھر بے اختیار ہو کر بول پڑے "ابا جان!! ابا جان اور میری کاٹھیا واڑی یا گھوڑی ـــ ہوں اس کا بچہ! کیسا اچھا!" ـــ اور چودھری خوف و خشونت کے ملے جلے انداز میں گھبرا پڑا "چپ ہو، کنھیا کی!" اور پھر ڈری ڈری نگاہوں ــــ سے "ساون بیانت" منحوس بچھیڑے کو دیکھا جس کو گاؤں کے لوگ بول چال میں بھی بچھیرے کا درجہ نہیں دیتے اور ساری عمر بچہ ہی پکارنے کا رواج ہے اور وہ راستہ راستہ بڑھتے کاٹھیا واڑی کے محاذ پر پہنچ گئے۔ چودھری کے قدم سست جیسے ملک الموت کی جانب بڑھ رہے ہے اور بچو میاں تیز تیز لپکتے سے گویا کھڑے ہوئے کھلونے کی جانب ہاتھ بڑھا رہے ہیں۔ "ٹھہر لڑکے!" باپ نے خائف آواز میں ٹھہر کا اور بچو میاں بھی کاٹھیا واڑی کے محاذ میں ٹھہر گئے۔ اور اگلے پاؤں دھنگی ہوئی کاٹھیا واڑی نے ڈیڑھ سال پرانے عیش کی یادوں میں مری مری ہنہناہٹ کا الیہ اور تحفہ پیش کیا اور قریب آنے کی ایک لنگڑی سی جست لگانے کی کوشش کی اور چودھری کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اس کے بیٹے پر آدم خور شیرنی جھپٹی، اور باپ کی محبت اندھا دھن لپکی اور چودھری ڈھال ما بن کر درمیان میں آ گیا اور بیٹے کو کھینچ کر پیچھے کر لیا۔ ادھر بچہ استاد کی

جانب رجوع ہوا۔ ادھر سے بچہ بڑھا، ادھر باپ کی آڑ سے بچہ میاں نکلے اور استاد کے قریب پہنچ کر چکنے چکنے سفید چینی کے کھلونے کو چھوا۔ اور گھبرائے ہوئے سے باپ نے لپک کر پھر خود سر پٹے کو ایک جانب گھسیٹ لیا اور چودھری کے کان استاد شجاعت کی بات پر لگ گئے۔ اور آنکھیں بچے پر اور استاد بولے "ایں میاں! ارے اس کے چھاتی پر گلے میں تو دیوسی اور کنٹھ سی رکھی ہوئی ہیں ساتھ ساتھ! اور دیوسن چھو انگلی بڑھ کر سیپوں سے مل گئی ہے اور پھر ہونٹوں پر "ان مہو" رکھی ہوئی ہیں واہ واہ! ۔ میاں کیا بچہ ہے! ۔ اور آہا!! اللہ میاں نے ہاتھ سے گڑھ بنایا ہے، دائیں پاؤں میں پدم اور بائیں میں "چنتامن" ۔ اور سواد کر کھ اور ماتھے پر "فضلی"! ۔ پیٹ پر گنگا پاٹ! ۔ واہ! کیا کہنے! کیا کہنے!! ۔ سچ ہے کہ سعادت ہی سعادت۔ سبحان اللہ" استاد جھوم سے گئے۔ کیا۔ بارک بچہ ڈالا ہے ڈاین کا ٹھیا واڑ! اس نے کٹھیائے کھونٹے پہ! ۔ جس تھان پہ باندھ دو گھور دے، ایک مرتبہ اس کی "ان مہو" چوما بارہ برس عمر بڑھے، اس کی "فضلی" جس ران اور ہاتھ پہ، پھر سوار کا سر نہ دکھے۔ اور اس کا یہ پدم اور چنتامن! کہنے نہ کبھی اسے ہارنے دیں اور اگر مالک ہارے تو ہار ہی جیت کرائیں، سبحان اللہ! کیا مبارک، کیسا شاندار بچہ!"

اور استاد کے اشاروں پر دور سے ایک ایک بھونری پہچان کر چودھری کے تیوروں کی نفرت بیگانگی اور ایک گونہ حیرت میں تبدیل ہو گئی۔

اور وہ ایک قدم آگے بڑھا اور بولا "اور استاد وہ تو سب ہیں اور یہ تو دیکھو یہ ہاتھ پاؤں کا کس قدر صاف اور رنگ ڈھنگ کا کتنا بے عیب ہے اور تیور کس قدر بانکے ہیں جس وقت جوانی پہ پھٹ کر جوانی میں بھریگا تو تصویر بن جائے گا۔ مگر استاد ڈھنگ تو سب انصاف کے سے لایا ہے لیکن رنگ سے یہ لارڈ سیکسن کا بچہ معلوم ہوتا ہے، ایں استاد یہ سبز رنگ کہاں سے لایا، آپ کہتے ہیں عرب نائٹ کا بچہ ہے اور رنگ لہتا ہے لارڈ سیکسن کا۔ باپ مشکی، ماں تیلیا کمیت اور بچہ بڑے سبزا! کیا تک ہے؟! ایں!؟

"میاں انصاف کا! سولہ آنے انصاف کا! اور اس میں تو کوئی شک شبہ کی گنجائش نہیں ہے، عالم وجود میں آنے سے عین پیشتر باپ کا سر پھوڑا، ماں کا کھونٹا جھنجوڑا، اوہ سرکار! اور وہ اندھیری رات مجھے کبھی نہ بھولے گی، تین ہفتہ کا بچا ہوا دیوانہ سانڈ! اڑ گرا تو ڑتا ڑ سر پھوڑ کر باہر آ پڑا مشکی گھوڑا اور ساون کی اماوس کی رات! سائیں سائیں کالا سایہ سا لہراتا ادھر سے ادھر نکل جائے ہے لگام منہ پہ رہے، سائیسوں کی ہمت نہ پڑے پاس جانے کی! بھوکے شیر کی طرح بپھرا ہوا، جوش میں آکر گھوڑی کا سر تک چبا گیا اور دوسری مرتبہ گھوڑی کی آواز پہ لنگور کی سی جست لگا کر مویشی خانہ کے میدان میں آ گرا، سرکار قیامت ہی برپا کر دی تھی اس بچہ کے قیام حمل کے وقت دونوں ماں باپ نے! اصطبل سے مویشی خانہ تک خون کی بارش ہو ئی تھی میں تو گھبرا گیا تھا کہ بچہ کا سارا خون نتھنوں کے پرنالے کی راہ بہہ جائے گا۔ اور یہ بیس ہزار کی سرکاری امانت ہڈی بن کر حلق میں اٹک جائے گی۔ مگر اللہ نے بڑا فضل کیا، ایک چٹکلا کام کر گیا اور خون بند......"

اور چودھری نے بات کاٹتے ہوئے کہا "وہ تو سب معلوم مگر استاد یہ سبز رنگ کہاں سے لایا سالا ایں؟"

"کہیں سے لایا ہو مگر انصاف کا بچہ ہونے میں کلام نہیں ہو سکتا، تیور دیکھ لیجئے، ہاتھ پاؤں ٹھاٹھ سب عرب والے، اور پھر سرکار آنکھ دیکھی بات ہے، کاہے کو ہی کوئی گھوڑی آج تک اس ہنگامے کے ساتھ گابھن ہوئی ہو گی روئے زمین پر! اس کے توانصاف کا نطفہ ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا جناب؟"

"ہوں شبہ کوئی نہیں، میں نے تو رنگ کی مناسبت سے یوں ہی مذاق میں لارڈ سیکسن کا نام لے دیا، ورنہ کیا میں نہیں جانتا، ہاتھ پاؤں کا بچہ، تیور سب ڈھنگ میں انصاف کی تصویر جھلک رہی ہے، اور بال بھونری میں ماں کی ضد ہے، مگر یہ بگلا سا سفید رنگ کہاں سے لایا نہ معلوم ۔ پل گیا اور زندہ رہا تو نکلے گا بڑا بانکا جانور!"

اور استاد نے کہا "بس سرکار اسی میں بندے کو کلام ہے کہ پل گیا اور زندہ رہا۔ حالت نہ دیکھ لیجئے" گھوڑی کی جانب اشارہ کیا "یہ بھادوں کنوار ماں بچہ جی جائیں تو جی جائیں جب تک یہ جہاں تہاں گھوڑوں تھلیوں میں پڑی گلی مگر اس کا برساتی رنگ چمکتا ہے اور جب تک آنکھیں کی ٹھنڈ پڑتے ہی یہ مر جائے گی اور پھر یہ اپنے آپ بھوکوں مر کر رہ جائے گا، اور کہ تک آنکھیں گھسٹ جائیں تو پریس مانگو کا حیرت کھا جائے گا؟"

اور چودھری ڈرا کہ ساون بیانت گھوڑی آپ چلی جائے گی۔ اور دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کا بچو میاں اس کی نحوست سے ان کی بڑھیا ماں نے بروقت خبر لے کر بال بال بچا لیا۔ اور کوئی اچھی گھڑی تھی کہ انھوں نے دان کر دیا تھا۔ اور بچو میاں بڑی محبت سے بچہ کو دیکھتے اپنے باپ اور استاد کے ساتھ چلے آئے۔ چند قدم بچہ پیچھے پیچھے چلا اور جب یہ ایک موڑ کی آڑ میں آ گئے تو پلٹ گیا اور بچو میاں مڑ مڑ کر دیکھتے رہے' اور پھر گھر تک سوچتے آئے۔ کاش یہ منحوس کاٹھیاواڑی کا بچہ نہ ہوتا۔ یا پہلے سے کاٹھیاواڑی کے بجائے سب مبارک بھونریاں ہوتیں جن پر اس کے باپ اور استاد جھوم جھوم گئے تو وہ کیوں بیمار پڑتے اور ان کی کاٹھیاواڑی کیوں نکالی جاتی یا پھر یہ کمبخت کاٹھیاواڑی مہینہ بھر پہلے گابھن ہوتی ہوتی تو پھر یہ بچہ ان کا ہوتا' اور اس کے لئے اور بھی بڑے بڑے گھی گڑ کے لڈے چرایا کرتے۔ ڈلیوں روٹی اور تیل کھلا کھلا کر اس کو اس چینی کے گھوڑے کی شکل بنا دیتے جس سے ان کی منی بہن کھیلتی ہے جو اس کے لئے وہ کانکی اشنان کے میلے سے لائے تھے۔ ارے گھی گڑ کے لڈے کیا چیز ہیں وہ تو اسے وہ سب کھلایا کرتے جو وہ دستر خوان پر کھایا کرتے ہیں۔ دال بھات' روٹی سالن پراٹھا اور اگر وہ کھاتا تو کباب قورمہ پلاؤ تک بھی چرا چرا کر اُسے۔ اور پھر ان کے تصور میں اس چینی کے گھوڑے کی تصویر گھوم گئی جو وہ اپنی منی بہن کے لئے لائے تھے اور ایسے ہی زندہ کودتے پھاندتے کھلونے سے کھیلنے کو ان کا بے اختیار جی چاہا۔

اور کاتک کے اخیر تک بچہ نے کاٹھیاواڑی کے جسم سے خون کی اخیر بوند بھی چوس لی' اور اگھن کی پہلی ٹھنڈی سیت چلتے ہی فاقوں' کوڑوں اور چابکوں کی ماری کاٹھیاواڑی کٹھیا کی لگام دھکتا توڑ کر اور عرب نائٹ کی شاندار امانت قصائی کے کھونٹے پر چھوڑ کر اپنی راہ گئی' اور اسی روز شام کو کسی سائیس نے بر سبیل تذکرہ چلتے چلتے استاد کو بتایا کہ ساون بیانت کی بھینٹ میں کاٹھیاواڑی آپ گئی!'— اور مالک کے بال بال بچنے اور بڑی بی بی کی بیدار مغزی اور بروقت کاٹھیاواڑی کو نکال باہر کر دینے پر بڑی اہمیت کے ساتھ تبصرہ کیا' اور بڑے بوڑھوں کی عقل اور تدبر اور حفظ ماتقدم کی تعریف کی۔ ساتھ ہی یہ بھی بیان کیا کہ کٹھیا کا کاٹھیاواڑی کے مرنے سے پہلے ہی بچہ سے نالاں ہو گیا تھا۔ اور اب اس بچہ کا کیا کرے' قصائی کے بھی تو کام کا نہیں جو چپکے سے مری ہوئی گائے کے بچھڑے بچھیا کی طرح کسا دے جو کبھی کبھی کسی گائے کے بیانے کے چالیس' دن اندر مر جانے کے بعد گائے والے دان کر دیتے تھے اور وہ بہت جلد خاموشی کے ساتھ کسی بقر قصاب کے ہاتھ چھریوں کے سایہ میں پرورش کرنے کیلئے فروخت کر دیتا تھا۔ دن بھر بچہ بھوکا تھا۔ شام کو جو کا آٹا گھول کر اور دودھ بنا کر تار سے پلانے کی کوشش کر رہا تھا اور کاٹھیاواڑی کو گالیاں دیتا جاتا تھا جو اپنا سارا بار اس پر لاد گئی۔

صبح کو چودھری مویشی خانہ میں آیا تو استاد نے بڑے کھلتے ہوئے انداز میں کہا "لیجئے میاں مبارک ہو' آپ کا دان پھل ہوا" گھوڑی آپ گئی تب۔ مالک بچا' اور کٹھیا سب نحوست ہضم کر گیا' اور میں تو سرکار ٹھر اگیا تھا اس روز خاص وقت آپ نے بھونریاں دیکھ کر قاعدہ میں پکڑا ہے اور آج تک نادم تھا۔ کیا عرض کروں ساری عمر سات پشت سے رئیسوں کا ہی کھلونا بنے گئی ہے۔ غلام نے اپنے پچپن سال کے تجربے میں ایسا غچہ نہیں کھایا۔ بچو میاں نے لاکر باندھ دی اور میں نے کوئی خیال نہ کیا" چودھری خوش ہوا اور کھل کر بولا "مگر استاد وہ بچہ بڑا اچھا ہے"۔

"کیا کہنے اب اس کے۔ اور پھر وہ تو ماں کی ساری نحوستوں کا زندہ جواب اور مبارک بدل ہے' جس تھان پہ بندھ جائے برکت ہی برکت بن جائے۔ کوئی مبارک بھونری بچی ہی نہیں ہے۔ جو نہ لاتا بال بال موتی پروئے سولہ سنگھار کئے آیا ہے۔ اللہ اللہ بچہ ہے کہ سعد اکبر' اگر کسی آپ جیسے جوہر شناس رئیس کے ہاتھ پڑ جائے تو چار دانگ عالم میں شہرہ کر دے' پر ہاتھ پاؤں رنگ ڈھنگ تیور میں یکتا!" اور چودھری نے للچا کر اشتیاق کے ساتھ کہا" پڑ کیسے جائے ہمارے ہاتھ' بڑی بی بی کو کون سمجھائے۔ عورتیں اتنی باریکیاں تو سمجھتی نہیں کہ اب معاملہ اس کے برعکس ہے۔ وہ تو مرتے دہی ایک ٹانگ نحوست لئے جاتی ہیں۔

اور استاد چودھری کی مرضی پا کر خوش ہو گئے اور بولے ان سے نپٹنا میرا کام رہا' میں مویشی خانہ میں کبھی اس کا تھان ہی نہیں قائم کروں گا' جہاں چاہے بیٹھے' کھائے' کھیلے کودے' بس چلتا پھرتا رہے گا۔ اور سرکار یہ پرانی فارسی ضرب المثل ہے' اسپ گشتہ بکار می آید۔ عمر بھر باندھ کر پالے ہیں' ایک ایسا ہی سہی' ذرا بہاریں دیکھنا اس کے جوہر کی۔

"تو پھر بے آپ ہی جاکر کنھیا سے کہ نقد قیمت دے کر، خوش خرید" چودھری نے کچھ ایسا خیال دل میں لاتے ہوئے کہا کہ قیمت دینے کے بعد جب ہر چیز حلال ہو جاتی ہے تو اگر ماں کے زمانہ کی تھوڑی بہت نحوست لگی لگائی رہ گئی ہو تو پاک ہو جائے گی۔

"ہاں سرکار قیمت دے کر اور نہیں تو کیا ہم اس "چھنگیا" سے اپنا دان پھیرنے جا رہے ہیں۔"

(۴)

صبح تڑکے استاد چپ چاپ اکیلے کنھیا کے گھر پہنچے، کنھیا بھیک کی پھیری پر جانے کی تیاری کر رہا تھا اور چٹکی بھر جو کے آٹے کا دودھ بنا کر بچہ کے منہ میں نار سے انڈیل رہا تھا اور جھنجھلا جھنجھلا کر بچہ کی ماں سے اپنا ناجائز رشتہ قائم کرنے کی بات کرتا جاتا تھا۔ استاد نے آواز دی، اور کنھیا استاد کی آواز پہ چونک کر بچہ کو "نکل سالے، نکل سالے" کرتا باہر آگیا اور استاد نے کہا "کہو پنڈت جی اس بچہ کو پالے پڑے ہو؟"

"پالے کیا پڑے ہیں استاد یہ ہمارے پالے پڑ گیا ہے، وہ تو چلی گئی اور یہ سالی منحوس مجھ پہ جے پاپ مڑھ گئی" کنھیا نے گھگھیاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو پھر بیچ لو نا"

"ارے استاد کہاں سے گاہک دوڑے گو" کنھیا نے کہا اور استاد نے استادانہ تیوروں کے ساتھ احسان اور دان سا کرتے ہوئے انداز میں چپکے سے دو روپے جیب سے نکال کر کنھیا کی ہتھیلی پر رکھ دیئے مگر کنھیا کی فطرت بروئے کار آگئی۔ اور موٹے موٹے ہونٹ کھا کر عاجزی سے پیلے پیلے میل چڑھے دانت آگے کو نکال کر بھیک کی طلب کی اور استاد نے ایک اٹھنی اور ہتھیلی پر رکھ دی اور بولے "تو بس اب تو خوش؟ پورے ڈھائی" اور بچہ ہنکا کر لے آئے۔

اور چودھری کے مویشی خانے میں دودھ دوہا جا رہا تھا۔ بچہ اپنے آپ جمنا! روشنیا! (ہانسی حصار کی یک رنگ سیاہ گائے) کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اور شیاما نے قرب امانت کا پیار کے ساتھ استقبال کیا۔ استاد کے اشارہ پر گوالے نے بکری دوہنی بچہ کے سامنے کر دی اور جنم کے بھوکے اور پیدائشی فاقوں کے مارے بچہ غٹاغٹ ایک ہی سانس میں سونت گئے اور ہفتہ بھر کے اندر بچہ کی آنکھیں کھلیں تو پتہ چلا کہ زندگی بھوک ہی بھوک نہیں ہے اور نہ سوکھی ماں اور کنھیا کے کونڈوں کے پیچھے پیچھے دوڑنا ہی دوڑنا ہے! زندگی دودھ! دودھ ہے، اور وہ فدا ماں کے پہلو سے لگے بیٹھے رہنا ہی رہنا ہے۔ اور تھنوں سے تو شیاما ہریانہ ہری کے بچے کو پلاتی مگر چند ہی روز میں اسے طرب بچے کے پسینہ میں بھی اپنے خالص دودھ کی گندھ سنگھوانی دینے لگی، حوصلہ یہی ہو کر بچہ کے رونگٹے رونگٹے پر روغنی سا پن کر جھلک پڑا تھا اور وہ جٹا اپنے بچھڑے کو پیار سے چاٹتی اتنا ہی بے ماں کے بچہ کو، ادھر بچو میاں کے دل کی کلی کھلی گئی اور وہ بچہ کو چھوٹی بہن والے بیٹی کے گھوڑے کی شکل بنانے میں لگی غرض، روٹی تل کی سب پرانی چوریاں دھرانے لگے اور کچھ بچہ کا پاؤں نکلا، گائیوں، بیلوں، بھینسوں کے حصہ میں حصہ ہر تھان پر پہنچ پہنچ کر بٹانا شروع کیا اور ایک بچو میاں ہی کیا؟ چودھری اور استاد سے لے کر بچہ مویشی خانہ بھر کا کھلونا بن گیا اور بہاگن چیت لگتے لگتے بچہ سچ مچ چینی کا سا کھلونا بن گیا۔ اور اب ہرے ہونٹوں میں دانا کر لیا، بہار کی ہوائیں پکے اناج کی خوشبوئیں تیرنے لگیں، بچو استادانہ چارہ چگنا سیکھ گئے تھے، مویشی خانہ کا شیبو کا کٹا چارہ (خاص چنیدہ) یا نور نیا دہ نکالا۔ ہرے لہلہاتے کھیتوں میں اگلے دانتوں سے کتر کتر کر ہرے ہرے بوٹے اور جو کی بالیاں کھاتے نیلاؤں چمکی فضاؤں میں کلیلیں کرتے اور بچے تمام اپنے جمنا! روشنیا! آتا کا کاڑ ہی کو ڑا شیر دودھ پیتے، تمام کے دھندلکے میں بچو میاں کے چراتے ہوئے گڑگڑ کے کھاتے، تیل بن ڈلی بین کی نلیوں رٹیاں چبانے اور ربیع کی فصل کٹی اور کھیت خالی ہوئے تو بچہ کھلیان پہ آ گئے دو دانہ ایک ڈھیر پہ اور چار دانہ دوسرے پر تمام دن ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر، چودھری ہی کیا ہر کسان کے لئے بچو میاں پر مصروف طعام رہتے اور ہر ایک محبت کے ساتھ دیکھتا اور مبارک تیوریوں کی شہرت پہ اپنے ڈھیر پر بچہ کا منہ مارنا موجب برکت خیال کرتا۔ اور صبح کی دو ہی سے آشنہ کر کے گئے بچہ تمام دن کھا پی کر کہیں شام کرا نہیں آتا

کی دو ہائی کے وقت کا ٹھیک اندازہ کر کے مویشی خانے کو چلتے اور مقررہ ناشتہ کر کے اپنی جمنا پاروشیا ماں کے کبھی دائیں پہلو سے کبھی بائیں پہلو سے اور کبھی سامنے بیٹھ جاتے اور ان کا رضاعی بھائی بچھڑا تو چوری سے "چکھا" جانے کے اندیشہ میں ماں سے علیحدہ باندھ دیا جاتا مگر وہ تو دودھ پینے والے تھے، بے کھٹکے چوڑے رہتے اور تمام رات شیاما پہلو سے پٹانے بچے پہ زبان سے دست شفقت پھیرتی رہتی۔ اور جب فصل کھلیانوں سے بھی چلی گئی اور گھروں میں پہنچ گئی تو بچے کو پھرتے پھراتے گلیوں اور دروازوں پر کسانوں نے محبت کے ساتھ روٹی کا ٹکڑا کھلانا شروع کیا اور کہیں کہیں برکت ہونے کے خیال سے پاو آدھ سیر دودھ کا بھی گھونٹ پلا دیتے اور روٹ ساون آتے آتے تو بچہ گھر گھر کے لاڈلے ہو گئے اور در در پر نزول برکت کی نشانی ہو گئے۔ اور پانڑوں کی جوتی گھر کے لاڈلے بچو میاں نے اتنی سر چڑھائی کہ بچہ حویلی کے اندر تک پہنچنے لگے اور یہاں تک کہ دوپہرات ہانڈیوں کی خوشبو پہ دسترخوان والے دالان کے عین سب لوگوں کے کھانا کھاتے وقت بچو میاں کے پیچھے اگلی ٹاپ ارار کر ہنہناتے اور شروع میں تو بچو میاں نے اور پھر سب گھر والوں نے تواضع شروع کی، پھر سب کھا چکو کھانے کے بعد کی اچھی خاصی تفریح آگئی اور کبھی کبھی جب ان کے قصے میں کوئی ایک آدھ ہڈی بوٹی پھینک دیتا تو جمنا پاروشیا کا بیٹا ایک چھینک سی لے کر ناز کے ساتھ کان جھکا کر دم ہلاتا اور منہ پھیر لیتا۔ اور قہقہہ پڑ جاتا۔ کھانے کے بعد بڑی دیر تک دسترخوان کی جوٹھن سے لڑکے لڑکیاں، حتیٰ کہ چھوٹی بڑی چودھرائنیں تک تفریح کرتی رہتیں، اور جب سب ان کے مطلب کی جوٹھن ختم ہو جاتی اور سامنے ہڈیوں اور چھچھڑوں کی بارش ہونے لگتی تو بچہ بکدرسے ہو کر چلے جاتے مگر بڑی بی کو ایک آنکھ نہ بھاتا اور وہ کبھی کبھی کہہ دیتیں کہ ایک نہ ایک دن اس کی نحوست رنگ لائے گی۔

مشہور مانی ہوئی بات ہے کہ بڑھاپے میں مسجد کی روٹیاں مرتے دم تک نوجوانی کے سوتے ابال دیتی ہے، بچپن میں در در کے ٹکڑے بڑی جلدی دیہاتی جوانی چڑھا دیتے ہیں اور حویلی کے دستر کی جوٹھن سال بھر میں بچے سے جوان بناتی ہے اور بچہ تو کسی گھر بندھی نہ تھے۔ وہ دو ہی سال میں مرنج ہو گئے۔ پہلے تو ماں اور نانی کی عمر کی پارہ ستارہ کی خوشبو مویشی خانے کے اندر لینے اور ہنہنانے لگے مگر یہاں معاملہ ان کے باپ ماں کے برعکس تھا۔ پارہ ستارہ اڑگڑوں کے اندر تھیں اور ان کے سنسے سالی کے سال مرکیپل اور لارڈ سیکسن سے ملتے رہتے تھے۔ ایسے لونڈے چھوکرے کی آواز پر ملتفت بھی نہ ہوتیں اور کبھی کبھی بوڑھی پارہ تو بچہ کو اظہار عشق پر بچے کی طرح محبت کے ساتھ پچکار دیتی اور جب یہاں پارہ اور ستارہ کو انصاف کی طرح اڑگڑے توڑ کر باہر آنے کی ضرورت نہ پائی تو ملک خدا تنگ نیست، پائے مرا لنگ نیست، جس طرح بچو میاں نے کمہاروں اور دھوبیوں کے چھپریوں اور گدھوں پر سواری کی ٹریننگ خود رولی تھی اسی طرح آپ بھی جا پہنچے۔ مگر گدھیاں اور چھپریاں بہت بچتی تھیں اور بچہ ماشاء اللہ دو سال میں باپ کے لگ بھگ پہنچ گئے تھے، باوجود دو تین روز دوڑ دھوپ کرنے کے بھی فٹ نہ ہوئے اور شاید وہ ایک روز سلسلہ اور چلتا تو کہیں اونچی نیچی جگہ پر کامیاب بھی ہو جاتے کہ استاد کی نظر پڑ گئی، تھان پہ باندھ تو سکتے ہی نہ تھے اور رلو استاد کو بہر بچہ بتانا تھا نہ کہ انصاف۔ ایک روز خورجی سے نشتر، چھری نکال کر اور السی کا تیل منگا کر بچہ کو باندھ لیا اور چت گرا کے پہلے نشتر سے تھیلی میں شگاف دیا، پھر کوٹھوں پر سے دہکتی ہوئی چھری اٹھا کر موٹی موٹی لٹکتی نسوں پر چھوا دی اور نار سے السی کا تیل حلق میں ڈال دیا اور ہمیشہ کے لئے مویشی خانہ کے اندر اور باہر بچے کے رومان لڑانے کا سد باب کر دیا۔

اور آختہ ہو کر تو بچہ کے اوپر بڑی رنگ دار جوانی چڑھنا شروع ہوئی۔ رونگٹے رونگٹے پر وہ چمک دوڑی جیسے گھی تیل میں سے غوطہ مار کر نکلا چلا آ رہا ہے، آنکھوں کی چمک میں جیسے اپنی دادی کا والی دلکشی پیدا ہو گئی اور تیوروں میں ماں والی رعنائیاں کھیلنے لگیں۔ گردن تیلیا مور کی طرح چست تنی اور پٹھے ایسے نگاڑے کی طرح گول گول الٹ کر اوپر جا پڑے اور بچہ سنگ مرمر کا تراشا ہوا مجسمہ سا بن گیا اور چودھری کو اس پیڈگری معلوم کرنے کا شوق پیدا۔ ان کی جانب سے تو تعصب کے کانجی ہوس سے آگے سراغ ہی نہ چلتا تھا۔ ہسینڈری ڈپارٹمنٹ کے کسی ایک بڑے انگریز نے اصطبل کے معائنہ کے لئے کیمپ کیا اور معائنہ کے بعد چودھری نے بچہ کو پیش کیا اور مشکی عرب سانڈ اور تیلیا کمیت کاٹھیاواڑی کے کراس میں سبزا (سفید) بچہ کیسے پڑا" کا اہم سوال پیش کیا۔ انگریز تحقیق کا بڑا شائق ہوتا ہے اور صاحب موصوف نے عرب ناٹ انصاف کی پیڈگری کے مانوں سرٹیفکیٹوں کی تفصیل دیکھی مگر سات پشت تک ماں باپ میں کہیں سفید رنگ کا رونگٹا بھی نہ نکلا تو

گرگاؤں پرگنہ مراد آباد کے رجسٹرڈ میں ڈیپارٹمنٹ کو کیس ریفر کیا تو وہاں سے کئی ماہ بعد مزید تحقیقات ہو کر اور کاغذات دیکھ کر یہ پتہ چلا کہ عرب نسل کا جو گھوڑا دادا استاد تھا اس چودھری دادا کی صورت شکل اور بال بھونری کی جو تفاصیل لکھیں ہیں من و عن بچھیرے میں وہ تمام موجود تھیں۔

اور اب تو چودھری جی کی نگاہیں بچھیرے پر بہت گہری ہو گئیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات تمام علاقے میں بھی مشہور ہو گئی۔ سارا گاؤں جیسے بچھیرے کے وجود پر محبت کے ساتھ فخر کرنے لگا۔ ادھر آختہ ہو کر بچھیرے کو بالکل ہی لوٹ معاف ہو گئی، سرکاری اصطبل میں پہنچنے لگے، گھروں گھروں عورتوں مردوں میں تک مانوس ہو گئے اور ساری جٹیاں بروشنیاں ہاں سے تو اتنی محبت بڑھ گئی کہ بیان سے باہر اور بچھیرا میاں کا تو عاشق ہو گیا۔ جسم کے ساتھ قد بھی بڑھا اور تیسرے سال کی عمر میں غضب کی جوانی چھٹ پڑی، باپ کر دیا تھا۔ استاد شہامت خاں نے تیسرے سال کے اندر ہی اندر تینوں سواریاں لے کر ٹریننگ مکمل کر دی اور بچھیرے میں الھڑپن اور طراری شوخی کی جگہ شائستہ تیزی نے لی اور مزاج رنگ ڈھنگ میں جیسے بالکل اپنے چودھویں دادا کو پلٹ پڑا۔

(۵)

روہیلکھنڈ کا مشہور دیہاتی میلہ جو گنگا کنارے رحمت خانی روہیلہ دور کی یادگار تھا آج تک اسی آن بان سے لگتا تھا اور اب تک قدیم رواج کے مطابق اس میں خاص روہیلہ دور کی عام گھوڑ دوڑ بھی ہوتی چلی آ رہی تھی۔ روہیلکھنڈ اور ہم سوانہ اضلاع کے بہترین گھوڑے گھوڑیاں خرید و فروخت اور دوڑ کے لئے آتے تھے، ویسے تو ہر قسم کی مویشی کی خرید و فروخت اور کاتکی بیساکھی کی پورن ماشیوں پر عقیدت کے ساتھ گنگا اشنان اس میلہ کی اہم ترین خصوصیتیں تھیں مگر کسی سے کم اہم یہ دیہاتی گھوڑ دوڑ بھی نہ تھی جس میں ایک سے ایک بڑھ کر اور چھ چھ مہینے ریاض کیے ہوئے دیہاتی زمیندار اپنے جانور لاتے اور کبھی زمیندار کے رکھے ہوئے جھپ پر دوڑ کا مقابلہ ہوتا، سب اضلاع کے کلکٹر اور روہیلکھنڈ ڈویژن کا کمشنر اس کے منتظم ہوتے۔ اور کل میلے کی آمدنی سرکار کو جاتی تھی اور رئیس طبقہ کی خاص توجہ اس تاریخی قسم کی گھوڑ دوڑ پر بڑے شوق کے ساتھ رہتی۔ اور لطف یہ کہ اس کے قواعد و ضوابط آج تک وہی پرانے، روہیلے دور کے چلے آ رہے تھے بازی کا نہ لگتی تھی، سب سے تیز اور جیتنے والے گھوڑے کو "نریش" کا خطاب، جیت کی سند اور چاندی کا کپ (جھپ) دیا جاتا۔ اور تجربہ کار استاد نے بچھیرے کے دم خم دیکھ کر چوتھے ہی سال میں میلہ کی گھوڑ دوڑ میں اتار دیا اور سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں میدان بچھیرے کے ہاتھ رہا اور بڑے لمبے عرصہ سے رالو را ایک چکر پڑھا! صدیوں سے اتنے لمبے عرصہ سے کسی جانور کے بڑھنے کی روایت نہ تھی، دوڑ کے رجسٹر میں بچھیرے کے مالک کے نام کے خانہ میں چودھری میاں بجائے اپنے یا اپنے باپ کے اولیس گڑھ لکھایا تھا، اولیس گڑھ اس قصبہ کا نام تھا جو ان کا آبائی وطن تھا اور اس جدت پر چودھری بہت خوش ہوا کیونکہ اولیس اس کے جد نامدار تھے جنھوں نے اپنے نام پر یہ قصبہ آباد کیا تھا، اور میلے اور گھوڑ دوڑ کی تاریخ میں یہ پہلی مثال تھی کہ کوئی گھوڑا بجائے کسی فرد کے کسی مقام کے نام شریک ہوتا تھا اور دوسری فصل بیساکھی کے میلے میں استاد نے پھر بچھیرے کو گھوڑ دوڑ میں شریک کیا اور اب کی مرتبہ میدان، دنگل نہ لے وہ کامیابی کے ساتھ ہاتھ رہا۔ استاد بچھیرے پر خود سوار ہو کر بھگاتے اور تیسرے راؤنڈ میں تو بچھیرا غضب ہی کر دیتا۔ دس پانچ گز نہیں پورا راؤنڈ آگے ہوتا، لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے گھوڑا ہے یا آسیب، ایک ایک ڈیڑھ ڈیڑھ فرلانگ سے ہراتا ہے۔ اگلے سال کے دونوں میلوں کی دوڑ کا سہرا بھی اسی شان کے ساتھ بچھیرے کے سر رہا۔

اور اب بچھیرا اولیس گڑھ کے کسانوں سے بڑھ کر ضلع کے کسانوں کے دلوں میں گھر کرنے لگا اور تیسری دوڑ جیت کر تو بچھیرے کی محبت اور جیسے ملکیت تمام روہیلکھنڈ میں عام ہو گئی۔ اس کی جیت کے ساتھ ہر دلعزیزی بڑھانے والی خاص چیز اس کی پرورش کا طریقہ جو چھیوں اضلاع کے کسانوں کے علم میں بالتفصیل تھا، اور پھر یہ کہ بچھیرا کسی کی تنہا ملکیت نہیں، اولیس گڑھ کے اندر اس کا کوئی تھان نہیں، اور اولیس گڑھ کے کسان بڑے فخر کے ساتھ بچپن سے لے کر اب تک کی بچھیرے کی سوانح حیات بیان کرتے اور وہ بڑے شوق سے سنتے اور پھولے نہ سماتے کہ اولیس گڑھ کے کسانوں نے ایک ایسا بیر پالا جو بڑے بڑے پرانے راجپوت پٹھانوں کے جانوروں سے بڑھ گیا اور جتنا رشک و حسد کا جذبہ بچھیرے کی جانب روہیلکھنڈ بھر کے پھاگ میں حصہ لینے والے اور ہر سال منہ کی کھانے والے روساء کے دلوں میں ترقی کرتا گیا، کسانوں کے دلوں میں پیار سوا

محبت جڑ پکڑتی گئی۔ اور دوڑ میں تو بچو نے چھ سال سے ہیلکھنڈ شرکت کی پوزیشن لے لی تھی اور اب تو ہر کسان کے دل میں ہیرو کا مقام پیدا ہو گیا تھا
اور بچو میاں کو شروع شروع میں تو بچھ کی مناسبت اور دلچسپی کے سبب انہیں گڑھ کے کسانوں کے ساتھ یک دلی کا احساس ہوا اور پھر یہ دلچسپی اور
لگاؤ جو ایک گھوڑے کی محبت سے پیدا ہوا تھا ان کا ان کے کسانوں کا اپنا ہو کر رہ گیا۔ اور سن شعور کو پہنچتے پہنچتے کالج کی سوسائٹی اور مخصوص قسم
کے مطالعہ نے انہیں سکھلا دیا کہ عام کسانوں سے اتنا ہی قریب پہنچا دیا جتنا بچہ تھا اور انٹرمیڈیٹ تک تو خیر کچھ دوئی کا پردہ رہا مگر بی اے میں پہنچتے
ہی وہ بھی بچو کی طرح کسانوں کا پھل اور منفرد قسم کی چیز بن گئے۔ شروع سے ہی ان کا طرز عمل اپنا کچھ علیحدہ تھا۔ ان کے دونوں بڑے بھائی شکار
کے سیزن میں حکام ضلع اور روساء اہم شخصوں کی پارٹیاں مدعو کرتے۔ جیسے، مرغابی، قاز، تیتر بٹیر کے شکار کے پروگرام بنتے اور کبھی کبھی شیر کے شکار
کی اسکیم بن جاتی۔ دعوتیں اڑتیں اسکڑوں روپیہ خرچ ہوتا مگر بچو میاں ایک اچھے شکاری اور قادر انداز نشانہ باز ہوتے ہوئے بھی ان کے ساتھ
کبھی شریک نہ ہوتے وہ ہمیشہ جنگل کے شکار کے پروگرام بناتے اور سانبھر، ہرن، چیتل بھالو، بارہ سنگھے وغیرہ قوی الجثہ چرندے بڑے
شوق سے مارتے اور اس سے زیادہ شوق کے ساتھ دیہات میں گوشت تقسیم کراتے۔ پارٹی میں نوجوان منچلے شوقین کسان ہوتے اور ان کے
ساتھ بچو میاں کو اپنے دونوں بھائیوں کی نسبت کہیں زیادہ مزہ آتا۔ اور اس طرح سیکڑوں من گوشت بانٹ کر اور گھر گھر گوشت کی ہنڈیاں
گرم کرا کر اور گوشت کی بہاریں دیکھ کر انہیں اس سے کہیں زیادہ لطف آتا جتنا ان کے بھائیوں کو شکار کیمپ کی ڈائننگ میز پر اپنے معزز
مہمانوں کے ساتھ تیتر اور چہے لے کر مٹ اور قاز، مرغابی کے قورمے میں آتا تھا اور بالعموم عین اسی وقت جس وقت ان کی یہ ٹیبل رنگارنگ
گوشتوں اور شرابوں سے مہکتی ہوتی بچو میاں کہیں جنگل میں کوئلوں پر ہرن، چکارے سانبھر، بارہ سنگھے کے گوشت کی بوٹیں بھنوا بھنوا کر مزے
مزے کسانوں کے ساتھ کھاتے ہوتے اور بچو میاں کے کیمپ میں بالعموم سو سو آدمی ہوتے جن پر خرچ بھی کرتے اور جنگلی زندگی کا سچا لطف لیتے۔

اور اب کی مرتبہ میلے سے پیشتر روہیلکھنڈ بھر میں کانوں کان بڑے زور سے افواہ اڑی کی اس گھوڑ دوڑ میں کمشنر صاحب کی میم صاحب
کی گھوڑی بھی دوڑے گی۔ اس دوڑ میں یہ عجیب افواہ تھی، ورنہ ہر میلے سے پہلے ہمیشہ کسی ٹھاکر پٹھان زمیندار کی گھوڑی یا گھوڑے کے نام کی شہرت
اڑا کرتی تھی اور جب سے بچو نے یہ میم جیتنا شروع کیا تھا یہ شہرتیں بہت زور کے ساتھ طرح طرح کی حاشیہ آرائیاں کر کے اڑائی جاتیں اور پہلے
سے مرعوب کرنے کی کوشش کی جاتی یا بالعموم تھوڑی تفریح مدنظر رہتی۔ مگر کمشنر صاحب کی میم صاحبہ کا نام بالکل نیا تھا اور میلے کی تاریخ میں پہلی مرتبہ
کوئی سرکاری عہدہ دار شریک ہو رہا تھا اور میم صاحب کی دوڑنے والی گھوڑی کی طرح طرح کی مافوق الفطرت قسم کی حکایتیں اور روایتیں استاد
کے کانوں میں پڑیں اور ہر گانوں کی ہفتہ کی پینٹھ اور نخاس میں سے روایتیں سنائی پڑتی رہیں، استاد کو سرے سے ہی یقین نہ تھا کہ کوئی سرکاری
عہدہ دار پبلک ریس میں مقابلہ کے لئے اترے گا۔ مگر گانوں کی پینٹھوں اور نخاسوں بازاروں کی بے تارکی تار برقی سے جوں جوں میلہ
قریب آ گیا افواہیں تیز ہوتی گئیں اور روہیلکھنڈ بھر کی نظریں تو اپنے بچو پر تھیں اور ہمیشہ وہ کئی میلوں سے بچو کے لئے جاسوسیاں کرتے اور
دور دور کے گانوں سے اہیر گڑھ کے کسانوں میں خبریں پہنچانے اور یہ خبریں کبھی کبھی راجپوت اور کبھی پٹھان زمیندار کے بھاگ کے لئے
تیار کئے جانے والے جانور کے متعلق ہوتیں کہ بس اب کی بچو نہیں جیت سکتا۔ فلاں ٹھاکر اپنی گھوڑی کو ایسا تیار کر رہا ہے۔ فلاں پٹھان گھوڑا
کھلا پلا کر لا رہا ہے۔ مگر اب کی مرتبہ تو کمشنر صاحب اور ولایت کے سامان میں دم آتی تھی اور جوں جوں میلہ قریب آیا یہ خبر
دیہات میں گھر گھر پھیل گئی کہ بس اب کی مرتبہ بچو کی خیر نہیں۔ کمشنر صاحب کی میم صاحبہ کو جو گھوڑے ایک بڑے نواب نے ان کی شادی کے جہیز
میں دی ہے وہ دوڑتی ہے اور لندن کی گھوڑی سے بچہ کیا جیت پائے گا!"

اور بچو میاں نے میلہ سے قبل اس سلسلہ میں گھبرا کر خوشی خوشی استاد کو اس دیہاتی افواہ کی حقیقت بتائی کہ چند ماہ قبل جارے کمشنر
صاحب شادی کرنے ولایت تشریف لے گئے۔ جب وہ وہاں میم صاحبہ کو ہز ہائنس سر آغا خاں نے جو ان کے ایام دوشیزگی کے دوست ہیں
اس شادی کے موقع پر میڈم کلوڈیا نامی گھوڑی بطور تحفہ پیش کی ہے اور یہ تحفہ شادی میم صاحبہ نے فرانس اور انگلستان بھر کی بہترین
بہترین گھوڑا ہونے کا اعتراف ہے جو ان کے تجربہ کار متبحر دوست نے بطور تحفہ پیش کر دیا ہے اور جہاں تک کہ

انگلستان سے رخصت ہوتے وقت ان کے ساتھ میڈم کا وڈیا کا Damage بھی خود اپنے اہتمام سے ٹیکا کرایا ہے، اور بچو میاں نے بڑی خوشی سے بیان کیا کہ ان کا بچہ میڈم کا وڈیا کے مقابلے پر دوڑے گا اور بیس بسوہ جیتے گا اور انٹرنیشنل شہرت کا مالک ہوگا۔ مگر استاد کچھ سوچ میں پڑ گئے تو بچو میاں نے کہا کیوں استاد کیا ڈر گئے؟ اور آپ تو کہتے تھے کہ بچہ کے ہاتھ پر فضلی اور پاؤں میں پدم ہے اور یہ کسی سے ہار ہی نہیں سکتا اور یہ تو یہ اس کا مالک اور اس کا سوار تک کبھی کسی سے نہیں ہار سکتا۔ مگر استاد نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور جیوں جیوں میلہ قریب آتا گیا افواہ گرم تر ہوتی گئی اور یہ گھوڑدوڑ ہمیشہ سے زیادہ رنگیں تر ہوتی گئی اور کیوں نہ ہوتی کمشنر صاحب کی نئی موو کے رنگین دور سے گذرتی ہوئی دولہن کی گھوڑی کا مدار اس پر تھا۔ یہ کہ گھوڑوں بچھڑیوں کے کچھ بین الاقوامی پوزیشن کے جوہر شناس قدرداں اس میدان کے مرد تھے مگر آغا خان کا تذکرہ محبت چوپال چوپال، الاؤ الاؤ چرچے تھے اور دل خوف و امید میں زیر و زبر دھک دھک کر رہا تھا اور اگر چوہدری یہ کہتے کہ کوئی بات ہے اگر بچہ ہار گیا تو کیا بات ہے۔ ارے کا بھی تو کمشنر صاحب کی گھوڑی سے تو نوجوان گھر گھرا پڑتے اور ادب کے ساتھ ایسی بات کہنے بڑھوں کو روکتے اور انھیں صبر نہ آتا۔

ریس

(۶)

کمشنر صاحب چھ مہینے کی رخصت کے بعد شادی کر کے پلٹے۔ سب اضلاع کے کلکٹر صاحبان مبارک باد اور تحفے لے کر حاضر ہوئے گھوڑی کے سلسلے میں کمشنر صاحب نے شادی کے بعد ہی ولایت میں میم صاحب سے اپنی کمشنری کی اس تاریخی گھوڑدوڑ کا تذکرہ کر دیا تھا اور نئی گھوڑی کے شوق میں وہاں میم صاحب نے اس گھوڑدوڑ میں شریک کرنے کا اظہار خیال کیا تھا اور صاحب کمشنر بہادر ایک ہندستانی اعلیٰ عہدہ دار کی طاقتوں کا اپنی نئی نویلی دلہن کے سامنے اظہار شیخت کرتے ہوئے بزعم خود میڈم کلوڈیا کو جتانے کا وعدہ بھی کر کے لائے تھے جبکہ کاوڈیا نے ہندستان کی سرزمین پر ٹاپ بھی نہ رکھی تھی۔ ویسے میم صاحب کو سر آغا خاں کی بچپانہ صحبتوں میں ہندستان کے اونچے طبقہ کی داخلی طاقتوں کا یورپ کے اندر خوب تجربہ ہو گیا تھا لیکن ذرا ابھی ایک ہندستانی کمشنر کی بوالعجب ترقی کا اس پہلو سے اچھی طرح اندازہ نہ تھا۔ انھوں نے اس یقین کے ساتھ وعدہ کرنے کی صورت پوچھی تو کمشنر صاحب نے مسکرا کر ٹالنا چاہا اور جب بار بار اصرار کے ساتھ پوچھا تو کہا کہ بڑا کہ اپنے اضلاع کے کلکٹروں کو ایک اشارہ کافی ہے، اور اسپورٹس مین لانگ میم صاحب نے مزید مشغل دریافت کرنی چاہی تو صاحب موصوف یہ جادو کی بات نہ سمجھا سکے کہ ان کے کلکٹر ایک اشارہ میں اپنے اپنے اضلاع کے اندر کس طرح گھوڑے کو گدھا اور گدھے کو گھوڑا بنا لیتے ہیں۔ اور ذرا دیر میں آدمی کو ڈاروِن کی تھیوری پر الٹا چڑھا کر بندر کی طرح اپنے جادو کے ڈنڈے پر کیسے نچاتے ہیں اور میم صاحب بچاری ابھی تازہ ولایت اور ہندستان میں نو گرفتار قسم کی عالی عہدہ دار کی بیوی تھیں اور عہدہ دار یا عہدہ دارانہ اشاروں سے ناواقف تھیں۔ ہر کلکٹر تحفے لے کر سلامی مجرئی کے لئے حاضر ہوا اس سے نہایت معصومیت کے ساتھ اس کے کمشنر کے ولایت کے وعدہ کا حوالہ دے کر میڈم کاوڈیا کے جتانے کا قطعی وعدہ لے لیا۔ حالانکہ صرف اتنا معلوم ہو جاتا ہر کلکٹر کو زبانی آواز تھا کہ کمشنر صاحب کی میم صاحبہ اپنی گھوڑی کو شریک مقابلہ کرنے کا خیال کر رہی ہیں۔

اور سنگ آمد و سخت آمد، استاد کا تو سنتے ہی ماتھا ٹھنکا تھا کہ اب کی ان کے بچہ کی خیر نہیں، سیلہ کے انتظام کے ساتھ ساتھ چھبیسوں اضلاع کے اندر اس مرتبہ اس جدید انتظام کے بھی احکامات چھوٹے بڑے اسد عامہ کے عہدہ داروں میں آنکھوں ہی آنکھوں میں پھیل گئے اور ایک اشارہ میں مکمل ہو گئے اور انھیں کی تعمیل کے سلسلے میں کوتوال صاحب بیچارے چودھری کے یہاں پہنچے تھے۔ وکیف کا سبب بچہ کی جانب سے سخت اندیشہ تھا اور کوتوال صاحب نے چودھری کو دوستانہ اور بچو میاں کو بزرگانہ رائے دی کہ وہ اس دفعہ بچہ کو میدان میں نہ اتاریں۔ اور چودھری تو پرانی چال کا اور صلح کل طبیعت کا مرنج و مرنجان قسم کا آدمی تھا۔ کوتوال صاحب کی تیتی رائے پر

ظاہر کیا۔ بچو میاں نے ایس پی سے بھی زیادہ دم خم کے ساتھ ان سے بات کی اور نوجوان کے آثار کی شدت اور جذبات کی تندی
دعدہ ساکر لیا مگر بچو میاں نے ایس پی سے بھی زیادہ دم خم کے ساتھ ان سے بات کی اور نوجوان کے آثار کی شدت اور جذبات کا
رتجربہ کار کوتوال سے ذرا پیچیدا بدلا۔ اور کہا "میاں! صاحبزادہ ہیں تو تمہاری بھلائی کے لئے کہتا ہوں، تمہارا گھوڑا آٹھ مرتبہ میدان مار
' اور سیڈم کا وڈیا ولایت کی گھوڑی ہے خاص سر آغا خاں کے اصطبل کی ناک۔ جس کے ماں باپ" دادا دادی" نہ معلوم کتنی بار ڈربی ریس
چکے ہیں جن میں بیس لاکھ کی ایک ایک بازی ہوئی ہے۔ مفت میں کیوں کرکری کرانے کو اس کے مقابلہ پر اپنا جاجیتا گھوڑا اُڑا لو — اور
رجیت جاؤ بفرضِ محال تو اس کا نتیجہ!؟"
اور بچو میاں نے ایک موہنہ زور دکیل کے انداز میں خشکی کے ساتھ جواب دیا" دیکھئے تو کوتوال صاحب ہار جانے والی قباحت تو آپ
ارے سمجھنے کے لئے چھوڑ دیئے کیونکہ اسے صرف ہمارا دل محسوس کرے گا نہ کہ آپ کا وہ بفرضِ محال جیت گیا تو اس کا نتیجہ بجز اس کے
رکیا ہو سکتا ہے کہ ہم جیت گئے؟ یا آپ کا خیال ہے کہ سوا اس کے اور کوئی اور بھی ہو سکتا ہے؟ کہ خدا نخواستہ ہم ہار گئے:
اور گھاگھ کوتوال نے لونڈے کے کالج ڈبیٹ والے تیور دیکھ کر کہا" نہیں میاں تمہارا کوئی دخل نہیں، بات میرے اور میرے دوست
کے درمیان ہو رہی تھی۔ چودھری سے میرے دو سال کے مراسم ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ چودھری کا گھوڑا آٹھ مرتبہ کی جیت ہار کر آئے، میاں
صاحبزادہ وہ گھوڑی بہت تیکھی ہے، ہم تو تین مہینہ سے کھلا پلا رہے ہیں اور ہماری ران تلے بھی عمر بھر گھوڑے گھوڑیاں رہا کی ہیں،
مفت میں کرکری ہوگی اور گھوڑا آپ کا تیج کھیت پٹے گا:
"واہ جناب واہ! یہ اچھی منطق ہے، ارے صاحب ہماری عزت ذلت کو آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں کہ ہم خود۔ اور فرض کیجئے
ہمیں ابھی ہی عزت معلوم ہو کہ ہمارا گھوڑا تیج کھیت پٹے تو پھر؟"
"اور یہی تو میں آپ کو سمجھا رہا ہوں، اور میرا کام نیک مشورہ دکھانا ہے":
"آپ کا شکریہ کہ آپ ہماری جان و مال کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ہماری عزت کی حفاظت کا بھی راستہ بتا رہے ہیں":
اور کوتوال صاحب نے اک ذرا موڈ بدل کر کہا" جی ہاں میاں صاحبزادہ ابھی آپ بچے ہیں۔ آپ کو آپ کی عزت کی ہی حفاظت
کا راستہ بتا رہا ہوں":
اور بچو میاں نے انتہائی ضابطہ کے انداز میں خشکی کے ساتھ بولے" لیکن جناب یہ آپ مجھ سے میاں صاحبزادہ کہہ کر کیوں
خطاب کر رہے ہیں۔ ابھی جو آپ کا یہ نیا ڈی ایس پی تقرر ہو کر آیا ہے یہ پچھلے سال میرا کلاس فیلو تھا، اور اسے تو شاید آپ حضور
کہہ کر بات کرتے ہوں گے اور میں بچہ ہوں ابھی اور میرا نیک مشورہ سمجھانے کے لئے آں جناب کو تکلیف کرنی پڑی ہے، ہاں تو فرمائیے اگر
میں ہار جانے ہی میں اپنی عزت خیال کرتا ہوں تو مجھ کو عزت بچانے کا کونسا راستہ دکھا رہے ہیں؟
"دیکھئے چودھری بچو میاں صاحب! ماشاءاللہ آپ نوجوان ہیں، عقل مند ہیں، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، میں جانتا ہوں، تو میرا
مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کا گھوڑا جیت گیا تو پھر یہ بات کمشنر صاحب کے لئے کتنی شاق ہوگی:
"لیکن جیتنا تو امر محال ہے جیسا کہ ابھی آپ نے فرمایا اور ہار نا یقینی اور ایسے گھوڑے کو ہرا کر جو آٹھ مرتبہ جیت چکا ہو
کمشنر صاحب کی گھوڑی کی شہرت کتنی بڑھے گی لہٰذا جناب گھوڑے کا میدان میں نہ اترتے دینا کمشنر صاحب کی شہرت کا روکنا
ہے "اور ہمارے گھوڑے کے جیت جانے پر شاق گذرنا تو فطری امر ہے اوپن کمپٹیشن (Open Competition) ہے اور ہار جیت
کی اسپرٹ ہی میدان میں لاتی ہے۔ اور شاق گذرنے کا ہم پر کیا اثر کمشنر صاحب پر شاق گذرے گی ہم خوش ہوں گے:
"پھر عرض کرتا ہوں چودھری صاحب آپ نوجوان ہیں۔ پڑھ ضرور گئے ہیں، ان گلیوں کی ابھی سیر نہیں کی ہے، اثر کیوں نہیں
مجھ پر بھی اور آپ پر بھی":
"دیکھئے تا اب یوں کہئے وہ دوستانہ طلب اور ہماری ذلت والی بات نہیں تھی بلکہ مطلب سیدھا یہ تھا۔ ہم کوئی کوتوال تھوڑی ہیں جو

ہم پر کمشنر صاحب کی گھوڑی کو جیت لینے کا برا اثر پڑے گا" اور نہ یہ بچہ ہی کوتوال کا گھوڑا ہے جسے گھر بٹھا کر اور میدان مار کر کمشنر صاحب کی اعلیٰ دار نعم اسپورٹس میں لانگ اسپرٹ مطمئن ہو جائے کہ سیڈم کلوڈیا پچ پچ روہیلکھنڈ کی ہیروئن کا درجہ پا گئی اور اب تو میڈم کلوڈیا بچا کھیت بیچ کر ہوا کرتا ہے درجہ حاصل کر لے گی"

"اور کوتوالی نے بچو میاں کے دم خم دیکھ کر تیسرا پینترا بدلا"۔ "دیکھئے صاحب جانے دیجئے، خیر آپ میری پوزیشن پر بھی غور کیجئے کسی کو کچھ نہیں بگڑے گا، آج کل ہندو گردی کا زمانہ ہے اور میں آپ کے والد کا دوست ہوں، اگر بچہ دوڑے گا تو مجھ کو نقصان پہنچ جائے اور پھر میں تو دوست ہوں خیر آپ ہی بتا دیجئے کہ آپ کتنے مسلمانوں کو روزی سے لگا سکتے ہیں، آپ کی وزادیہ کی واہ واہ ہو گی اور پھر آپ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ یہ کافر مفت میں آپ کے بھی پیچھے پڑ جائیں گے"

"بھئی سبحان اللہ! یعنی سارا اسلام آپ کے نقصان نفع میں ہے، یعنی زیادہ سے زیادہ آپ کے کیریکٹر رول کی ایک بلیک ہسٹری بچانے کے لئے میں ہزاروں لاکھوں بندگان خدا کو دھکا دوں جن کی آنکھیں اس وقت اس گھوڑ دوڑ پر لگی ہوئی ہیں۔ اور یہ کونسا اسلام ہے جناب کہ کافروں کے پیچھے پڑ جانے کے ڈر سے میں لاکھوں آدمیوں سے جھوٹ بولوں، قبلہ آپ بھی جیت جانے کے نتائج کے لئے تیار رہئے، اور جب میں ہی بھگتنے کو تیار ہوں تو آپ کر بھی کیا سکتے ہیں"

اور کوتوال صاحب نے بوڑھے چودھری کی جانب پُر امید نگاہوں سے دیکھا اور پیشتر اس کے کہ بڈھا باپ کچھ بول پائے نوجوان بیٹے نے تاڑ کر کہا "کوتوال صاحب بچہ نہ چودھری صاحب کا ہے اور نہ میرا، یہ روہیلکھنڈ کے چار لاکھ کسانوں کا ہے اور اور ہر گھرکا پورا قصبہ اس کا امانت دار ہے اور ایسے معاملہ میں کسی بھی مصلحت کے پیش نظر کوئی سمجھوتہ کرنا خیانت ہے اور اگر خیانت نہ کرنے کے بُرے نتائج مجھ کو بھگتنے پڑیں گے تو میں بخوشی انھیں برداشت کرنے کو تیار ہوں"

"اچھا اگر ہم براہ راست کاشتکاروں سے اس مسئلہ کو خوبصورتی کے ساتھ طے کرا دیں تو پھر آپ انھیں درغلائیں گے تو نہیں"

"اس کے دو جواب ہیں روہیلکھنڈ کے تین لاکھ کسانوں کے ساتھ بچہ میں ایک حصہ دار میں بھی ہوں انھیں کیا حق ہے کہ براہ راست میرے حصہ کا بھی سمجھوتہ کریں"

"لیکن ہر معاملہ کثرت رائے پر طے ہوتا ہے"

"چلئے مان لی مگر میرے پاس اگر کوئی پوچھنے آئے گا تو میں حق بات بتاؤں گا۔ اور یہی بات اگر درغلانا ہے تو آپ کے نزدیک ضرور درغلاؤں گا"

"ماشاء اللہ! ماشاء اللہ! کیا شوق لیڈری ہے" کوتوال صاحب نے کھسیانی بلی کی طرح کہا، اور برجستہ بچو میاں نے کہا "اے سبحان اللہ کیا شان کوتوالی ہے!" اور دونوں کے چہرے سرخ ہو گئے اور بوڑھے باپ نے خودسر بیٹے کی جانب ذرا کڑے تیوروں سے دیکھ کر قدرے تحکمانہ انداز میں کہا " ہیں بچو میاں! یہ مت بھولو کہ تم اپنے گھر پر ہو اور کوتوال صاحب سے بات کر رہے ہو"

"جی ہاں، جی ہاں" بچو میاں نے ذرا محجوب سا انداز بنا کر کہا "اگر کوئی دل شکنی ہوئی ہو تو کوتوال صاحب معاف فرمائیں اور خیال فرمالیں کہ اپنے ہیڈ کانسٹیبل سے باتیں نہیں کر رہے تھے"

"اچھا آپ تشریف لے جائیے!" عاقبت اندیش باپ نے نوجوان بیٹے سے کہا اور بچو میاں کو فوراً جانا پڑا۔ اور اب کمرہ میں تنہا چودھری اور کوتوال صاحب دو منٹ بالکل خاموش اور ایک دوسرے کے آغاز کلام کے منتظر رہے اور چودھری کانے کچھ الفاظ معذرت زبان پر لانا چاہے تو کوتوال صاحب نے اس دروازہ کی جانب بہ نظر احتیاط دیکھتے ہوئے بات کاٹ دی اور کہا "یہ بات اب ایسے بن نہیں سکتی اور اگر آپ اب کوئی بات معاملہ کی کریں گے بھی تو اور بھی برا ہو گا، میں سمجھتا ہوں کہ اگر اب آپ کا گھوڑا روکنے کی کوشش کی جائے گی تو آپ کا یہ لیڈر بیٹا معاملہ کو تمام کسانوں میں پھیلا دے گا اور حکام بالا کے کان تک یہ آواز پہنچ کر گھر دیا

تو اگر گھوڑا رک بھی گیا تو بھی بات بہت بگڑ جائے گی اور رکنا نہ رکنا برابر ہوگا بلکہ رکنا اور بھی برا۔"
جا رہا ہے ... چودھری نے کچھ کہنا چاہا مگر کوتوال صاحب نے بات کاٹ کر کہا "معاف
"اچھا صاحب میں آپ سے از روئے حلف کہتا ہوں ......"
کیجیے میں آپ سے حلف لینے نہیں آیا ہوں اور نتیجہ کے لئے میں تیار ہوں اور مجھ سے پہلے آپ بھی دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر کے لئے تیار رہیے" اور
پھر کوتوال صاحب نے پھر اس داروغہ کی جانب دیکھا جس سے بچو میاں باہر گئے تھے اور پیشتر اس کے کہ چودھری کچھ کہہ پائے اٹھ کر خیر علیک سلیک
ارہ جا۔

(۶)

کوتوال صاحب کوتوال سہی مگر چودھری بھی تو چودھری تھا، کوئی دھاجولا تو تھا نہیں اور ٹھنڈا کر کے کھانے کے لئے وقت نہ تھا۔
منازمدل Ready کا استعمال ممکن نہ تھا۔ معاملہ نہایت نازک تھا اور انھوں نے تو خود ہی بہت خیال کر کے چودھری کی اونچی پوزیشن کے
الی بات ہی تھی۔ ضرورت کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ بچہ کو مقابلہ پر لا کر ہرانے کی فرمائش کرتے وہ کلکٹر صاحب اور سپرنٹنڈنٹ صاحب کو اطمینان
بچکے تھے، میلہ لگ چکا اور ریس میں دوڑ بن رہی بلکہ تھے اور اب ہر طرح سے موقع واکے پوائنٹ پر آگیا تھا۔ ایسے مواقع پر وہ اور یہ دی کیا
رکے اور دور دور کے تھانیدار اپنے استاد شیخ مشرف الدین ریٹائرڈ تھانہ دار سے رجوع کیا کرتے تھے۔ شیخ جی کے
ن اب رائے ہی رائے رہ گئی تھی مگر کبھی کبھی ان کی رائے تھانہ داروں کی ہمت کے ساتھ شامل ہو کر بڑے بڑے اچھے معاملوں کو ایک چٹکی میں سلجھا
بی۔ شیخ جی کو ریٹائر ہوئے دس سال ہو چکے تھے اور سروس کی تیس سالہ مدت اور پانچ سالہ توسیع میں سپاہی سے شروع کر کے تھانیداری سے
ریٹائر ہوئے تھے اور اپنے دور میں یو۔ پی پولیس کی رائے، بہادری اور بیدار مغزی کی زندہ تشکیل اور نمائندہ تخلیق تھے۔ پانچ سال کانسٹیبل،
ن سال ہیڈ کانسٹیبل اور پورے بیس سال تھانہ دار رہے۔ ہیڈ کانسٹیبلی کے دور میں ایک اشارہ میں میرٹھ کی نوچندی لڑائی، تھانیداری
کے زمانے میں گکوڑے کا میلہ ٹھوایا۔ علاقہ بھر میں جس گاؤں نے ذرا سرکشی کی دن دھاڑے پچھم سے ٹھکوایا پورب میں اتار دیا اور اسے
تھانہ کے نہیں ضلع بھر کے بڑے بڑے تھانگی گروہ بند بدمعاش زانوئے ادب تہہ کرتے۔ بد مطلقے تربیت پاتے اور گورنمنٹ نے تھانہ داری
ان کی بے پناہ خداداد صلاحیتوں پر نظر کرتے ہوئے شیخ جی کی سروس کے اخیر دس سال ان کی ڈیوٹی مشہور زمانہ پشت ڈاکو سلطانہ کی
گرفتاری کے سلسلہ میں "کار خاص" میں لگا دی اور اس کار خاص میں پانچ سال انھوں نے گرفتاری کے سلسلہ میں اور بقیہ توسیع کے پانچ سال
ترتیب مقدمہ گینگ کیس "سلطانہ ڈاکو" میں گذارے اور بس اسی زمانہ سے شیخ جی کا دل پلٹا اور ریٹائر ہوتے ہوئے بقیہ عمر یاد الٰہی میں بسر
کرنے کا تہیہ کر لیا، سلطانہ کو پھانسی کرا کر مخلوق خدا کو اس کے ظلم سے نجات دلانا اور پھر اپنی جان بچا کر ہی ان کی سروس کا اخیر کارنامہ تھا۔
جو اپنی جگہ پر کار خیر کی تعریف میں آتا تھا اور ریٹائر ہوتے ہی انھوں نے سب سے پہلا قدم تبلیغ اسلام اور اس کے ساتھ ہی ساتھ نکاح ہو گا
سے شروع کیا اور چھ مہینے کے اندر ہی اندر سلطانہ مرحوم کی بیوہ ... کو مشرف باسلام کر کے نکاح کیا اور پھر دوسرے ہی سال حج بیت اللہ
مقدس مقامات کی زیارت کو تشریف لے گئے۔ تھانہ داری کے زمانہ کے گل مچھے کھچڑی داڑھی میں اتار لئے اور دنیا سے سیر ہو کر اب توشہ
آخرت جمع کرنے کے لئے تسبیح مصلے پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ساری عمر کے تھکے تھے، ناشتہ میں بادام، بالائی، انڈے کھاتے۔ کھانے میں بکری
کا گوشت دودھ وغیرہ مسنون غذاؤں کا ایصال ثواب کی وجہ سے خاص خیال رکھتے۔ ساٹھ سے اوپر عمر تھی اور کا دانہ سا رنگ، نورانی داڑھی
کیا ہی نورانی بڑھاپا شیخ جی پر اللہ میاں نے اتارا تھا اور وہ عزت کہ آج ریٹائر ہوئے دس سال ہو چکے تھے۔ صوبہ بھر میں قصبہ قصبہ، گاؤں گاؤں ناکوں
اور مخبروں میں سلطانہ ڈاکو نامی ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا اور شیخ جی اس کے ہیرو تھے۔ اور اب اکل حلال اور صدق دل کے بڑے قائل، منتظم اور
جتن میں ہمیشہ سے ہی تھے ورنہ پچھتر روپے ماہوار تنخواہ میں سے ریٹائر ہونے پر ایک لاکھ اکیاون ہزار کیسے بچا کر لائے۔
اب اس زمانہ ملازمت کی ایک لاکھ اکیاون ہزار جیب میں سے کتنے شیخ کے اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی کے تھے اور کتنے دوسرا
شادی کے جہیز کے۔ یہ شیخ جی ... کی نئی بیاہی سونے کی چڑیا لائی ہو گی جس کو مقدمے کی پیروی کے دوران ہی میں انھوں نے ٹیک رکھا ہے

لگا دیا تھا جس کا ظہور ریٹائر ہونے کے بعد مشرف بہ اسلام اور نکاح کی پاک صورت میں ہوتا اور اب تو رقم جہیز اور رقم تنخواہ سب کی سب ایک ہو کر پاک تجارت میں لگ گئی تھی۔ شہر کی اناج منڈی اور سبزی منڈی اور میٹ مارکٹ کا ٹھیکہ، چنگی کوڑے کے پڑاؤ اور گھنٹہ گھر کا ٹھیکہ، بازار میں ہیڈ کانسٹیبل کے زمانہ کی خریدی ہوئی بڑے لڑکے کے نام دکانوں کی قطار، سول لائن میں تھانہ داری کے زرین دور کی تعمیر کوٹھیاں جگہ جگہ زرعی جائداد کا میں حصے، سب بڑے کے انتظام میں تھے اور شیخ جی اللہ اللہ کرتے، محلہ کی عورتوں کو تعویذ گنڈے دیتے، محلہ کی مسجد میں چراغ جلواتے اور جب کوئی مصیبت زدہ آتا تو اسے وظیفہ بھی بتاتے اور اگر کسی پولیس ہیڈ کانسٹیبل یا تھانہ دار پر رشوت یا امانت جرم وغیرہ کے سلسلے میں دفعہ لگا کار وائی ہوتی تو جس طرح عرب میں بدو قبائل کا شیخ اپنے قبیلہ کے بعض جانے پہچانے تدبر سے بچاؤ اور رہائی کی ترکیبیں بتاتا ہے شیخ جی ان تمام برکتوں کے علاوہ کوئی موثر جلالی وظیفہ بھی بتاتے اور مصیبت زدہ اگر چندہ دہندہ ہوتا تو زوردار منتر۔ اور اس سلسلے میں اگر کوئی پرانا ساتھی تھانہ دار، ہیڈ کانسٹیبل کسی اہم مسئلہ میں ان کی رائے طلب کرتے تو نہ صرف قانونی مفید مطلب مشورہ ہی دیتے بلکہ پرانی وضعداری میں عملی مدد بھی کر دیتے اور اس اہم معاملہ میں مشورہ کے لئے کوتوال صاحب اپنے پرانے استاد شیخ جی کی خدمت میں حاضر ہوئے جن کی فیض تربیت سے وہ آج اس درجہ پر پہنچے تھے اور اس پرانے ماہر نفسیات جرائم اور جدید شناور راز قدرت خدا رسیدہ بزرگ نے سب روئداد سن کر کوتوال صاحب سے سوال کیا "کمشنر صاحب بہادر کے سائیس سے تو آپ کا سلسلہ ہوگا ہی ہوگا۔"

"جی آپ ہی نہیں جانتے، سلسلہ کیا تنخواہ ہی دیتا ہوں اور گھوڑی کا سب .... "

"ہاں ہاں میں سمجھ گیا، تو پھر ذرا اسے میرے پاس لے آئیے، اور میں اس سے ایک بات کر لوں ذرا۔ ویسے میں آپ ہی کو بتا دیتا مگر آپ شاید اسے سمجھا نہ سکیں اور وہیں بیٹھے بیٹھے کوتوال صاحب نے کمشنر صاحب کے سائیس کو بلوا بھیجا

(۸)

اور دو روز میم صاحب کا خواب و خور حرام رہا۔ پھول اضلاع کے ڈاکٹر مویشی جمع ہوئے اور کلکٹر نے اگلا سیدھا پاؤں زمین پر نہ ٹیکا، نہ مرہم نہ چوٹ، مالشیں اور انجکشن ہوئے مگر گھوڑی اصطبل کے اندر کھڑے کھڑے تین ٹانگ کی رہ گئی۔ بیطاروں نے نظر کا اثر بتایا۔ تھوڑی بہت جھاڑ پھونک کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی، اور تیسرے روز میلہ کی گھوڑ دوڑ بھی ہوگئی اور سجہ جیت بھی گیا اور جیت کو صبر کرکے میم صاحب گھوڑی کی خیر مانگنے لگیں۔ ہفتہ بھر کے بعد ایک بوڑھے ڈاکٹر مویشی نے حوصلہ مستقل طور پر گھوڑی کے لنگڑی ہونے کے بعد اصطبل پڑے رہنا تھا، نعل بند کو بلوایا، نعل بند نے نعل اکھیڑا اور ایک ٹیڑھی نعل کی کیل سم میں سے برآمد کی جو غالباً کھڑے کھڑے ٹاپیں مارنے کے سبب ڈھیلی ہو کر باہر آئی تھی اور پھر ٹیڑھی ہو کر کچے سم میں گھس گئی تھی اور گھوڑی کے پاؤں کو بیکار کر دیا تھا۔ گھوڑی چنگی ہوگئی اور کوتوال صاحب نے خوش ہو کر نعل بند کو ایک سو روپیہ انعام بھی دیا اور کوتوالی کے کام کے علاوہ پولیس لائن کے سب جانوروں کے نعل ٹھونکنے کا ٹھیکہ بھی دلایا۔

اور اس وقت تو ٹل گئی اور بس ٹل ہی گئی تھی شیخ جی کی ایک کرامت میں کوتوال صاحب کو سانس لینے اور سوچنے کا موقع مل گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ "اپنی بیچے سو برس کی عمر مگر یہاں تو سہ ہی دن بعد کوتوال صاحب کو پھر وہی دن تھا" بچہ زر سے ہاتھ نہ آسکتا تھا، زور سے ہاتھ نہ آسکتا تھا زاری سے ہاتھ آنہ سکتا اور بجز "پھندے" کے اور کوئی شکل ہاتھ آنے کی نہ تھی اور کوتوال صاحب کے ہاتھ میں ساری عمر پھندے ہی پھندے رہتے ہیں تعزیرات ہند کی صندوقچی میں پانسو بارہ پھندے لارڈ میکالے بنا کر کوتوال صاحب کے ہاتھ میں دے گئے ہیں، کوتوال نے ہر پھندا نکال نکال کر آزمایا، قتل، ڈکیتی، بغاوت، بلوہ، فوجداری اور کیا کیا اور شیخ کے مشورہ کے لئے سامنے ڈالا کیونکہ باوجود دو سالہ کوتوال ہونے کے بھی شہر اور متعلق علاقہ کو کوتوال صاحب اتنا نہ سمجھے ہوئے تھے جتنا شیخ جی کی نظر میں تھا مگر سنگین سے سنگین اور پیچیدہ سے پیچیدہ پھندا شیخ جی کے نزدیک اوچھا تھا اور شیخ جی ہمیشہ استادانہ تیوروں سے یہی کہتے رہتے "ٹھہرو" اور ایک روز جب ایک نہایت ہی سنگین کیس قتل و ڈکیتی کا تراش کر کوتوال صاحب شیخ جی کے سامنے لے گئے اور شیخ جی ایسے آہنی پھندے پر بھی وہی اپنی استادانہ "ٹھہرو" کہی تو کوتوال صاحب جھلا گئے ——— استاد آپ کی ٹھہرو نے مارا اور یہ وقت کر دیا۔ اب وہ یار بار کا ٹھنڈی ہانڈی نہیں چڑھے گی اور تین مہینے بعد گھوڑ دوڑ

سر پہ ہوگی:"

اور بوڑھے تجربہ کار ریٹائرڈ پولیس آفیسر نے کہا: "عزیز القدر جتنی تمہاری عمر ہے اس سے زیادہ میری سروس ہے، اور پھر تمہیں اس ضلع میں چھ سات دن ہوئے ہیں اور یہاں بالکل ضلع رہتے ہوئے ہیں اور پھر میں اس ضلع کا تو باشندہ ہوں اور چودھری کو چودہ پشت سے اس لونڈے تک پہچانتا ہوں جسے بچو میاں کہتے ہیں، اول تو چودھری شروع ہی فکریوں چھکنے کا نہیں، اور پھر یہ لونڈا، یہ بچو میاں نہیں "بچھو میاں" ہے۔ یہ باپ سے زیادہ قابو یافتہ ہے اور بڑا ہی خودسر بس سمجھ لو کہ آج کا بچو اور کل کا سانپ ہے، ابھی کالج سے نکل کر سیدھا نہیں ہو پایا ہے کہ لیڈری کی باگ ڈور پکڑنا چاہتا ہے، اور ان حالات میں اولیس گڑھ تو بڑی چیز ہے اور قرب و جوار کے مواضعات کا تو ذکر کیا میاں ضلع بھر کے اندر چودھری کے خلاف ایک سچا گواہ بھی پیدا ہونا ممکن ہے اور اگر کسی بد منطقے، ہسٹری شیٹر کو پکڑ کر الٹا سیدھا عدالت تک لیا کر کے لے بھی آؤ تو کون گارنٹی کر سکتا ہے کہ اندر جا کر الٹی نہ الاپے،"

"تو پھر کیا مطلب ہے آپ کا قبلہ، یعنی پھر ــــــ اس خوف میں کوئی پھندا پھینکیں ہی نہیں؟"

"نہیں میاں، میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی ادھا پھندا پھینکو گے تو الٹا اور سر ہو جائیگا۔ اور لونڈا یہ چیز کہ اس طرح کمشنر صاحب کی گھوڑی کو جتانا چاہتے ہیں عدالت میں تمہارے ہی پیش کردہ گواہوں سے کہلوا لے گا اور پھر سمجھ لو کہ معاملہ کس قدر خراب ہو جائے گا اور کیا عجب کہ اخباروں تک نوبت پہنچے تو میرا مطلب یہ ہے کہ کمشنر صاحب بہادر پر آپ کی اس تمام سرگرمی کا اتنی بدنامی کے بعد کیا اثر پڑیگا۔"

"تو پھر کیا ہو؟" کوتوال صاحب نے کہا۔

"شہرو!" شیخ جی بولے اور کوتوال صاحب نے ذرا طفلانہ انداز بنا کر ناز کے ساتھ بسورتے ہوئے کہا "استاد آپ کی شہرو نے مارا، اور دیکھئے روز روز ایسے پھندے ہاتھ نہیں آتے بنا گٹھا ہوا کیس (۳۰۲) اور (۳۹۲) کا آجکل میرے ہاتھ میں ہے۔"

"میاں تم بچہ ہو میں سمجھتا ہوں کہ اگر تم سنگین سے سنگین وار بھی دیہات میں چودھری پر کرو گے تو مونہہ کی کھاؤ گے اور اس کا کچھ بگاڑ بھی نہ سکو گے اور وہ خیر تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے مگر گندگی تو اتنی اچھالے گا اور گھوڑ دوڑ کی بات کو اتنی شہرت دے گا کہ کمشنر صاحب اور ان کی میم صاحب کو وہ میڈم کلوڈیا کے ہار جانے سے زیادہ کھلے گی اور وہ چودھری سے تو کچھ بھی نہ کہیں گے اپنی بدنامی پہ تمہاری گنجی لگا دیں گے۔"

"ہاں تو یہ تو میرے دماغ میں شروع سے ہی ہے کہ یہ کام نہایت خوبصورتی سے بہت خفیہ طور پہ ہونا چاہیئے لیکن پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"ہم سوچ بیٹھے ہیں، اور ہم جانتے ہیں کہ یہ بھی ہمارے ہی ہاتھوں انجام ہوگا، اور تم دو سال سے کوتوال شہر ہو، پہلے تو تمہارے پاس اتنا دماغ نہیں کہ اتنی دور کی کوڑی لا سکو اور اگر تمھیں سمجھا بھی دوں تو باوجود کوتوالی کے بھی ہم سمجھتے ہیں کہ تم اس کے لئے مواد فراہم نہیں کر سکتے، اور وہ تو سب اس جناب کے ہی ہاتھوں۔"

"تو پھر بتائیے نا استاد" کوتوال صاحب نے شاگردانہ انداز میں کہا۔

"بتانا کیا تم دیکھ ہی لو گے، ایک مختصر بات یہ سمجھ لو کہ چودھری پہ دیہات کے اندر تمہارا ہر چھوٹا سچا وار ناکام ہوگا اور حلق کی ہڈی بن کر اٹک جائے گا اور یہ مرغا تو ہم جانتے ہیں شہر ہی میں پھنسے گا اور یاروں کے ایک ہی جھٹکے میں بچہ کے باپ تک کو یاروں کے گھر پہنچا جائیگا۔"

"کچھ تو بتاؤ استاد" کوتوال نے کہا اور پھر ذرا زانوئے ادب تہہ کرتے ہوئے پہلو بدل کر بولے "اور استاد ہم نہیں سمجھے۔"

"ابھی تم سمجھ جاؤ تو پھر استاد، استاد کاہے کے، مگر یہاں تمہارا یہ کام ہمارے سر، لیکن اس مرتبہ ہمارا کام بھی ہو جانا چاہیئے۔"

"ہاں وہ آپ کے لڑکے کے سلیکشن کے متعلق، میں پچھلے سال ہی کپتان صاحب کے کان میں ڈال چکا ہوں۔"

"لیکن ہوا تو نہیں، کپتان صاحب نے ضلع سے نام بھیج دیا اور وہاں کمشنر صاحب نے سونگھا بھی نہیں۔ اب پہلے کپتان صاحب کلکٹر صاحب اور کمشنر صاحب کے درمیان یہ چیز طے کرا لیجئے کہ ضلع سے تو نام جائے گا ہی جائے گا۔ تھانہ داری کے سلیکشن میں کمشنر صاحب بہادر

اس کو اپنا تاسے فی (Hominine) رکھیں"۔

"یکھی دیکھئے تو استاد آپ تو جاننے والے آدمی ہیں۔ میں ایک تھانہ دار ہی تو ہوں اور افسران بالا سے ایک مخصوص دائرہ کے اندر ہی کہہ سکتا ہوں" کوتوال صاحب نے کہا اور شیخ جی نے ذرا رکھائی کے ساتھ جواب دیا "جی نہیں جناب یہ جھوٹ ہے اور یہ باتیں آپ کسی اور کو بتائیں، ہوں، بقول شخصے عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں، برخوردار اپنی جناب کانسٹیبل سے چل کر تھانہ دار تک پہنچے اور کوتوالی کی ہم نے بھی ہے اور نہ معلوم کتنی مرتبہ ان کانوں پہ سے سلطانہ اور رضیا اور علی محمد خاں کی گولیاں سنسنا کر نکل گئیں اب بھی آپ یہ باتیں نہ سنائیے کام کیجئے اور کام لیجئے"۔

"تو دیکھئے استاد میں کہہ تو سکتا ہوں، وہ بھی کپتان صاحب بہادر سے۔

"اب کیوں کہو انتے تھوا یہ باتیں اس سے کر دو جو جانتا نہ ہو۔ ٹھیٹھر وں ٹھیٹھروں بدلائی نہیں ہوا کرتی کوتوال صاحب اور جو یہ روزانہ صبح تڑکے گھوڑے پر سوار ہو کر سو روپے جیب میں ڈال کر کپتان صاحب کے بنگلہ پر شہر کی خیریت سنانے جاتے ہیں بس ایک روز روپیہ ہاتھ میں دیتے وقت میم صاحب کہیئے کہ یہ چیز لے کرائیں' خیر صاحب کے اور آپ کے درمیان ہم جانتے ہیں کہ دفتر میں پردہ رہتا ہے مگر میم صاحب صبح ہی صبح سو روپے کے نوٹ گنتے وقت تو روزانہ ملتی ہوتی ہیں آپ کے سامنے"۔ کوتوال صاحب کچھ چپ سے ہو گئے اور ایک گھونٹ لے کر شیخ جی نے پھر سلسلہ کلام جاری کیا اور ہمارے زمانے میں ایک گنی جایا کرتی تھی روزانہ کوتوالی سے، سستا زمانہ تھا اور بس جواب ہوئی میم صاحب کو ایک ذرا اشارہ دے دیا، صاحب کو دفتر میں سیلوٹ جھاڑا خیریت دی اور لوٹ آئے اور کام ہوا ہوایا ملتا تھا۔

کوتوال صاحب نے گہری سانس لی اور بولے "بہتر ہے"

"تو پھر جانیئے چودھری کو مع گھوڑے کے پھانس دینا ہمارا ذمہ ہے اور بغیر آپ کی جیب سے ایک پیسہ بھی خرچ ہوئے گھوڑا کھٹا کھٹ سرپٹ آئے گا تمہارے تھان پر اور پھر جو چاہو کرنا' ایسا معاملہ گانٹھوں کہ پہلے تو عدالت تک نوبت ہی نہ آئے اور تمہارے ہی ہاتھ سے فیصل ہو۔ اور بفرض محال نوبت آ بھی جائے تو پوری مقدمہ کی ترتیب میرے ذمہ رہی مگر دیکھئے سلیکشن پہلے ہے اور بھئی اس کا انتظام ہو جانا چاہیئے"۔

"بہت بہتر"

"تو پھر جانیئے لگام لگ گئی سمجھ لیجئے۔ چودھری صاحب گھوڑا دیں اور ہاتھی کی ضرورت ہو تو ہاتھی دیں گھر بلا کر" شیخ جی نے شدید استادانہ انداز میں کہا اور کوتوال نے خوش ہو کر اپنے استاد کی جانب دیکھ کر ذرا احسان مندی اور سعادت مندانہ احساس کمتری کا انداز بنایا اور لپک دم ان کے ایام جوانی کی مہمات اور روایات یاد کیں جو آج تک سب نئے پرانے تھانہ داروں میں زبان زد اور ضرب المثل تھیں اور شیخ نے اس کا اندازہ کر کے کہا "میاں کوتوال صاحب بہادر ماشاء اللہ حاکم وقت ہو، مگر ابھی لڑکے ہو، اور ہم نے تیس برس اس گلی کی خاک چھانی ہے اور بڑے بڑے ریاض کئے ہیں۔ تم اگر کوتوال شہر ہو تو آج اناج منڈی سے لے کر کھنڈی کے پڑاؤ تک کے ٹھیکے دار ہم بھی ہیں۔ مگر میلے سے پہلے پولیس ٹریننگ اسکول کا سلیکشن ہے اور بات پکی ہو کر سلیکشن کا پروانہ ہمارے ہاتھ آ جانا چاہئے جب بات بنے گی۔

"سمجھ لیجئے استاد آ گیا آپ کا لڑکا" کوتوال نے کہا اور چل پڑے اور چلتے چلتے شیخ جی نے کہا "تو پھر کوتوال صاحب سمجھ لیجئے کہ گھوڑا بھی آپ کے تھان پر بندھا ہے چاہیں دوڑانا اور دوڑا کر کٹانا یا [illegible] سے کٹانا اور یار لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرا [illegible] ہوگا اور اگلے مہینے کی تیرہ تک گھوڑے کی باگ ڈور تمہارے ہاتھ میں ہوگی انشاء اللہ" شیخ جی نے استادانہ غرور [illegible] زیادہ ادبیانہ انداز میں جیسے کشف کے زور سے کہا۔

(۹)

اویس گڑھ شہر سے سات میل کے فاصلہ پر تھا اور چودھری شہر ایسے ہی آیا جایا کرتا تھا جیسے چودھری لوگ آیا جایا کرتے ہیں اور رات گذارنے کا تو سال میں تین ہفتے کے سوا سوال ہی نہ ہوتا تھا جب نمائش لگا کرتی تھی اور ضلع کے اور سب رئیس زمیندار تو نمائش کیمپ لگاتے تھے مگر چونکہ چودھری چھوٹی چودھرائن کو ساتھ لایا کرتا تھا لہٰذا ایک دیہاتی ٹھاکر دوست کا خالی مکان جو اسی غرض کے لئے مخصوص تھا کہ دیہاتی دوست احباب عدالتوں اور مقدمہ بازیوں کے سلسلے میں آ کر قیام کیا کریں نمائش کے پورے ہفتے چودھری کے لئے مدتوں سے عاریتاً ریزرو تھا اور نمائش کا قیام ہمیشہ سے اسی میں ہوتا چلا آیا تھا۔ شہر میں نمائش لگی ہوئی تھی۔ چودھری، چھوٹی چودھرائن، لڑکے، نوکر چاکر سب مقیم تھے۔ سیر و تفریح، خرید و فروخت اور ہی تھی، چودھری تو خیر شام کے وقت گھنٹہ دو گھنٹہ کو گھومنے کو جایا کرتا اور اپنے شہری دیہاتی دوستوں کے ساتھ تھوڑی بہت تفریح خرید و فروخت کر کے چلا آتا مگر لڑکے اور ان کے نوکر صبح کے نکلے کہیں رات کے بارہ کے اردگرد پہنچتے۔ تمام دن چودھری، چودھرائن، ایک بوڑھی ماما اور ایک بڈھا نوکر مکان میں رہتے اور اس لق و دق مکان کی تنہائی میں تمام دن چودھری، چودھرائن دن دہاڑے خلوت کے مزے لوٹتے اور نمائش کا پورا ہفتہ ہنی مون ہی گذارتے۔

گیارہ بجے دن کا وقت تھا، لڑکے بڑا ناشتہ کر کے نوکروں کے ساتھ نکل گئے تھے اور چودھری چودھرائن دس بجے کے گئے گئے ابھی غسل خانہ سے ساتھ ساتھ غسل کر کے برآمد ہوئے تھے اور چودھرائن دھوپ میں بیٹھی بال سکھا رہی تھیں۔ چودھری کنگھی کر کے اور مونچھیں چڑھا کر فارغ ہو چکا تھا اور چودھرائن کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ نیچے کی منزل میں ماما کھانا پکا رہی تھی کہ چودھری کے کان باہر سڑک پر سے آتی ہوئی مختلف آوازوں پر چونکے اور چودھرائن سے پوچھا "بلا (ملازم کا نام) باہر مردانہ میں ہے نا؟"

اور چودھرائن نے بال جھاڑتے ہوئے نیچے سر جھکائے ہی جھکائے کہا "ہوں، ذرا ابھی پان لانے بازار گیا ہے شاید۔" اور چودھری کے کان پھر آوازوں کی جانب چونکے اور وہ آہستہ سے اٹھ کر مردانہ زینے کی جانب سے چپ چاپ اتر گیا اور خاموشی کے ساتھ پھاٹک کے کواڑ کی آڑ میں کھڑا ہو کر سننے لگا۔

"اور پھر لوٹا! جاؤ جہان پوت پوتوں والا۔"

"بے ڈاڑھی جے کرتوت۔"

اور چودھری نے محلہ کی مسجد کے پیش امام کی آواز پہچانی جس کے پیچھے وہ ظہر عصر کی نماز مسجد میں جا کر پڑھا کرتا تھا "کیا ہوا بھائی بنو خان، کیسا شور تھا؟"

"ارے کیا بتاؤں ملاں جی چودھویں صدی ہے چودھویں، ارے یہ پہلوان بیٹھے ہیں اور ہم ایک ایک بیڑی جلا کر نہیں پی پائے ہیں کہ وہ بھنگی نکل کے گیا ہے جھاڑو بغل میں لئے پھاٹک میں سے اور جب تک اندر جھنگیا پھینک دی؟"

"ارے ہی تو آواز سن کر میں حجرہ سے نکلا۔ کس نے کس نے!؟"

"چودھری — اوں، آں۔ ہاں ملاں جی بھیا وہ تو چودھری کا نام لینی گئی ہے کھلم کھلا۔ ہم سب بیٹھے ہیں کیوں جی لالہ۔"

"ہوں" چاٹ کے خوانچے والے نے کہا۔ "بڑا جانور (زمانہ) ہے۔ آدمی کی نیت جرا (ذرا) دیر میں ڈگت ہے۔ جانے پتہ نا ہیں بتائے پائے ہیں کہ بھنگی نکلا ہے جدنور (جب تک) ابھی یہ دے پکی پھر بھیا چودھری ٹھہرو، چوکسے رہتا ہے۔ کل جگ ہے کل جگ۔"

"چہ چہ چہ!!! قرب قیامت ہے" پیش امام نے کہا۔

"ابھی یہ اویس گڑھ تھوڑی ہے کہ آج بھنگن کپٹی کل چمریا، مزہ آجائے گا جی!" شاید امرود کے ٹوکرے والا بولا۔ اور چودھری ٹھنڈا بھاہا دیہاتی زمیندار تھا بگولے کی طرح دماغ ناچنے لگا اور کواڑ کی آڑ سے باہر قدم نکالنا چاہا مگر حرکت پیچھے کو ہوئی اور پلٹ کر مردانہ مکان کا صحن پار کر کے اندر آیا اور ہکلاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ابھی یہاں بھنگی گئی ہے کیا کر؟"

"ہاں میاں ذرا دیر ہوئی تو گئی تو ہے۔"

اور چودھری کی آواز سن کر اوپر سے چودھرائن بولیں "ہاں میاں، یہ تو میں آج صبح میاں ڈرائیور کا پہلے کہنا بھول گئی کہ بنارسی دکان کی خبر لائے کہ آؤ لڑکی کہ نہیں سنتے ہو شام کو ذری نگاہ ڈال لیجو۔ پھر یہ اس کی دو دلہن کا جوڑا جس دن نمائش زنانی ہوگی خود جا کر تیار کرا دوں گی۔ مرنا بھی کی بہو کے ساتھ، اور ہاں ذری یہ تو بتاؤ اور ہوگی کس دن زنانی؟" اور پار سال کر تو میری دولہن آپ آکر پسند کرے گی اپنے اور میرے لئے۔"

اور چودھری پھر چپ چاپ باہر کو چلا اور پھاٹک کے سامنے سے اس کے چکراتے ہوئے سر اور اونگھتے ہوئے کانوں میں ٹیلیفون کی سی آوازیں آئیں "پکی چن کی حد! ہے" توبہ توبہ!" اور وہ سیدھی گئی ہے کوتوالی!" اور اس نے خالی نشست گاہ میں نظر کی دل میں اور جھنجھلایا "خدا غارت کرے اس نمک حرام بلا کو! غائب ہے! کچھ خبر ہی لاتا کیا طوفان ہے!؟" اور اتنے میں ملازم افتاں و خیزاں متوحش ہکا بکا ہوا آیا اور جیسے دم بخود مالک کا چہرہ دیکھنے لگا گویا منتظر ہے کہ سرکار کچھ پوچھیں اور چودھری نے اس کی جانب نگاہوں سے دیکھا کہ کچھ کہے اور ملازم لڑکھڑاتی زبان سے بولا "میاں۔ وہ۔ میں میں تو ابھی ذرا ڈھول لینے چلا گیا تھا سو باہر نہ معلوم کیا۔ ہوں۔ وہ۔ آں۔"

"بات بتاؤ کیا بلا ؟؟!"

"نہ معلوم کیا کیا، اول فول بک رہے ہیں سب لوگ کہ وہ وہ تو کوتوالی گئی!"

"مہترانی— ایں — کون کون! چودھری نے کہا۔

"جی ہاں میاں مہترانی —" اور چودھری کی جانب مشتبہ نظروں سے دیکھا اور چودھری کی نگاہیں جھک سی گئیں اور ملازم نے نہایت سادگی سے کہا "پھر میاں اسے جانے ہی کیوں دیا، پھاٹک بند کیوں نہ —"

"اونھ! کیا بکتا ہے!"

اور نوکر نے کہا "ہاں میاں دیکھئے نا۔ میں تو اسے بھنگی کی جھاڑو لگانے چھوڑ گیا تھا اور بھنگیا مجھے بھاگا، پر گھستی ہی ڈبالے" ادھر باہر محلہ والے اور خوانچے والے نہ معلوم کیا کیا بک رہے ہیں — وہ رو رو پیٹتی نام لیتی گئی ہے؟"

اچھا تم پھاٹک بند کر دو اور ملازم پھاٹک کے کواڑ تک پہنچا ہی تھا کہ رک گیا اور کوتوال صاحب ارجن سنگھ کانسٹیبلوں کے ساتھ بلا دھڑک اندر گھس پڑے۔ اور چودھری کے گرد حلقہ کر لیا اور کوتوال صاحب بہادر نے کہا "آپ کے خلاف مساۃ سندریا زوجہ بدھوا خاکروب نے الزام دفعہ (۳،۹) تعزیرات ہند، زنا بالجبر رپورٹ گذرانی ہے اور آپ زیر حراست ہیں" زمانے کے گرم و سرد دیکھے ہوئے بوڑھا چودھری جیسے سے خطرہ کی بو بھی سونگھ چکا تھا بدحواس سا ہو گیا اور گھونٹ سا لینے لگا۔ کوتوال نے متانت کے ساتھ کہا "اچھا، آپ ایک گلاس پانی پی لیجئے۔ اور چلئے وہاں بیٹھ کر اظہار دیجئے۔ اور چودھری نشست گاہ میں چوکیوں پر بیٹھ گیا اور سپاہی ارد گرد کھڑے ہو گئے۔ کوتوال صاحب نے مونڈھا گھسیٹ لیا۔ ملازم نے جلدی سے ایک گلاس پانی دیا اور چودھری نے ایک گھونٹ لیا اور کوتوال صاحب نے ڈائری کھولی اور قلم ہاتھ میں سنبھالتے ہوئے پھر اسی لہجے میں دہرایا "آپ کے خلاف مساۃ سندریا زوجہ بدھوا خاکروب نے الزام دفعہ (۲،۶) تعزیرات ہند کی رپورٹ درج کرائی ہے کہ آپ نے اس کے ساتھ نشست گاہ کی پچھلی کوٹھری میں ارتکاب جرم زنا بالجبر کیا آپ کیا جواب دیتے ہیں۔ اور چودھری لاجواب سا تھا۔ اندر سے ماما بھی آئی تھی، وہ ڈر کر چودھرائن کو خبر سنائی اور ماما نے پلٹ کر چودھرائن کا حکم نوکر کو سنایا کہ بہت جلد نمائش سے لڑکوں کو بلا کر لائے۔

اور جب چودھری نے بمشکل نفی میں حلق سے پوری قوت سے کر آواز نکالی تو کوتوال صاحب نے چند منٹ توقف کیا اور اپنی ڈائری میں مساۃ سندریا زوجہ بدھوا خاکروب مستغیثہ ہسپتال سے ڈاکٹری معائنہ سے فارغ ہو کر آگئی اور چودھری نے آٹھ پندرہ دن کی مکان کی ملازمت میں پہلی مرتبہ اپنی شوخ چشم، دیدہ دلیر قطامہ مدعیہ کو دیکھا جس نے اس پر آج مدعا علیہ ہونے کا دعویٰ کیا تو اس مساۃ کے بیانات چودھری کے گرد رپورٹ کی لفظ بہ لفظ تائید میں ہوئے کہ وہ نشست گاہ میں جھاڑو لگا رہی تھی اور چودھری نے اس سے اس کو کوٹھری میں جھاڑو لگانے کو

کہا اور جب وہ اندر پہنچی تو پیچھے سے خود پہنچ گیا اور اسے پکڑ کر زمین پر گرا لیا .... وغیرہ وغیرہ، اور اس کے شور مچانے پر رحمتی چاٹ والا اور مجو امرودوں والا آ گئے جو پھاٹک میں تھے اور جب ان دونوں نے شور مچایا تو اور بہت سے گلی میں سے اندر آ گئے ـــ اور کوتوال صاحب نے ایک کانسٹبل کو اشارہ کیا اور پھاٹک کے سامنے سے سنجو امرود والا، رسول چاٹ والا، نبو خاں کبابی، جمن خاں پہلوان، الٰہی بقر قصاب، اور قدو حمال سب گواہوں کو بلا لایا۔ اور کوتوال صاحب نے دو تین معزز گواہوں کے سامنے اندر جا کر "موقع واردات" کا معائنہ کیا۔ اور جگہ جگہ فرش پر سے "زندہ ثبوت واردات" یعنی بکھرے ہوئے در نایاب کھرچ کھرچ کر مع تھوڑی تھوڑی فرش کی پپڑی کے نہایت احتیاط کے ساتھ ایک ڈبیہ میں جمع کرتے اور باہر آ گئے۔ ہسپتال کی "رپورٹ معائنہ" دیکھی اور قیافہ شناس کوتوال گھستے ہی بھانپ گیا تھا اور پھر کھانے کے گال اور نہانے کے بال یوں ہی نہیں پکتے ہیں۔ اور یہ تو اس کے علم میں تھا کہ چھوٹی چودھرائن ساتھ ہیں اور گھر میں چودھری چودھرائن اکیلے ہیں چودھری کو تازہ غسل کئے دیکھ کر بیدار مغز تجربہ کار کوتوال نے مزید زندہ ثبوت فراہم کرنے کی امید موہوم میں اندھیرے کے اندر چھپا ایک تیر پھینکا اور ضابطہ میں خانہ تلاشی کا حکم دیا اور قاعدے کے مطابق پہلے خود کو خانہ تلاشی کے لئے پیش کیا اور پھر کانسٹبلوں کو اور نیچے کی منزل کی تلاشی تو یوں ہی چلتی پھرتی لی بالاخانہ پر پہنچا اور اپنے قیافہ کی جو لیں بھڑا، غسل خانے میں چودھری کا اور چودھرائن کے ذرا دیر پہلے کے اتارے ہوئے کپڑے لے چلے پڑے تھے اور ان میں سے چودھری کا پائجامہ علیحدہ کیا اور سیون سیون بغور دیکھ کر چودھری کی ذات کے مزید دھبے مارک کر کے گویا تحقیقات کی مسل کا پیٹ بھر کے پائجامہ ساتھ لے آیا اور دھبے ثبوت پر چسپاں کر دیئے اور پھر سب نشست گاہ میں جمع ہوئے۔ ایک کانسٹبل کو اشارہ کیا اور اس نے اپنے جھولے میں سے بھگن کا لہنگا برآمد کیا "جو ارتکاب جرم کے وقت مسماۃ کے جسم پر تھا" اور اس کا ایک پلندہ بنا کر فولاد خاں کانسٹبل سے روبرو گواہاں لاکھ بتی سے سیل مہر کر دیا اور پھر چودھری کا پائجامہ اور "موتیوں کی ڈبیہ" کا ایک پلندہ بنا کر روبرو گواہاں کرنے سنگھ کانسٹبل سے لاکھ بتی سے سیل مہر کرا لیا اور پھر دونوں بنڈل ایک پلندے میں جمع کر کے عدالت میں ... A . B . Exhibit بنا کر پیش کرنے کے لئے کیمیکل اگزامنر کے پاس بھیجنے کو تیار کر دیئے اور فرد تلاشی پر گواہان تلاشی کے دستخط لے لئے ـــ اور یہ سب کام مکمل کرنے کے بعد ذرا تحکمانہ انداز میں سپاہی سے کہا "ہتھکڑیاں چڑھاؤ" اور چودھری سے تشریف لے چلنے کو کہا ـــ بدحواس چودھری نے لڑکوں کا انتظار کرنے کو کہا مگر وہ مجبور تھے کیونکہ عدیم الفرصت تھے لیکن چودھری کے بار بار کہنے پر بیچارے کو وقت نکالنا ہی پڑا اور اس فرصت کے وقت میں کوتوال صاحب نے چودھری کی ہتھکڑیوں کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی اور کانسٹبل ہٹا دیئے اور تخلیہ میں معاملہ والی بات ہوئی اور ہزار دو ہزار پر لات مار کر کوتوال نے گھوڑا طلب کیا اور تھوڑی سی رد و کد کے بعد چودھری کو ہاں کرنی ہی پڑی مگر لڑکوں کے مشورہ پر مشروط معاملہ لڑکوں کی آمد تک ٹھنکا رہا اور ہتھکڑیوں کا قفل کھلنے ہی والا تھا کہ لڑکے بھی آ گئے۔ تذکرے سے معاملہ کا خلاصہ تو تماشائیوں ہی میں معلوم ہو گیا تھا۔ باپ کو اس ہیئت کذائی میں دیکھ کر چھمن میاں اور ممن میاں دونوں بڑے تو درکنار، منہ زور اور بیباک چھٹو میاں بھی ایک دفعہ گھبرا گئے۔ خیر بیٹوں کے آتے آتے باپ کی ہتھکڑیاں کھل گئیں اور مشورہ کے لئے اندر جانے کی اجازت بھی دی گئی، ہتھکڑیاں کھلوا کر چودھری تینوں بیٹوں کے ساتھ زنانہ نشستگاہ میں گیا۔ چودھرائن بھی بڑھاپے میں روز روشن کی خلوتوں کے سب ارمان بھول کر بالاخانہ سے نیچے اتر آئی تھیں اور بیچاری استغفار پڑھ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی معافی اور اپنے شوہر کی عزت مانگ رہی تھیں اور گھڑی گھڑی ماما سے باہر کی خبریں منگا رہی تھیں۔ شوہر کو آزاد دیکھ کر لال بھبوکا ہو گئیں۔ یہ بھی نہ خیال کیا کہ جوان بیٹے ساتھ ہیں برس پڑیں ہے ہے مردود تمہارے زور کی لنگوٹا شیطان ذرا دیر میں ڈگا گیا ہے، اچھے بھلے! اور میں مونڈی کاٹی تو بال بھی نہ کھا پائی اور نہ معلوم کس وقت (وقت) بلی کے سے پاؤں وہاں پہنچ گئے اور وہ دال خصم پیٹی گو کی پوٹ ـــ ہوں! خدا بچائے موئے شیطان سے! ـــ پھر ہے ہے مردود تمہاری نیت کو کیا کہوں!"

...... اور چودھرائن کچھ اور بھی کہتیں مگر چھمن میاں نے جھلا کر کہا "امی جان کیا ہے! بس چپ بھی رہئے! نہ سمجھیں نہ بوجھیں، بات کرنے دیجئے ذرا" اور چھمن میاں کی اماں بیچاری کیا سمجھتیں جب ابا ہی غریب کی سمجھ میں کوٹھڑی کے اندر بکھرے ہوئے "گوہر ہائے نایاب" کی تازہ شان نزول سمجھ سے کم نہ تھی جو کہ مع چودھری کے خلاف ثبوت کے بیش بہا موتی کوتوال صاحب کے ہاتھ لگے تھے اور جن کی وجہ نزول چند منٹ پیشتر

کو بہ چلی ہیں وہاں سے پھاٹک سے نکلتے ہوئے بجلی کے علم میں تھا، پھر چند منٹ بد جیتی چلاتی گنسد گی اچھالتی پھاٹک سے نکلتی بیگن کے علم میں تھا اور سب سے پہلے بیگم ہی کے علم میں آئی تھی اور شہر کے تو خیر ابھی نمائش سے بھاگے ہوئے آ رہے تھے اگرچہ چودھرائن بیچاری ناقص العقل نے شوہر کے چند منٹ کے لئے غائب ہو جانے پر اندر سے باہر جانے پر دیکھا سمجھ لیا جو بہت دنوں سے کوتوال صاحب سمجھے ہوئے تھے تو بیچاری کا کیا قصور؟ چودھری غریب چودھرائن کے اخلاقی و مذہبی لیکچر پر جیسے (Red Handed) مجرم کی طرح مظلوم سا بن کر رہ گیا غریب نے ماجرا کے ساتھ تعداد نکال کر مستفسرانہ انداز میں بیٹوں کی جانب دیکھا کہ "کیا تم بھی یہی سمجھ رہے ہو؟" مگر سعادت مند بیٹوں نے باپ کی لغزش پر اسے زیادہ مجوب نہ کرنے کے خیال سے ہی اپنی نظریں جھکا لیں۔ اور چودھری نے بڑی مشکل سے الفاظ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اپنی آج کی پاکدامنی پیش کی جس پر بیٹوں نے یک زبان ہو کر کہا "چھوڑیئے ابا جان، اور وہ بتایئے کہ آپ نے کیا طے کیا۔ اور جب چودھری نے اپنے جرم کا خونبہا سچ بتایا تو بڑے بیٹے نے یکدم اس پر منظوری دی اور منجھلے نے "ٹھیک" بچو میاں بہت جز بز تھے، منطق اور نفسیات کے اسکالر تھے کچھ دیر بحث کی اور جب بڑے بھائی نے جرم کے سنگین ہونے کی جانب توجہ دلائی تو انھوں نے ثبوت کے کمزور ہونے کا عذر پیش کیا اور جب بڑے بھائی نے متعدد گواہوں کی جانب توجہ دلائی تو بچو میاں نے کہا کہ اول تو ان چھ چھ پیسے کے گواہوں کی عدالت میں وقعت کیا اور پھر ہم انھیں دو دو آنے میں توڑ کر الٹی اپنی کہلوا سکتے ہیں تو آخر یہ جھمیلا کیوں؟ "میاں کو کہنا ہی پڑا کہ" میاں جب تک دو دو آنے کے گواہوں سے الٹی کہلوا کر آپ کے بڑے ابا عدالت سے چھوٹ کر گھر آئیں گے اس وقت کتنی مرتبہ سفیدی میں کالک لگے گی، تم بچہ ہو اتنی بات نہیں سمجھتے!" اس پر منطقی نوجوان نے کہا "جب ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا ضمیر پاک ہے تو کوئی کچھ کہے ہماری سفیدی میں کالک کیسے لگ سکتی ہے۔"

مجن میاں جو دونوں بھائیوں کے مکالمے خاموشی سے سن کر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہے تھے یکدم بول پڑے "چپ رہو بچو میاں تم گدھے ہو، موقع محل نہیں سمجھتے" امی کی طرح اپنے لگائے پڑے ہو، دیکھو میاں پہلی چیز تو یہ ہے کہ جتنگ دو سرداروں نے مان لی تمہاری کہ مقدمہ عدالت سے یقیناً چھوٹے گا۔ ضلع سے نہیں ہائیکورٹ سے اپیل میں لیکن مقدمہ تو مقدمہ ہی ہے مجبوراً تو آپ نہ ہوں گے اور اس وقت یہ معاملہ ہیں پر آپ کی مرضی کے مطابق طے ہوتا ہے اور ابھی چھوٹتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ آپ سمجھا کریں کہ آپ بے گناہ ہیں اور پاک ضمیر خیال کر کے جھوٹی تسکین دیا کریں دل کو دنیا تو یہ نہیں جانتی۔ میاں مرغی کو تکلنے کا گھاؤ بہت ہوتا ہے۔ عدالت ابتدائی سے ہائیکورٹ تک پہنچنا تو بڑی چیز ہے یہاں سے کوتوالی جانے ہی میں ہم سب کو ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ وہ ایک ٹھٹھا ہے اگر آج ہم تینوں بھائیوں میں سے کسی کو خط غلامی لکھنا پڑے تو بھی بہت سستے چھوٹے، ورنہ ابھی تو بات اس کمپاؤنڈ تک ہے اور سویرے تک سارے شہر میں، ساری نمائش میں اور باون ضلعوں میں آرے آرے ہو جائے گی اور میاں سب منطق اور فلسفہ بھول جاؤ گے۔ کسی کو مونہہ دکھانے کو جگہ نہ رہے گی۔" اور بچو میاں کچھ سست سے پڑ گئے اور بولے "اچھا آغا بھائی یہ بتایئے کہ بچہ دے کر ہزاروں لاکھوں آدمیوں سے مونہہ کالا نہ ہوگا، ان سے کیسے چھوٹیں گے۔"

اور چھن میاں ذرا تیز آواز میں بول پڑے "ارے امی جان دیکھتی ہو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس لونڈے کا دماغ واقعی خراب ہو گیا یعنی کہاں سے بول رہے ہیں آپ! اور اس وقت برابر کے پلے میں کیا چیز رکھی ہے آپ نے چہ چہ تمہاری عقل! افسوس!"

ادھر چودھرائن یکدم بول پڑیں "کیا ہم ان ہزاروں لاکھوں کے غلام ہیں نگوڑوں کے! کیا گھوڑا ان کے باپ کا ہے؟ ہماری گھوڑی کا بچہ تھا گھوڑا.................. نگوڑے چھوٹے سر چڑھے ہیں، وہ کوڑی کے! ہوں۔ میرے اللہ کے بڑے یار، دھنے جولاہے اور جہاز ــــ مفت کی گھوڑ دوڑ میعادی ہے، پہنچ لوں گھر، دیکھوں گی تم کتنے لاڈلے ہو دادی اور اماں کے، بہت بھروسے رہے ہو ایک کو بھی جو پھٹکنے دوں دیوڑھی پہ موئے نگوڑے کو۔ باپ کے ہتھکڑی پڑی ہے اور بیٹے بیس مارخاں لیڈر بنے مونچھیں اینٹھتے پھرتے ہیں۔"

اور بچو میاں نے ماں کی آواز تو ایسی ہی سنی مگر ابھی چند منٹ پیشتر والی باپ کی جھریوں والی کلائیوں کی ہتھکڑیاں پہنے تصویر نگاہ میں گھوم گئی۔ ادھر مجن میاں نے کہا "میاں ان سے نبٹئے اور اب کی ہم نبٹیں گے اور سب کو راضی رکھیں گے اس وقت اس بلا کو تو ٹالئے یہ سر پر

پٹھان کا بھی قرض نہیں ہے، مرحوموں کی جو تو ہے"۔ اور جب تکمہ باہر سے تقاضا آیا، بچو میاں تو مونہہ پیٹ کر پڑ رہے اور چودھری اور دونوں بیٹے باہر گئے کو توال صاحب اسٹامپ وغیرہ کیل کانٹے سے ہر طرح تیار ہو کر آئے تھے بچہ کی رسید "فروخت بالعوض مبلغ ایک ہزار روپے نقد سکہ چہرہ شاہی" بھی شیخ جی کو توال صاحب کی ہدایت کے مطابق تحریر ہو گئی اور چودھری بیچ پر چھوٹ گیا اور شام تک دلیس گڑھ سے بچہ پکڑ کر قید فرنگ میں آ گئے اور شیخ جی کے تھان پر اور کو توال صاحب کے اخراجات پر اپنے پانوں چل کر بندھ گئے اور چودھری نئی زندگی پا گیا اور خاندان ڈوبتے ڈوبتے مال بال بچ گیا۔

(ج)

جیت

(۱۰)

اور اب تو کوئی بات بہانہ تھی آج سے میدان ہاتھ تھا اور بچہ کی راسیں تین مہینے پیشتر سے خبریں آ گئی تھیں، کو توال صاحب کلکٹر صاحب اور کپتان صاحب کے سامنے بھی زمین پر چھاتی ٹھونک رہے تھے کہ میڈم کلوڈیا جیتے گی اور در میدان بچہ کو ہرا کر جیتے گی اور دہلاکھنڈ لی چیمپین بنے گی اور بجز چند مخصوص ہستیوں کے کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی، کو توال صاحب سے لگا سیم صاحب تک سب مطمئن تھے بجن میاں سے چودھری، چودھراین تک سب کے سب سجدۂ شکر بجا بجا کر مطمئن تھے مگر بچو میاں دل ہی دل میں بل کھا کھا کر رہ رہ جاتے اور اپنی مجبوری پر بعض اوقات تو سب کچھ الٹ کر مرنے مارنے پر تل جانے کو جی چاہا مگر حالات میں اس وقت یہ بھی گنجائش نہ تھی، اور انھیں بھی اپ بھائیوں کے ساتھ اپنے مونہہ سے تمام کسانوں میں یہی کہنا پڑا کہ چونکہ بہت نامی گھوڑی سے مقابلہ ہے اس لئے بچہ کو خاص ٹریننگ کے لئے ایک دوست کے یہاں شہر بھیج دیا ہے۔ استاد کو کسی نے کوئی بات تو بتائی نہ تھی مگر بوڑھا تجربہ کار چابک سوار سمجھ سب کچھ گیا تھا۔ ساری عمر کو توالوں اور رئیسوں ہی میں جو کٹی تھی بس مالک نے جو کچھ کر دیا اس پر خاموشی کے ساتھ یقین کے ٹھنڈی سانسیں بھرتا۔ تمام کسان نت نئی افواہوں سے ڈر رہے تھے کہ دیکھو کس کل اونٹ بیٹھے۔ شہر سے لے کر دیہات تک خاص و عام کے اندر اس دوڑ کا انتظار و اشتیاق سال بھر سے تھا اور گھوڑ دوڑ کے لئے گھڑی گھڑی گن رہے تھے بات سمندر پار کی آئی گھوڑی کا گھوڑ دوڑ میں جیتے ہوئے دیسی گھوڑے سے مقابلہ تھا، کسی کی پشت بر روایات کسی سے کم نہ تھیں اور یہاں تک کہ میلا لگا اور چودھری کے وعدے کے مطابق کو توال صاحب نے استاد شہامت خاں سے حسب معمول مطابق دستور بچہ دوڑانے کی تحریک کی اور گھوڑ دوڑ سے دو روز پیشتر بلا کر خاص ہدایات دیں، خیر ان کے سامنے تو استاد بیچارے ہوں ہاں کر کے اپنے مونہہ نہ سہی ان کے مونہہ سے وعدہ کر آئے مگر پرانی وضع کے آدمی، چابک لگام کے پیچھے جاں کی اور پھر جس بچہ کو وہ موت کے مونہہ سے چھڑا کر گھوڑے پر سے پکڑ کر لائے جسے بچہ کو بچہ کر پالا اور پھر جسے ران تلے لے کر چھ ضلعوں کو جیتا آج یکدم اسے ران تلے سے نکال کر ذبح کرنے کو کیسے آمادہ ہو جاتے۔ کو توالی سے پلٹ کر چودھری سے عذر کیا مگر چودھری نے اپنے وعدہ کے پاس میں زور دے کر آمادہ کرنا چاہا تو سات پشت کی چودھری کی اور بارہ برس کی سرکاری ملازمت سے دست برداری پیش کی اور جب چودھری نے اپنی بات اور عزت کا حوالہ دیا تو چپ ہو گئے لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے بڑھاپے کی کمزوری کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی کلائیوں کی طاقت کی کمزوری اور معذوری کا اس اہم تاؤ کے لئے اندیشہ بھی ظاہر کیا، مگر چودھری پھر بھی اپنی ہی کہتا رہا اور استاد کو مجبوراً وعدہ اور حسب مرضی نتیجہ کی گارنٹی دینی ہی پڑی مگر بھلا ہو درد کمر کا کہ بروقت دستگیری کی اور اب تک جو کچھ عذر لنگ تھا سچ مچ لنگ بن گیا اور شام تک چودھری نے کو توال صاحب کو اطلاع دے دی کہ استاد یکدم درد کمر کے دورے میں مبتلا ہو گئے اور اب وہ جاکی کا انتظام خود کریں۔ اور کو توال صاحب نے ایک نئے جاکی استاد سدن خاں کی خدمات گھوڑ دوڑ سے دو روز پیشتر نتیجہ سے آگاہ کر کے حاصل کریں جو کھینچ تانے میں بہت سی شہرتیں پائے ہوئے تھا اور دو دن کے اندر ہی اس نے بچہ سے اپنا آسن مانوس کر لیا۔

یوں تو میلہ ہی بہت بھاری لگتا تھا اور اس مرتبہ تو ولایتی گھوڑی اور دیسی گھوڑے کی بھاگ کی شہرت تھی، دور دور سے کسان آئے تھے جو کبھی نہ آتے تھے وہ بھی موجود تھے۔ جیبوں ضلاع کے کلکٹر اور سب ڈپٹی کلکٹر پولیس کے اعلیٰ عہدہ دار اور دوسرے محکموں کے چھوٹے بڑے آفیسر ضلاع بھر کا ایک ایک دیہاتی رئیس زمیندار اور شہر کے روسا وسب اپنے اپنے کیمپ لگائے پڑے تھے، اور رات دن ہر خاص و عام کی زبان پر یہی موضوع زیر بحث تھا، کسان کا بچہ بچہ کو جا رہا بچہ کہہ کر بات کرتا اور سرلین میڈم کلوڈیا کو اپنا گھوڑی کہہ کر پکارتے اور زمیندار جاگیر دار طبقہ جس وقت سرکیوں میں "حاضر باش" خدمت ہوتا تو میاں کلوڈیا کو ہماری گھوڑی بڑے پرخلوص خطاب سے یاد کرتا مگر جب آپس میں بیٹھتے تو نہایت فنکارانہ انداز میں بحثیں ہوتیں اور میڈم کلوڈیا کمشنر صاحب کی گھوڑی تھی اور بچہ چودھری کا گھوڑا پکارا جاتا مگر پچھلے تو میدانوں کے روندے ہوئے زمیندار تو آخر دم تک بحث کی میزان بچہ کی پاریہی لگواتے اور چودھری اور ان کے دونوں بیٹے اگر موجود ہوتے تو وہ بھی تائید کرتے۔

اور آج بھاگ کا دن تھا۔ گنگا کنارے پھیلی ہوئی مٹی کے نم اور روندے ہوئے میدان پر لاکھوں آدمی جمع تھے ایک جانب کسان بڑا ہیا وری داکٹھے کئے ہوئے تھے دوسری جانب سولین گروپ تھا اور ان کے برابر ہی زمیندار روساء کا ہلکا پھلکا سا مجمع تھا۔ حکام کرسیوں پر بیٹھے اور ان کے بید سے ہاتھ پر زمینداروں کی لمبی چوڑی دریاں قالینیں، مسندیں اور تکئے لگے ہوئے تھے۔ خوشبودار تمباکو، دُھواں، پانوں اور عطروں سے فضاء بسی ہوئی تھی۔ یہاں سے وہاں تک بات بات پر نقرئی قہقہے اور طلائی مسکراہٹیں تھیں اور اس کے بیچوں بیچ چودھری، چھمن میاں، منا میاں بھی تھے۔ اور بچہ میاں کھوئے کھوئے گنہگار سے اپنے غول میں تھے جہاں جگہ جگہ اُپلوں کے الاؤ اور خانہ ساز تمباکو کے ڈھیر تھے۔ ٹولیوں میں چلموں کے دھوئیں کے اندر بحثیں ہو رہی تھیں اور بچہ کی جیت پر میزان لگتی تھی۔ سولین اور زمینداروں کی سوسائٹی میں میڈم کلوڈیا کی پیڈگری اور نجابت پر بحث تھی اور اس کی سائنٹفک ٹریننگ کے چرچے تھے۔ اور چونکہ میڈم کلوڈیا اور بچہ کی سیاہ و سفید کی ملکیت ہم معنی ہو گئی تھی لہٰذا مالکوں کے چہروں پر اطمینان کی گہری چمک تھی، ادھر بچہ میاں کے چہرے پر کسی کسی وقت ایسی بدحواسی کے آثار دکھائی پڑتے جیسے اس کا باپ مر گیا ہو، گویا اپنے بیٹے کا گلا اپنے ہاتھوں گھونٹ رہا ہو جیسے آج وہ سارے روہیلکھنڈ کا قاتل ہے اور سب کا خائن۔!

اور میم صاحب اور کمشنر صاحب بہادر لیڈیز اور معزز عہدہ داروں کے جلوس میں تشریف لائے۔ سب کی نظریں انھیں چھیچوں متعلقہ اضلاع کے یورپین و نیم یوروپین آفیسروں کی گوری بیویوں کے علاوہ اور بہت سی گوری اور نیم گوری "مہمان سہیلیاں" بھی تھیں، جو اس نازک مہم کے تماشے کے لئے دور دور سے مدعو کی گئی تھیں اور انگلستان سے روہیلکھنڈ تک رنگین سلسلہ ملا رہی تھیں اور وہ بھی سے دیکھ کر زمیندار طبقہ اپنی اپنی نشستوں پر کھڑا ہو گیا، آفیسروں نے کرسیاں چھوڑیں اور چند ڈپٹی کلکٹر اور تحصیلدار ادھر سے ادھر دوڑتے نظر آئے اور ان کے پیچھے پیچھے کچھ زیادہ مستعد زمیندار بھی، سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا، کرسیاں اور صوفے پیش کئے، دو ایک کلکٹروں اور کئی ڈپٹیوں کچھ "کالی" قسم کے کوٹ پتلون پہننے والے آنریری مجسٹریٹ نسل کے زمیندار نے لیڈیز کی آمد کو تیز کرنے کے لئے نمایاں پھرتی دکھائی اور اگلی نشستوں پر سب کو بٹھا دیا اور چونکہ زمینداروں کی نشست آفیسروں کے سیدھے ہاتھ پر قریب ہی تھی، کلکٹر صاحبان اور کمشنر صاحب بہادر ان کی آمد پر مسندوں اور قالینوں پر حقے خاموش ہو گئے، سگریٹیں بجھ گئیں پان منہ میں دبا دبا کر چبائے جانے لگے، باتیں سرگوشیوں میں ہونے لگیں اور قہقہے بند ہو گئے، اور کہیں کہیں جو دو ایک بات بچہ کی تعریف کا پہلو لئے نکل جاتی تھی اس کی جگہ بھی میڈم کلوڈیا نے لے لی۔

یوں تو میلہ ہی سرکاری ہوتا تھا، ویسے دوڑ کا صرف اور جاکی کا تنخواہ اور دیگر اخراجات بالعموم کسی آنریری مجسٹری یا خطاب کے امیدوار زمیندار کے سر رہتا تھا جسے اکثر گھوڑ دوڑ میں بھی کوئی خاص دلچسپی نہ ہوتی تھی مگر آج تو سب زمیندار طبقہ کی ہمدردیاں میڈم کلوڈیا پر مرکوز تھیں بچہ کے نوروں کے ہرائے ہوئے زمینداروں کے بغض معاویہ اور حب علی دونوں ہیں اور بقیہ سب کو خوشنودی مزاج کلکٹر صاحب میں اور یہ کوئی باضابطہ سائنٹفک قسم کی (Horse Race) تو تھی نہیں ایک بڑے دیہاتی میلہ کی تاریخی گھوڑ دوڑ تھی جس کی پیدائش اور وجہ وہ سب ہی تھی اور جب سے میلے کے انتظام پر گورنمنٹ نے خاص توجہ دی تھی اس کے بعد ہر سال دو سال پیچھے گھوڑ دوڑ کو کچھ ترمیم کے ساتھ سائنٹفک انداز میں ڈھالا جا رہا تھا۔ ویسے دفتر میں ہر دوڑنے والے "جانور" کا نام، مالک کا نام اور پتہ تو باقاعدہ درج ہو رہا تھا لیکن اس طرح یہ دوڑ

ام وجہ لکھا کر ایک ٹکٹ بھی دیا جاتا تھا جسے لے کر سوار میدان میں آتا تھا اور دوڑنے سے پیشتر چپکنا ہوتا قرار پایا تھا۔

اور گھوڑے گھوڑیاں میدان میں ایک ایک دو دو کر کے اترنا شروع ہوئے کسی ریس کی "بجلی" بے حیائی کے ساتھ کودتی اور کسی کے پیچھے بیلے کا پٹا ہوا، "بے ندہ" سونہ زوری سے بل کھا کھا کر ہنہناتا، تھرڈ اف ہوتا، کسی کا "اکڑ فوں" "موڈ دیو" کان پیچھے کو چپکا چپکا کر آہستہ آہستہ چلتی سے مرمراتا اور رگ رگ سے نئی سج دھج دکھاتا چلتا، کسی کی "بچھیڑی" بل کھا کھا کر اداؤں کے ساتھ بھرتی، "ہنستی، تنلی، اٹھلاتی" پاؤں کے اندر جیسے زمین کو بھینچتی سی! اور چاروں طرف تماشائیوں میں ہر ایک کو پہچان کر تبصرہ ہوتا رہا اور ہر ایک کی نگاہیں میڈم کلوڈیا کے لئے فرش راہ رہیں اور تبصرہ کی تان بچہ کے تذکرے پر ٹوٹتی رہی۔ نیا جانور تو نہ معلوم کیوں اس دوڑ میں میڈم کلوڈیا کے اور کوئی اتارا ہی نہ جا رہا تھا ورنہ ہر دوڑ میں دو چار نئے جانور ضرور اترا کرتے تھے۔ پرانے سب آ چکے تھے۔ قدیم دیہاتی رواج کے مطابق نئے جانور کو دوڑ میں سب سے آگے کھڑا کیا جاتا تھا اور پچھلے جیتے ہوئے جانور کو سب سے پیچھے بقیہ سب درمیان میں، جدید انگریزی قاعدہ کے مطابق قد اور لمبائی کے تناسب سے آگے پیچھے دوڑانے کا کوئی قاعدہ نہ تھا۔ سب جانور میدان میں اتر چکے تھے۔ میڈم کلوڈیا کا نئے شوق میں اور بچہ کا پرانی عقیدت میں تماشبینوں کو انتظار تھا کہ میڈم کلوڈیا دفتر سے ٹکٹ کٹا کر میدان میں اتری، سب سے پہلے لیڈیز کی سیٹیں چھپا پڑیں (Here comes madam Claudia —— madam Claudia) اور تالیوں کی سنہری روپہلی جھنکار کے ساز پر میڈم کلوڈیا نے بارڈر لائن کے اندر قدم رکھا اور رقص سا کرتے ہوئے قدموں پر تالیوں کا سازنہ بجتا رہا اور میڈم کلوڈیا میدان میں نظر آئیں۔ پیٹھ پر ہز ہائنس سے لے کر کمشنر صاحب بہادر تک عظیم روایات اٹھائے ہوئے، فرانس اور انگلستان کی پیڈگری سرٹیفکٹوں کا پلندا بنی ہوئیں، میڈم کلوڈیا میدان میں کیا اتریں عظمتوں سے سارا ماحول بھر گیا۔ کانوں سے لے کر دم تک ریشمی جالی ———— سے ڈھکی ہوئی۔ چال چلنے سے زیادہ رقص سا کرتی ہوئی آگے آگے زرد زرق سائیس اس کے آگے اکڑ فوں اینگلو انڈین جاکی اونیشن بوٹ پہنے (Riding Breeches) رائڈنگ بریچیس پہ نارنگی لیدر لیٹرس ([illegible]) چڑھائے اسپد ٹنگ کلر کی چست جیکٹ پہنے سر پر سرخ رومال باندھے اور جس وقت میدان کے بیچوں بیچ جالی علیحدہ کی گئی تو جیسے ریس کورس چمک اٹھا گھوڑی تھی یا تصویر؟! حور تھی، پری پیکر آنکھیں کا نشہ مکیت، آنکھوں میں سحر و اعجاز ایک پردہ کے اندر، چار تھرکیاں کسی ہالی وڈ کی نازنین کی طرح بھرے، تو دو قدم کسی مشرقی ملک کے انداز میں ڈالتی! ایک حرکت میں کان سے لے کر دم تک بجلی سی لہرا جائے تو دوسری میں سم سے لے کر پشت تک، بانکپن کے ساتھ فولاد سا اینٹھ جائے رفتار گام میں بھی محشر خیزیاں سی اٹھتیں اور شرارے چھٹتیں۔ گھوڑی تھی کہ آگ کی لپٹ یا بارود کا تودہ جو پھٹا سا پڑتا تھا۔ ہر حرکت اور ڈھنگ روڈھنگ تربیت اور پرورش کے سانچہ میں ڈھلا ہوا سا اور سائنٹفک اصولوں پر پلی ہوئی جیسے یورپ کی کسی "اسپ ساز" مشین نے ایک مجسمہ تراش کر بھیجا ہے جس میں صانع قدرت نے تمام تر چلتے ہوئے نغمے دوڑا دیئے ہیں جس کی کئی نانیاں، خالائیں، بھائی بہنیں ڈربی ریسیں دوڑ چکی تھیں، اور میڈم کلوڈیا گرسے ہاتھوں کی تالیوں کے سریلے نغمے میں اپنی مقررہ جگہ پر پہنچ گئی اور تماشبینوں کی حیرت و محویت میں آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

اور سب سے پیچھے کہیں دور دفتر کے قریب بارڈر لائن پر بڑھتے ہوئے میاں بچہ نے اپنی شیر کی سی مخصوص ہنہناہٹ میں گرج کر اپنے مخالفین کو ہمیشہ کی طرح چیلنج کیا جسے سن کر ایک پرانا مدمقابل غصہ میں بھر کر زور سے ہنہنا پڑا اور بچہ کے میدان کے اندر اترتے ہی فلک شگاف نعرہ سے آسمان گونج اٹھا، رو ہیلکھنڈ نرلش جیتے رہو! —— بچہ بیر بڑے رہو! —— اور ہر چیکارے کا بچہ نے اپنی صدائے بازگشت جیسی محبت بھری ہنہناہٹ ہی استقبال کیا۔ اور پھر تو پیہم محبت اور عقیدت بھری صدائیں اٹھنے لگیں اور بچہ چیکاروں کی جانب ہنہنا تھا اٹھا کر جواب محبت دیتا گونج کے اندر بڑھتا رہا۔ جوں جوں کسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کے قریب تر ہوتا گیا، چیکاروں کا جوار بھاٹا بڑھتا گیا بچہ کی شان ہمہ گیری اور رفتار شاہ گام بڑھتا گیا اور متکبرانہ اور غازیانہ انداز میں اپنی نو دفعہ کی جانی پہچانی مقررہ جگہ پر کھڑا ہو گیا اور جس وقت لال قند کی گردنا شکی پر انی ملگجی گلفنی آتاری گئی تو تین مہینے کے "تھان" اے اگاڑی پچھاڑی لگے۔ پیدائشی اسپ گشتہ کے مرمریں تن و توش پر گھناؤنا پن نظر آیا اور سفید سا ہمن سا رنگ میلا میلا بگڑا بگڑا دکھائی دیا جسم بھی دوبلا تھا اور ٹانگیں لمبی لمبی سی معلوم ہوئیں، مگر آنکھوں میں وہی چمک دمک

اور تیوروں میں وہی دم خم تھے جو ہمیشہ میدان دیکھ کر ہوا کرتے تھے۔ اور کسان تو پیار بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔ مگر بجو میاں کے پیم بھرے نرگسی پیالے اپنے بچپن کے پیار سے بچہ کو دیکھ کر چھلکے سے پڑتے تھے۔ ایک جانب استاد سدّن خاں چابک سوار جیسی ووٹ پائجامہ پر پنڈلیاں کسے دیسی جوتا پہنے کباڑی کے یہاں کا فوج کا نیلا کوٹ ڈالے سر پر کڑی بندش کا صافہ باندھے کھڑے تھے اور ہاتھ میں فتح پوری کوڑا لہرا رہا تھا' دوسری جانب میلا سا سائیس ایک کپڑا لئے آہستہ آہستہ گردن پر پھرا رہا تھا۔

(۱۱)

ایک ایک جانور کی تمام شریانیں جیسے بجلی کے جھٹکے سے جھنجھلا اٹھیں۔ یکدم ریس کورس کوندتی بجلیوں سے بھر گیا' پٹاخہ چلا' اور دوڑ شروع ہو گئی' دُمیں ہر ایک پیچھے کو پھیل گئیں' گردنیں آگے کو تن گئیں۔ کان نیچے کو آ گئے اور جانوروں کے جسم بھرپور کھنچ گئے اور زمین پانوں ہی پانوں بننے لگی' ہوا میں پیچھے سے پڑنے لگے' ہر جانور جان توڑ کر پوری تیزی سے دوڑنے لگا اور ماشائیوں کی نگاہوں کو تعاقب کرنا مشکل ہو گیا۔ میڈم کلوڈیا اپنی مخصوص سائنٹفک ریس دوڑی اور بچہ اپنی نرالی جبلت کے مطابق چلا' بچہ کو اس میدان میں مدتوں سے سب سے پیچھے سے اسٹارٹ مل رہا تھا اور اختتام پر وہ کبھی آدھا اور کبھی پونی راونڈ اپنے حریفوں کو پیچھے چھوڑتا وننگ پوآنٹ پر پہنچتا تھا' پہلے راونڈ کا دو تہائی فاصلہ ذرا کم رفتار کے ساتھ سب سے پیچھے طے کرتا تھا پھر بقیہ ایک تہائی میں سب کے دوش بدوش جا پہنچتا تھا اور دوسرے راونڈ سے آخیر تک آگے والے جانوروں سے لوتی مارتا تھا' اور تیسرے کے شروع سے ہی غضب ڈھانا شروع کر دیتا تھا۔ اسٹارٹ کے دس دس بیس بیس گز بڑے ہوئے مدمقابل کو بے تحاشہ پیٹتا یہ جا وہ جا' تماشائیوں کی آنکھیں پھٹی رہ جاتیں' گھوڑا ہے یا چھلاوہ' دیکھنے والے انگشت بدندان رہ جاتے اور وننگ پوآنٹ پر کبھی آدھا چکر کبھی تہائی چکر آگے پہنچتا اور اس جیتے ہوئے فاصلے میں استاد شہامت خاں چابک سوار ڈھٹائی کے ساتھ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھے جاتے کہ قریب ترین حریف کتنی دور پیچھے ہے استاد سدن خاں کی ران تلے پہلے راونڈ کا تین چہارم حصہ تو بچہ ٹھیک چلتا معلوم ہوا مگر جب اس راونڈ کے اختتام تک اپنی مقررہ ترقی نہ کر سکا تو مجمع میں بے چینی کے آثار پیدا ہوئے اور دوسرے راونڈ میں کسانوں نے سوار کے ہاتھوں اور راسوں پر غور کیا اور چیکاروں کے ساتھ جگہ جگہ آوازیں بلند ہوئیں "چھوڑ دو استاد باگ چھوڑ دو!--- ڈھیل دو--- راسیں چھوڑ دو استاد--- "مگر استاد نے چھوڑنے کی بجائے اور الٹی قید کر رہے تھے۔ اور کسانوں کی ہمت افزا آوازوں کے زور پر دوسرے چکر کے نصف تک بچہ بہ مشکل درمیان کے جانوروں تک پہنچ سکا--- اور میڈم کلوڈیا گولی کی طرح سب سے آگے اڑی چلی جا رہی تھی۔ اناً فاناً ہی تیسرا راونڈ شروع ہوا۔ بچہ نے پوری طاقت سے دوڑنا اور استاد نے پوری قوت سے روکنا شروع کیا' اور یہ دیکھ کر کنارے کنارے پھیلے ہوئے کسانوں میں بھونچال سا آ گیا۔ سارا مجمع زیر و زبر ہونے لگا' منچلے اور بانکے رونڈے مڈھے پھڑکا پھڑکا کر بارڈر لائن تک پہنچ گئے' اور سب نے سب کچھ اندازہ کر لیا' ارکسان سمجھ گئے کہ ان کا برسوں کا بنا بنایا کھیل اور ہمیشہ کا جیتا میدان آج سازش کا شکار ہو رہا ہے' بوڑھے کسانوں نے اپنی بھٹی ہوئی بھدی آوازمیں بچہ کی ہمت بندھائی اور دشنا شر بچہ بیرا بچہ بیرے گیا! بچہ! بچہ! بچہ! مار میدان اور جوان استاد سدن خاں کی بدمعاشی پر آپے سے باہر زخمی شیر کی طرح بھرے پڑے تھے "ڈھیل دے سدنا نمک حرام!" "حرامی بچے! تھ مار!" اور بار بار لاٹھیاں گھمانے لگے "پھیر دو راس بھیریں گے" اور ادیس گڑھ کے نوجوان تو آپے سے باہر تھے اور سدن خاں کی ماں کا رشتہ لارڈ سیکسن اور سر کیمپل سے ملا ملا کر ان کی ولدیت میں استاد سدن خاں کا نام نکالے تھے جو اب یک دو ذرا دیر میں استاد سدن خاں کے بجائے "سدنا حرامی" کے معزز لقب سے چیخ چیخ کر پکارے جا رہے تھے۔ میدان کے تین چہارم بارڈر پر کسان لگے ہوئے تھے اور جب دکھن کے محاذ والوں سے گذر کر جانور پچھم والوں کے محاذ میں پہنچے تو ادھر کے کسانوں نے بھی بڑے زور سے گرج کر کہا "ابے او سدنا سالے آج ہڈیاں توڑ دیں گے--- نمک حرام۔ سور کے...... لاٹ سکسن کے...... کھوپڑی بجا دیں گے' حرامی" اور بوڑھوں کی نرم آوازیں بدستور رہیں "بہت اچھے بہت اچھے بچہ۔ واہ بیٹا' ہاں ایک زور بچہ' ارے ٹیک کے بچہ' بچہ بچہ--- ہاں ڈٹ کے پڑ کے بچہ بیرا۔ --- اور بچہ کی گردن دوسرے راونڈ کے نصف ہی سے راسوں کے تناؤ میں دوہری ہونا شروع ہو گئی تھی۔ کسانوں کا امید و بیم میں اوچھل اوچھل کر گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ تیسرے راونڈ کے نصف پر تو بچہ لگتا کہ ترین گئے۔ کان چابک سوار کے چہرے سے لگے

اور دم دوہری ہو کر پیچھے سے چرخی کی طرح سر پہ لہرانے لگی، نوجوان بھونکتے ہی رہے اور سدن خاں ڈھڈھاؤں سے کھینچتا ہی چلا گیا اور جوں جوں گھوڑے نے دم خم زیادہ دکھائے سدن خاں اتنا ہی زیادہ تنتا گیا۔ نوجوانوں کی گالیاں اور دھمکیاں شدید تر ہوتی گئیں بڑھوں کی پچکاریاں ہمت افزائیاں، تیز تر ہوتی گئیں۔ استاد سدن خاں کے ہاتھ تنتے ہی گئے اور فتحپوری کو بڑا مفلوج عضو کی طرح جھولتا نکلتا رہا۔ محافے سے گذرتے ہوئے نوجوان کسانوں نے بڑے زور سے بچہ بچہ! بچو میاں کے پیک کا فلک شگاف نعرہ مارا اور جیسے زمین نے سکڑ کر اپنی طنابیں کھینچ لیں اور بچہ میڈم ملوڈیا کی دم تک اپنا مونہہ پہنچا سکا، ہاں ہاں تیز تر ہوئیں اور جیسے زمین تھرا گئی اور بچہ کے پانوں پہ پھاساں کر لپٹ گئی۔ استاد نے پوری طاقت سے کھینچا، بچہ کے انداز سے معلوم ہوا کہ جیسے اس کی روح جسم کے اندر سے پرواز کر کے آگے نکلنا چاہتی ہے اور اب جبلت اسی کے منافی بغاوت شدید تر ہوتی گئی اور چابک سوار نے جتنا زیادہ روکنا چاہا اتنا ہی زیادہ تیز ہوا۔ اور دم قریب قریب سوار کے سر پہ لہرانے لگی اور گردن مرغ کی طرح دوہری ہو کر کان سوار کی ناک کو چھونے لگے اور راسیں کھنچتی رہیں، رفتار بڑھتی رہی اور تیسرے راؤنڈ کے نصف سے بچہ میڈم ملوڈیا کے ساتھ کنوتی ملائے جا رہا تھا اور اب محاذ کے نوجوان کسانوں نے استاد کی گالیاں اور دھمکیاں بند کر کے بچہ کو بارڈر لائن سے باہر دوڑ کر دوڑ کر باڑھیں دینی شروع کیں، اور گردن کے اوپر سے چمڑے کا پورا کنٹرول ختم ہو گیا، مونہہ کے اندر لوہے کے ٹکڑے پورا دباؤ دیکر ڈھکیل چلے اور کمشنر صاحب کے بازو سے کوتوال صاحب کے پنجہ تک کا سب ساز باز سدن خاں کی کلائی کا زور پورا کر چکا تو وننگ پوائنٹ کے قریب لمحے، بچو میاں نے کڑک کر بچہ کو للکار دی، اور جیسے زمین ابتدائے آفرینش کی گردش کے خلاف ایک پھرکی الٹی لے گئی اور سورج کے بجائے تجلی کے محور پہ گھوم گئی، نگاہ کی شعاع کی رفتار سے آسمان الٹ کر نیچے آیا اور زمین اچھل کر سر پہ پہنچ گئی۔ گھبرائی تڑپ سے بچو میاں کی آواز پر بچہ نے سر سے پانوں تک جھٹکے ہی جھٹکے ایک اڑان سی لی اور میڈم ملوڈیا سے آگے جا گرا! اور یہ وننگ پوائنٹ تھا ——

اور سدن خاں استاد تو وننگ پوائنٹ پر سائیس کو گھوڑا تھما کر پولیس کے ہنٹر اور کسانوں کے ڈنڈے کے خوف سے مجرم کی طرح ایسے فرار ہوئے جیسے زمین نگل گئی! کسانوں نے بڑے زور سے وننگ پوائنٹ کی جانب رش کیا، 'بچہ ہیرا ہے' —— روہیلکھنڈ نرسری کی جے، کٹھیر سورما جے! —— اور ان کا بس نہ تھا کہ چار دہل ٹانگوں سے اٹھا کر بچہ کو کندھوں پہ رکھ لیں اور پولیس کے انتظام کرنے والے کانسٹبل روکتے ہی رہے مگر وہ بچہ تک پہنچ گئے اور اس مرتبہ ہر جیت کی طرح استاد شہامت خاں تو موجود ہی نہ تھے جنھیں وہ بچوں کی طرح اٹھا لیا کرتے تھے اور کندھوں ہی کندھوں جھلاتے اوبیس گڑھ کیمپ تک لے جایا کرتے تھے بے اختیار ہو کر چند آزاد نوجوانوں نے بچو میاں کو اٹھا لیا، مگر بچو میاں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور چہرہ پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور دل دھک دھک کر رہا تھا کہ آج کسانوں کی ساری خوشی مٹی میں مل جائے گی اور ان کی عمر بھر کی عزت خاک میں —— اور جب یہ حال کھلے گا کہ ان کا بچہ نہیں جیتا ہے تو یہ ساری خوشی چھوٹی ہو جائے گی اور پھر جب یہ معلوم ہوگا کہ بچہ چودھری نے بیچ لیا ہے تو ان کا خاندان ڈوب جائے گا اور شاید انھیں ڈوب مرنے کو جگہ نہیں رہے گی اور جو کالک تین مہینہ بیشتر لگنے سے بچی تھی وہ آج لگے گی اور ستم بالائے ستم بچہ نے یہ کیا کہ اپنے سائیس کے روکے نہ رکا اور شرارت دکھانے لگا اور کندھوں پہ بیٹھے جاتے ہوئے بچو میاں کے پیچھے پیچھے بھیڑ کے ساتھ چلنے لگا۔ ادھر بچہ کے آگے گرتے ہی لیڈیز کی قطار سے ایک (Dying yell) سی بلند ہوئی اور دو دو بڑی آنکھوں سے نیچے آپڑیں۔ کمشنر صاحب کی میم صاحبہ faint کر گئیں اور کئی مہمان مسیس faint کرتے کرتے بچیں، میڈیکل ایڈ مہیا ہوئی۔ دو ایک سینیئر لیڈیز نے سنبھالا، میم صاحب کے حلق میں برانڈی کے قطرے ٹپکا کر بمشکل کیمپ تک پہنچایا گیا اور ریس کے میدان سے ہر کلکٹر، ڈپٹی کلکٹر، تحصیلدار، سپرنٹنڈنٹ، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور انسپکٹر تھانہ دار سب کے سب سیدھے کمشنر صاحب کے کیمپ پہنچے جیسے ان کے یہاں غمی ہو گئی ہے، اور میم صاحب نے پہنچتے ہی کیمپ اکھیڑنے کا حکم دیا اور چلتے وقت کمشنر صاحب نے تو کچھ نہ کہا پانچوں کلکٹروں کی موجودگی میں کلکٹر صاحب بہادر سے نہایت سنگین قسم کے شکایتی انداز میں کہا کہ بڑے شرم کی بات ہے۔ آپ کا یہی ایٹی کیٹ ہے!؟ آپ نے ایک لیڈی سے جھوٹا وعدہ کیا اور دھوکا دیا! —— آپ جیسے ذمہ دار آفیسر اور کلچرڈ جنٹلمن کو یہ چیز زیب نہیں دیتی۔"

(۱۲)

اور اب کلکٹر صاحب کے کیمپ پر کوتوال صاحب کی پیشی اور جواب طلبی تھی۔ کوتوال صاحب اندر طلب کر لئے گئے۔ بچہ بلا کر باہر کھڑا کر لیا گیا تھا۔ دفتر کے کیمپ میں آمنے سامنے کرسیوں پر غصہ میں شعلہ سے دہکتے کلکٹر صاحب اور سپرنٹنڈنٹ صاحب بیٹھے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ آہستہ آہستہ اپنے گیٹرس پر ہاتھ مار رہا تھا اور کلکٹر سفید مونچھ چبا رہا تھا۔ کوتوال صاحب نے اندر پہنچ کھٹ سے سلوٹ دیا اور کلکٹر نے دانت کٹکٹا کر آہستہ آہستہ کہا "You rouge of a City Kotwal — You rouge of a City Kotwal — You sculled of a City Kotwal" — اور میز پر گھونسہ مار کر کہا "ول تم سب کو دیکھ دیا! Worthless Brute!" اور جب دوسرے گھونسے کے بعد ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دانت کٹکٹا کر اور نیچے کا ہونٹ نکال کر کلکٹر صاحب نے ذرا سکوت کیا تو سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر نے ایک شیر کی سی غراں نکالی اور بولے "یو ڈیمڈ سب انسپکٹر! — ول بچہ کس کا گھوڑا ہے!"

اور کوتوال صاحب کے دونوں جڑے ہوئے ہاتھ سپرنٹنڈنٹ کی آواز پر اور بھی زیادہ تھرتھرانے لگے۔ "ہو...... ہو...... حضور... شیخ جی کا؟!"

"ہوں ڈیمڈ تم ہم کو بولا شیخ جی کا! — پھر گدھا ناک ٹپاؤ بچہ کیوں آگے گیا؟!" — اور اس کا جواب بجز بچہ کے کسی کے پاس نہ تھا اور کوتوال صاحب بہادر بیچارے بلی کی طرح مونہہ چلا کر دو مرتبہ میاؤں میاؤں سی کر کے رہ گئے۔ اور سپرنٹنڈنٹ نے میز پر بڑے زور سے گھونسا مارا اور شیر کی طرح بپھر کر گرجا "یو ڈیمڈ! کوتوال کا بچہ! ہم پوچھنا مانگتا ہے سور کا ناک — بولو ڈیمڈ!"

"او! او! ای ای! ای! آں! — اور یہ کوتوال صاحب کے نکلے ہوئے دانتوں میں بند نکلی ہوئی آواز تھی جو سکتے ہوئے ہونٹوں کو جمع کرنے کی ناکام کوشش میں کلام موزوں کا جامہ نہ پہن سکی۔ اور کلکٹر صاحب نے فوجی کپتان قسم کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کا انداز بجائے زبان کے ہاتھ سے جواب طلب کرنے کا دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے روکا اور اس کے مونہہ سے بات لے کر بالکل با ترتیب اور ضابطے کے طرز میں کہا "بولو تم بولا کپتان صاحب کی میم صاحب نے کہ تم چودھری سے گھوڑا شیخ کے نام مول لیا؟" — اور کوتوال صاحب بہادر سپرنٹنڈنٹ کے چہرے سے لگا ہوا تھا کہ بمشکل کلکٹر صاحب کے جواب میں بار بار تھوک نگل کر بھاری سے مری مری "جی حضور" نکال سکے اور اتنے میں سپرنٹنڈنٹ پھر آگ بگولا ہو کر پھٹ پڑا "یو ڈیمڈ — اور تمہارا الکشن صاحب کی میڈم کو ڈالیا سے ہٹایا کیا" — اور کہہ کر "اسکاؤنڈرل" فوجی پھر ہمکا اور آئی سی ایس کلکٹر نے پھر روکا اور بولا "ہوں! اچھا چپراسی شیخ جی کو بلاؤ!"

"ہوں — ڈیمڈ شیخ جی! — غول — نمان — ناڈل" سپرنٹنڈنٹ پولیس غرایا۔

اور چپراسی دوڑا ہوا شیخ جی کے پاس پہنچا جو کوتوال کے کیمپ میں مہمان تھے اور شیخ جی کچھ گڑیوں کے کھیل کب تھے۔ ان کو بری سے بری اور اچھی سے اچھی سوجھ گئی تھی، پھر چھوٹے بیٹے والی سروس کی ایک لاکھ اکیاون ہزار کی دوسری قسط سامنے تھی جس کی داغ بیل ایک مہینہ پیشتر اس نئے تھانیداری کے سلیکشن میں آتے ہی پڑ گئی تھی اور اس بر وقت کو سوچتے ہوئے انھوں نے رفتہ پہ بچہ کے مالک کا نام نہایت دوراندیشی کے ساتھ منشی کے پاس بیٹھ کر درج کروا دیا تھا جس کی ساری تیزیاں اور سارے زیر اور ایک ایک مبارک، بہر حال اس وقت کوتوال صاحب بہادر کے سر پر بلا بن کر سوار ہو گئی تھی اور ایسے ہی وقت کے لئے وہ بچہ کی رسید فروخت جیب میں ڈال کر چلے تھے۔ جو انھوں نے ونگ پوائنٹ پر بچہ کے جست کرتے ہی بنظر احتیاط جیب میں رکھی تھی خالی از خطرہ نہ سمجھی تھی اور فوراً نکال کر دی تھی۔ نہایت دلیری کے ساتھ بادھکے کلکٹر صاحب نے سوال کیا "ول شیخ جی بچہ تمہارا گھوڑا ہے؟"

"نہیں حضور میرا نہیں۔"

اور سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا "اچھا ڈیمڈ بچہ کس کا؟ — کوتوال کا گھوڑا؟"

"اب یہ حضور مجھے معلوم نہیں؟"

"نہیں ہم پوچھنا مانگتا ہے گدھا کا مالک۔ کوتوال چودھری سے تمہارے نام گھوڑا مول لیا؟"

"نہیں حضور۔" شیخ جی نے نہایت استقلال کے ساتھ جواب دیا۔ اور کلکٹر نے کہا "یہ بات؟ بچہ نمائش سے اب تک تمہارے اصطبل میں رہا؟"

"نہیں حضور" شیخ جی نے تڑسے کہا۔

"اچھا تو یہ بات کہنے والا جھوٹا ہے کہ پشیک جی کا گھوڑا؟"

"حضور بالکل جھوٹا!" شیخ جی نے کہا۔

"اور یہ (Statement) بھی دینے والا جھوٹا ہے کہ بچہ شیک جی کے نام کو توال نے اپنی جیب سے دام دے کر چٹھی ریکھا"

"حضور بالکل جھوٹا" شیخ جی نے نہایت اطمینان کے ساتھ کہا اور سپرنٹنڈنٹ پولیس نے میز پر گھونسہ مارتے ہوئے گرج کر پوچھا۔

"پھر ڈیمڈ بچہ کس کا گھوڑا؟ ہم پوچھنا مانگتا ہے"

مگر شیخ جی ذرا نہ ڈرے اور آہستہ سے بولے "حضور یہ میں کیا جانوں۔ حضور دفتر سے ریس کا رجسٹر منگا کر دیکھ لیں، ہر مالک نے اپنے اپنے نام سے گھوڑا دوڑایا ہے اور کل حضور اپنے ہاتھ سے انعام دیں گے مالک کو۔"

اور کلکٹر نے آواز نکالی "چپراسی منشی گھوڑ دوڑ رجسٹر کے ساتھ لاؤ۔"

اور ذرا دیر میں منشی مع رجسٹر کے آگیا۔ کلکٹر نے کہا "آج کی ریس میں بچہ کس کے نام سے شریک ہوا؟"

"حضور چودھری ناظم علی خاں۔ اویس گڈ ہو" اور یہ کہہ کر رجسٹر کھولا۔ کلکٹر صاحب اردو میں بچہ اور اس کے مالک کا نام تو نہ پڑھ سکے مگر خانہ کیفیت میں سول جج کے دستخط اور ریمارک پڑھ لیا جو ریفری تھے اور جنھوں نے فوراً فیتہ سے ناپنے کے بعد بچہ کی جیت کی تفاصیل اور مالک کا نام لکھا تھا جس کو ٹرسٹ اور سرٹیفکٹ ملنا تھا اور سدّن خاں کے نام پر جا کی والا نمبر لکھا تھا۔ اور کلکٹر نے پھر کہا چودھری کو بلاؤ۔"

اور چپراسی دوڑا ہوا چودھری کے کیمپ پر پہنچا۔ بوڑھے چودھری بیچارے کے طلبی سنتے ہی طوطے ہرن ہو گئے۔ سمجھا جب تو بچ گئی عزت اب تو نہیں بچتی۔ دونوں بڑے بیٹوں سے مشورہ کیا اور یہی رائے قائم کی کہ چپراسی کو ایک روپیہ دے کر یہ کہلوا دیا جائے کہ ڈسپنسری گئے ہیں کہ بیکدم سخت درد اٹھا اور فوراً استارہ پر چڑھ کر بھاگ جائے اور پھر بیماری کا عذر کرتا رہے کہ کچھ سن گن پا کر بچو میاں بھی آگئے اور میلہ میں یوں تو خاص و عام ان پر مبارک باد کی بوچھار کر رہے تھے مگر جب دفتر کے منشی نے مبارک باد دی تو ان کا ماتھا ٹھنکا اور پھر کچھ دور آگے بڑھ کر ہندوستانی سول جج نے اسپورٹس مین لائک انداز میں مسکرا کر مبارک باد دی تو بچو میاں گو مگو میں پڑ گئے اور یہ خیال کر کے کہ ان کا نام ان کے باپ نے کوتوال صاحب کی فرمائش پر نتیجہ کی رنگینی کو دوبالا کرنے کے ساتھ شوخ تر بنانے کیلئے سازش کے تحت لکھوایا ہو کہ بچہ میڈم کلو پیٹرا جوں کا توں انھیں کا گھوڑا ہو کر اور انھیں کے سر ہو کر رہ سکے۔

اُدھر کسانوں میں یہ ہوا اڑی کہ بچہ کو توال صاحب چھینے لیتے ہیں۔ اور بچو میاں نے کیمپ پہنچ کر باپ بھائیوں کو سراسیمہ و پریشان دیکھا۔ اور استادہ کسی ہوئی طیار اور چودھری فرار ہونے کے لئے پا بہ رکاب۔ اور بچو میاں نے باپ کو ڈھارس بندھائی اور چپراسی کی زبانی سنا ہوا سب حال مجملاً سنایا۔ تو پھر اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔

"بچہ جیت گیا اور کسی دشمن نے ہمارا نام لکھا دیا وہاں دفتر پر بیٹا" بوڑھے چودھری نے کہا۔

"ابی تو جھوٹ ہے کیا کروا دیا، کیا ہم نے بچہ کسی سالے کے ہاتھ بیچا ہے؟"

"ارے بیٹا ایک آفت میں پڑ کر خاندان ڈوبتے ڈوبتے بچا ہے اور آج یہ نئی اور بڑی خدا کی لاٹھی بے آواز" اور چودھری نے آسمان کی جانب ہاتھ اٹھا کر گناہوں کی معافی مانگی اور آہستہ سے بولا "وہ بھری نمائش تھی اور آج بھرا میلہ" اور اس کی نظر میں بچہ سانپ کی طرح گھومنے لگا اور اس کی منحوس ماں کی ایک ایک نحس بھوری ناگن کی طرح لہرا گئی اور بڑبڑایا "میں نے اپنی ماں کی نصیحت نہ مانی اور اس ناگن

کے سپوت نے کو کھنا کے گھر سے منگا کر آستین کا سانپ پالا۔" اور بچو میاں نے بات کاٹ کر کہا "ابا جان آپ کیوں ڈرتے ہیں، اور گھوڑا تو میرے نام پر رجسٹر میں درج ہے۔ میں ابھی معلوم کر کے آرہا ہوں۔ خاموش جج صاحب نے بچو سے کہا جو رنگین ہیں۔

"اچھا بیٹے تمہارے نام پر درج کرا دیا کسی نے! غضب خدا کا!"

"غضب کیوں رحمت نہیں؟ بچو جیت گیا! اور میں جاتا ہوں۔"

"نہیں بیٹا تم نہ جاؤ۔ چلو میرے ساتھ تم بھی، گھر چال چلو۔"

"کیوں؟"

"دیکھو بیٹا، تمہیں ——— یہ بند کر دیں گے۔ میں چپراسی سے پوچھ چکا ہوں صاحب آج بہت برہم ہیں۔"

"ایں! بند کر دیں گے۔ یہ بھی کوئی شہر کا موقع سمجھ لیا ہے۔ نچے ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔"

"اگر گرفتار کر لیا تو؟!"

"ارے ابا جان! ان مجسٹریٹ قسم کے لوگوں کی ذہنیتیں مجھے معلوم ہیں۔ یہ مارتے کے آگے آگے اور بھاگتے کے پیچھے پیچھے بھاگتے ہیں، جو آج بات بھی کر جائیں مجھ سے، مجھے گرفتار کرنا اور بند کرنا تو درکنار!"

"اور انھوں نے گرفتار کر لیا تو تم کیا کرو گے؟"

"اگر گرفتاری کی دھمکی بھی دی تو میلہ الٹ دوں گا۔ رو ہیلکھنڈ درہم برہم کر دوں گا، اور آج تو میں اپنوں میں ہوں، یہ شہر والا مکان نہیں جو چوہے کی طرح پھانس لیں۔ کاکی اٹھان کا میلہ ہے۔" اور یہ کہتے ہوئے پورے میلے پر ہاتھ گھما کر ہمہ گیری کے ساتھ اشارہ کیا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔

اور بوڑھا باپ ناعاقبت اندیش اکھڑ نوجوان بیٹے کی بات پر بگڑ گیا۔ "جی آپ تو سارا ہندستان الٹ دیں گے بڑے ہفت ہزاری خان خاناں ——— کچھ نہیں بیٹا ہمارے موہنہ پر بھیسے بیٹے ہیں کالک لگانے جاتے ہو کہ چودھری کا لائق بیٹا ہتھکڑیاں پہن کر حوالات کو گیا۔"

اور بچو میاں آہستہ سے ہنس پڑا اور یہ کہتا ہوا کہ آپ بیٹھیے اطمینان سے ہم نبٹے آتے ہیں۔ چپراسی کے ساتھ چل پڑا۔ اور چودھری دیکھتے رہ گیا ٹھہتا رہ گیا اور بچو میاں مچاہا۔ چال چلتے کلکٹر صاحب کے کیمپ پر سیکڑوں کسانوں کے جلوس میں پہنچے سامنے میدان میں بہلے بچہ ہی سے آنکھیں چار ہوئیں اور بچے نے بڑے زور سے شکوہ میں ہنہنا کر طنز کا ایک تیر سا پھینکا اور جیسے حضرت سلیمان کی طرح بچو میاں لفظ لفظ سمجھ گئے کہ کہہ رہا ہے واہ میاں بچو میاں واہ! تم نے تو بچپن کی بڑی اچھی نبھائی۔ قصائی کے کھونٹے پر باندھا اور بیچ میدان شکنجہ میں کسوا کر ہماری عمر کی کری کرائی خاک میں ملا دی تھی۔ اور وہ نکا ہی جھکا کر اندر کو نیک گئے تو بچے نے دوسری آواز ہنہنائی۔ میاں جاتے کہاں ہو، ذرا مجھ کو جواب دیتے جاؤ پہلے۔ مگر وہ بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے ہوئے گھس گئے۔ اور اندر مجمع پر پہلی نگاہ ڈالتے ہی سمجھ گئے، راستہ میں معاملہ کی جزوی تفاصیل اور کوتوالی شیخ جی اور منشی کے بیانات کا خلاصہ چپراسی سے معلوم کر لیا تھا جو انہی کے باپ سے ایک روپیہ انعام پا کر چلا تھا جو معلومات کے سلسلے میں پایا تھا۔

کلکٹر صاحب نے ذرا تیکھی بھولی نظروں سے شیر سے بچے کے ساتھ انگریزی میں سوال کیا "چودھری ناظم علی صاحب، آج رئیس کا جیتا ہوا گھوڑا بچہ نام آپ کا ہے۔"

"جی ہاں ——— بچو میاں نے کہا اور آواز پہچان کر باہر سے بچہ خوشی کی ہنہنا ہٹ سنایا "ابھی ہے! پھر اپنے بچے کو میں نے کھولی کر اڑا دیا تھا اور ہوں بول رہی۔"

اور سپرنٹنڈنٹ نے سوال کیا "اور یہ بات غلط ہے کہ آپ نے بچہ شیخ مشرف الدین کے ہاتھ فروخت کیا۔"

"جی بالکل غلط۔" بچو میاں نے جواب دیا اور باہر سے آواز سن کر بچہ پھر ہنہنا پڑا "اور اور ہوں! ابا، جی ہاں! ہم مفت میں وہاں اندھیرے شہر میں کیوں بند کرا کر بندھوایا تھا ایسا ہی ہے۔"

اور اب کی مرتبہ فوجی کپتان اور سپرنٹنڈنٹ پولیس نے کلکٹر صاحب کے اشارہ کے باوجود نہ ۔۔۔ ہر بورڈ کو ۔۔۔ کر دوں سے

کوتوال صاحب بہادر پرچیل پٹا اور قانونی دھمکیوں کے ساتھ ہندستانی اور انگریزی گالیوں کے امتزاج سے ایک نئی اینگلو انڈین گالیوں کی ترکیب مرتب کرنے لگا اور ساتھ ہی ساتھ پیہم ٹھوکر دل کی دھول چپکی سے موڑھی جھاڑتا جاتا تھا اور سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ پاؤں کی تیزی سے زیادہ سرعت اور تیزی کے ساتھ کوتوال صاحب پر مزید اٹینشن ہو کر قاعدہ میں لیتے رہے اور سپرنٹنڈنٹ نے اس فٹ بال اور گالف کے ملے جلے کھیل کے دوران میں غل اغرا کہ: ڈیمڈ نم نولیس حاضر۔ ڈیمڈ نم کو دفعہ دس کی کارروائی، حکم دیا اور اور اک ذرا سانس لی تو کلکٹر نے اسی شیریں انداز میں بچومیاں سے کہا: "آپ جا سکتے ہیں اور گھوڑا تو شاید آپ کا ہی ہے! لے جائیے۔" بچومیاں نے سلام کو ہاتھ اٹھایا اور پھر ذرا اکڑ کر مغموم کوتوال کی جانب دیکھا اور نہایت ادب سے ذرا گردن جھکا کر آداب کیا اور فاتحانہ انداز میں باہر نکلے۔ سامنے بچہ تھنے پھلائے متکبرانہ انداز میں پلا سا کھائے ۔۔۔ سے کھڑا تھا۔ اپنی اس تاریخی فتح کے پورے پورے احساس میں چھریا پن کا مجسمہ بنا ہوا جو اس نے کمشنر صاحب، لاٹ صاحب، ہز ہائی نس شاہ جارج کے سر پہ سے لگا کر بڑی جیتی تھی۔ استاد شہامت خاں کو بچومیاں نے پیچھے پیچھے چودھری نے بھیج دیا تھا کہ نہ معلوم کیا پیش آئے اور استاد بچہ کی گردن پہ ہاتھ رکھے۔ اس کی باچھوں سے بہتا ہوا خون اپنی پگڑی کے طرہ سے پونچھ پونچھ کر جیسے اسے منا رہے تھے۔ چند سر برآوردہ کسان اس کے جسم پر ہاتھ پھیر رہے تھے اور اپنی پگڑیوں سے پسینہ خشک کر رہے تھے اور بچومیاں کو دیکھتے ہی بچہ پھر شکوہ کی مخصوص آواز میں ہنہنایا۔ اور بچومیاں نے لپک کر اس کی گردن میں ہاتھ حمائل کر دیئے "ہوں، ہوں، ہوں، نا ہوں، ہوں ہنانانانا" بچہ نے ناز کے انداز میں موہنہ سا پھیرنا چاہا مگر بچومیاں نے پکڑ کر اس کے نرم و نازک ہونٹوں میں اپنے ہونٹ پیوست کر دیئے۔ پیار میں تھرتھراتی اشرف المخلوق اور اشرف الحیوان سانسیں الجھیں، شکوے مٹ گئے، بچومیاں کی آنکھوں سے دو شوخ طلب موتی ڈھلکے اور بچہ کی آنکھوں سے شکوے کی دو دھاریں بہ کر ہونٹوں پر جمع ہو گئیں اور پھر تو بچہ بھی ہنس گئے "ہوں ہوں، ہاں ہاں! ہاں ہاں ہاں، تکا تکا، چپ چپ۔" بوسوں کا تبادلہ ہونے لگا، دھم دھم، ٹپا ٹپ سیدھی ٹاپ مار کر اور قریب کو بلایا اور بچومیاں نے رخسار پہ رخسار ملا اور آگے بڑھ کر سینہ سے لگایا۔ اور پھر ہونٹوں پہ ہونٹ رکھ کر ناز برداری کرتی ہوئی آواز میں جیسے ماں اپنے شیر خوار بچے سے توتلی زبان میں بات کرتی ہے، بولے: "ہوں بچہ خفا ہو گئے بیٹا! اوں آں، واں اتنے دنوں شہر میں پھنس کر ۔۔۔ لو اب چلو گھر بیٹو۔۔۔۔ گھی گڑ کا ملیدہ کھاؤ، چنے کی تیل چپڑی کھاؤ، ہوں، آں، اوں کے! چوں آں چوں! ۔۔۔ ہوں۔ گھر گھوما، بچھڑا کا ٹکڑا کھاؤ، کھیت کھیت منہ کی ہری ہری پھلیاں کترتے پھرنا ۔۔۔ کولہو کو لوٹ مٹھا مٹھا رس پیو ہوں لو اب گھر چلو، ہوں سب تمہیں یاد کرتے ہیں، خوب کودو، خوب بھاگو! اپنی شیاما آتا کاگا دھاگا دھادھا دودھ پیو' ۔۔۔ چک چک چاٹ پٹاج! ۔۔۔ لو اب من جاؤ۔ ہاں ہاں ہاں!" بچہ کا لہجہ بدلا، تیوروں میں دودھ قہقہہ کے سوتے سے ابل پڑے، اور بچہ من گئے۔ "تو اب تو من گئے ہمارے بچہ بیرا ۔۔۔ ہوں اور دیکھو تو بے ایمان نمک حرام سدّنا نے ہمارے بچہ کا کھینچ کھینچ موہنہ کاٹ ڈالا" بچومیاں نے شکایتی انداز میں افسوس سا کرتے ہوئے اپنا رومال بچہ کی زخمی باچھوں پر نرمی کے ساتھ پھیرا۔ اور سدّنا کا نام سن کر بچہ کے تیوروں میں خشونت کی جھلک آ گئی، اور ٹھن ٹھن ٹھنانانانا ۔۔۔ اور دھم سے زمین پر ٹاپ مار کر گویا ۔۔۔ بے ایمان نمک حرام سدّنا کا کھوپڑا توڑا۔

اور بچومیاں نے گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ظالم قصائی سالا ۔۔۔ میرے بچہ کی گردن توڑ دی، سالے نے" اور بچہ کے نتھنے پھول گئے۔ "غوں، خوں، خاں" غصہ میں گردن جھٹکی ۔۔۔ "لو اب غصہ تھوک ڈالو" "چلو" بچومیاں نے کہا اور بچہ نے "پھرر" زور سے غصہ تھوک کر ذرا اکڑ جھکا کر بیٹھ پیش کی، اور بچومیاں کھلنڈرے سے انداز میں جست لگا کر بغیر ہی رکاب بیٹھ پانوں چھوا کے ایال پکڑ کر زین پر دکھائی دیئے، اور سب کسانوں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ استاد نے پگڑی کے طرہ سے آنسو پونچھتے ہوئے کڑک کر نعرہ لگایا: "بچومیاں زندہ باد!" "بچہ بیرا جیت ہو، سردھیلا کھنڈ نریش کی جے ہو، کٹھر بیرا ہارا" اور جے کار نعروں کی زنجیر کی کڑیوں کا سلسلہ سارے میلے میں ملتا چلا گیا اور ڈیڑھ ڈیڑھ تیر شمیمہ گونج اٹھا۔ اور بچہ نے بجلی کی طرح لہرا کر ناز کے انداز میں ایک قند بھری، اور بغیر ہی راس کے اشارہ کے اودیس گڑھ کا رخ کر دیا۔

آخری رات

اقبال متین

(زیر تکمیل ناول کا ایک باب)

جھیل کا گہرا نیلا پانی بالکل ساکت تھا۔ گولر اور نیم کے درخت جھیل پر اپنا سایہ پھیلائے اس انداز سے کھڑے تھے جیسے اللہ میاں کی دو سوئی ہوئی نیلم پریوں کی رکھوالی کر رہے ہوں۔ ان تناور درختوں کے پیچھے کچھ ہی فاصلہ پر ریل کی پٹری صاف چمک رہی تھی۔ بہت دور سے سیٹی کی آواز آ رہی تھی۔ چاند کبھی سفید بادل کے جزیروں میں چھلانگ لگا کر ڈوب جاتا، کبھی نہا دھو کر اور آب و تاب سے باہر نکلتا۔ کبھی سارا ماحول اداس اداس ہو جاتا، کبھی جگمگا اٹھتا — ٹرین دندناتی ہوئی گزر گئی۔ جھیل کے پانی میں سنہری مچھلیاں تڑپ کر چھپ گئیں۔ چنگھاڑتی ہوئی ریل گاڑی سے ماحول کا سکوت ٹوٹا تو ٹوٹ گیا — گولر کے درخت سے کوئی پرندہ گھبرا کر اڑا اور پر پھڑپھڑا کر پھر وہیں بیٹھ رہا — چاند بلند ہونے لگا یہاں تک کر رکھوالی کرنے والے دیوؤں سے بچ کر اس کی شوخ زرتار نگاہیں سوئی ہوئی نیلم پری کو گدگدانے لگیں — نیلم پری نے جیسے آنکھیں کھول دیں اور دیکھتے ہی دیکھتے چاند پوری شان کے ساتھ جھیل کے سینے میں سما گیا۔ سامنے سمٹ کر پس منظر میں چلے گئے — وہ آہستہ سے پٹریوں کے پار والے نشیبی حصے سے نمودار ہوئے۔ گار کے پتھر لڑھک کر جھیل میں آ رہے۔ جھیل کی پرسکون سطح پر لہریں اٹھیں۔ چاند ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پانی میں حل ہونے لگا۔

ایک نے دوسرے سے کہا "کیسا عجیب منظر ہے۔" دوسرے نے جواب دیا "لیکن ہمیں اس منظر سے کیا لینا" — پہلے نے مٹھی بھینچ کر کہا "کیوں نہیں دوست! یہ زمین، یہ آسمان، یہ چاند، یہ جھیل، کل یہ سب ہمارے تصرف میں رہیں گے۔ ... کون ہے جو ہمارے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک سکے۔ کون ہے جو ہمارے سینوں میں کھولتی ہوئی جوالا کو سرد کر سکے" — "تم ہمارا ساتھ دو گے دوست؟ نہیں تو؟" دوسرے نے سینہ تان کر اٹل ارادے کا اظہار کیا اور اس کی آنکھوں میں اس کی مقتول ماں کی خون میں تھڑی ہوئی لاش ابھر گئی .... — تو سنو! پہلا کہنے لگا — "ہمیں اس مقدس خون کی لاج رکھنی ہے جسے ہم نے اپنے ماتھے پر لگایا تھا — ہمیں اپنی ماں کو جواب دینا ہے" — "اچھا تو میں جاتا ہوں۔ تمہیں بھی جلد سے جلد پہنچنا چاہئے" "کیجئے۔"

گار کے پتھر جنہیں بنائے۔ اس کی نشیبی جھاڑیوں کے جھنڈ میں کوئی خرگوش ایک کر دبک گیا۔ جھیل کی پرسکون سطح پر پھر ہل چل پیدا ہوئی اب کے ان لہروں پر چاند کی سنہری کشتی نہ ڈول سکی کیوں کہ وہ آسمان پر تیرتی ہوئی بدلی کی پہاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا تھا — وہ نظروں سے گولر اور نیم کے درختوں کے پیچھے بیچ میں راستہ تلاش کرنے لگا — اس کو اپنے بالکل پاس ہی وہ پکی سیڑھیاں دکھائی دیں جو شاید اس پکا م کرنے والے مزدوروں نے آہنی دفولاد کے دیوں سے بچنے کے لئے بنا رکھی تھیں۔ وہ تیز تیز قدم رکھتا جھیل کے پہلو میں آ پہنچا — چاند کو یا اس کو راستہ دکھلانے کے لئے بدلی کی چوٹی پر نمودار ہو گیا — اس نے جھیل کی شفاف سطح پر نظر ڈالی ریک نظارے ایسا معلوم ہوا جیسے آسمان کا ایک ٹکڑا زمین پر گر گیا ہے۔ وہی نیلی سطح، وہی تیرتے ہوئے روئی کے تودے اور ان پر دمکتا ہوا چاند — لیکن اسی چاند کے پہلو میں ایک زخمی لاش تیر رہی تھی — وہ ٹھٹکا۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں —

چاند پوری طرح نکھر آیا تھا جیسے زمین کی ڈھکی چھپی گندگیوں کو بہت بے دردی سے عریاں کرنا چاہتا ہو ــــ منظر کا رواں ایک پل میں خوفناک دکھائی دینے لگا حقیقتوں سے ٹکرا کر بے رونق اور بے جان ہو گیا ــ سطح پر پڑی ہوئی زخمی لاش دیکھتے ہوئے چاند کو منہ چڑا رہی تھی۔ جھیل کی سطح پر تیرنے والا چاند جیسے زمین کی گندگیوں اور پر اچھل رہا تھا۔ دھند کی طرح چھٹی ہوئی چاندنی مدھم پڑ رہی تھی سایہ کالا کالا سا چاند کو دبوچ رہا تھا یا شاید چاند خود ہی منہ چھپا رہا تھا ــ اس نے چلتے چلتے لاش پر آخری نگاہ ڈالی ــــ میں عورت ہوں ــ عورت جس نے تمہیں جنم دیا ــ عورت جو [illegible] ہے ــ اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلے ــ ہم بدلہ لے کر رہیں گے!! اور وہ تیز تیز چلنے لگا۔

اس کے قدموں میں [illegible] پگڈنڈی [illegible] سرسبز کھیتیوں میں بل کھاتی ہوئی نہ جانے کہاں تک چلی گئی تھی، چھوٹے چھوٹے پودے نئی فصل کی آنے والی خوشیوں کی بشارت دے رہے تھے۔ وہ گردوپیش پر اچٹتی نگاہیں ڈالتا تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ قدموں کے نیچے تیزی سے سرکتی ہوئی پگڈنڈی پر نظریں جمائے وہ اپنے اطراف سے قریب قریب بے نیاز ہو گیا تھا ــ خود اس کے اپنے ذہن میں اس وقت ایک اور ہی دنیا ابھر رہی تھی۔ ایک ایسی دنیا جو اسی دنیا کے بطن سے جنم لے رہی تھی۔ سنہرے رنگ روپ سے نکھری، پیاری، پیاری [illegible] اور [illegible] سے پاک۔

خیالات [illegible] اس کے ذہن میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ کبھی ایک موج ابھرتی کبھی دوسری اس کے پیچھے دوڑتی ــ [illegible] اس کے ذہن میں [illegible] وہ سوچ رہا تھا چند ہی دنوں میں ہماری زندگیوں میں کتنا بین فرق پڑ گیا ہے ــ آج سے چند ماہ پیشتر [illegible] اپنی موت کے مترادف سمجھتا تھا۔ اس کو اور اس کے ساتھیوں کو اس کا احساس [illegible] تھا کہ ان کی کنگالی اور افلاس کے ذمہ دار یہی سیٹھ ساہوکار اور [illegible] ہیں۔ ان کا [illegible] دن بدن [illegible] قرضوں کے بوجھ تلے دبا رہا تھا [illegible] اپنی آدھی جائداد [illegible] انھیں کچھ سوجھتا نہ تھا کہ کس طرح ان دیوتاؤں کا احسان چکائے ــ دیکھتے دیکھتے [illegible] اس کے بوڑھے باپ [illegible] نوجوان [illegible] سینہ پیٹتے ہوئے [illegible] کچھ [illegible] تھا۔ ایسے کتنے غریب تھے جو ان ٹھیکہ داروں کے [illegible] کولہو کے بیلوں کی طرح سر جھکائے [illegible] ان سپوتوں نے انھیں اپنی اہمیت سے آگاہ کیا ــ انھیں سکھایا کہ [illegible] جو ہاتھ درختوں میں پھل پھول لا سکتے ہیں وہی ہاتھ ان [illegible] کو توڑ بھی سکتے ہیں ــ کتنی پیاری تھی وہ آواز ــ جو [illegible] آتمائیں مسکرائیں ــ آتمائیں کسمسانے لگیں ــ آنسوؤں سے گدلائی ہوئی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی ــ وہ دست و بازو جو اپنی قوت سے واقف نہ تھے انھیں اپنے [illegible] ہونے کا احساس ہوا ــ تاریکی میں ایک شمع جلی اور مفلوج انسانیت اپنی ساری قوتوں کو جمع کر کے اٹھی ــ کچلے ہوئے، دبے ہوئے آدمی آہن و فولاد کے دیو بن گئے ــ نیا مورچہ بنا ــ عوام کا مورچہ [illegible] اور سب خس و خاشاک بہہ گئے۔ کوئی نہ ٹکا اس محاذ کے آگے۔

سرسبز پگڈنڈی پر بکھرے ہوئے دھان کے پودے اس کے قدموں کو چومتے ہوئے پیچھے چلے گئے۔ اس کی نظریں دور تک لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو چومنے لگیں ــ جیسے کوئی فنکار اپنے آرٹ کا کمال دیکھ رہا ہو، جیسے کوئی خالق اپنی تخلیق پر پھولا نہ سما رہا ہو غیر شعوری طور پر اس کے ہاتھ کھیت کی طرف اٹھ گئے ــ کومل پودوں کو ہاتھ سے تھپکتے ہوئے اس نے عجیب لذت محسوس کی، ایسی لذت جو فطری بھی ہے ابدی بھی ــ اس کی آنکھوں میں وہ مناظر گھومنے لگے جب پہلے پہل اس نے اور اس کے گاؤں والوں نے اپنے "پنچایتی [illegible]" جوتے تھے۔ نہ لٹیروں کا کھٹکا تھا نہ رہزنوں کا خوف۔ نہ اس نام نہاد عوامی حکومت کے ہتھکنڈوں کا ڈر تھا جو جمہوریت [illegible] یہ فاقہ زدہ کسانوں سے ہر سال لیوی وصول کرتی تھی۔ جو کم داموں پر غلہ ہی نہیں خریدتی بلکہ ان کی زندگی خرید لیتی تھی ــ نہ انھیں ان ظالم جاگیرداروں اور [illegible] کی پروا تھی جو خدا اور بھگوان کے نام پر قرض دیتے اور بعد میں خون پسینہ [illegible] تک وصول کرتا

تھے ۔۔۔ وہ پوری طرح آشنا تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ پودے جھوم جھام کر اٹھیں گے۔ پھر دانے نکلیں گے، پون بہکے گی اور دھان پانی پودے متوارے بڑھتے جائیں گے ۔۔۔ بڑھتے جائیں گے ۔۔۔ اور پھر کھلیان ہمارا ہوگا ۔۔۔ "ہرق" اس کا ایک پاؤں ذرا سا نشیب میں بہتے ہوئے نالے میں اتر گیا۔ پگڈنڈی ایک گھنے ببول کے پیڑ کے پاس ختم ہو گئی۔ اس کو کچھ ہی فاصلے پر ایک دو دیئے ٹمٹماتے ہوئے دکھائی دیئے۔ پھر فوراً ہی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیں لیکن ان آوازوں سے وہ سمجھ گیا کہ گاؤں اتنا قریب نہیں ہے جتنا کہ وہ ٹمٹماتی ہوئی روشنیوں کو دیکھ کر خیال کر رہا ہے ۔۔۔ وہ رکا، کہیں میں بھٹک تو نہیں گیا ہوں؟ ۔۔۔ پھر وہ سوچنے لگا۔ اس نے خود ہی اپنی تردید کی۔ یکایک اس کی باچھیں کھل گئیں ۔۔۔ اوہ۔ اور اس نے راستہ متعین کر لیا۔ کھیتوں میں سانپ کی طرح لہراتی ہوئی پگڈنڈی اب ختم ہو گئی تھی۔ وہ ایک سخت پکی واضح لکیر پر چل رہا تھا ۔۔۔ اطراف بنجر زمین تھی دودھ کی طرح پھیلی ہوئی چاندنی میں اس کی نگاہیں دور دور تک دیکھ رہی تھیں۔ کبھی کبھی اس کے پاؤں کے نیچے رینگتی ہوئی واضح لکیر پتلی کے گھنے سایوں میں چھپ جاتی تو اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ جاتا اور بہت احتیاط سے راستہ دیکھنے لگتا۔ جب اس کے پاؤں ریتیلے نالے میں جھنجھنانے لگے تو اس نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ گاؤں بہت قریب تھا۔ روشنیاں زیادہ واضح ہو گئی تھیں۔ کتوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں اور وہ اطمینان سے گاؤں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا ہر قدم تاثرات انداز سے اٹھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اس بیتے ہوئے واقعے کو دیکھ رہی تھیں جب کہ اسی گاؤں میں گاؤں والوں کی زندگی دوبھر ہو گئی تھی ۔۔۔ اسی گاؤں میں چاوڑی کے پیچھے وہ موت کے منہ سے بچ نکلا تھا ۔۔۔ اسی گاؤں میں اس کے ساس اور سسر رہتے تھے۔ وہ بیمار ساس کی عیادت کے لئے آیا تھا کہ اسی رات مسلح رضاکاروں نے گاؤں پر دھاوا بول دیا ۔۔۔ اسے گاؤں والوں سے یہ معلوم کر کے کتنا تعجب ہوا تھا کہ ان سے ہمدردی کرنے والوں میں خود اسی گاؤں کے لوگ بھی شریک تھے، جنھوں نے ایک ساتھ زندگیاں بتائیں۔ ایک ساتھ آفتیں سہیں آج وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے دیکھتے دیکھتے سارے گاؤں کو گاؤں نے لیا گیا تھا۔ عجیب حالت تھی، چیخ پکار، سراسیمگی۔ کسی میں ہمت نہ تھی کہ بندوقوں کی آوازوں میں بھاگ بھی سکیں ۔۔۔ اور پھر جب ہم نے یہ دیکھا تھا کہ گاؤں کا دیسکھ تو دشمنوں میں دھت پیر دیں کی نمائندگی کر رہا ہے، تو کیا حالت ہوئی تھی ہماری ۔۔۔ کورٹ نا ـ کہ ہوں ہماری زمینوں کو گروی رکھنے والا ہمارے مویشیوں کو چند ٹکوں میں خرید کر ہم پر احسان کرنے کی دھمکی دینے والا، ہمیں اپنا بچہ، اپنے بچے کہہ کر خون پینے والا آج ہماری آبرو بھی لوٹ رہا تھا۔ گھر گھر پھر کر نشان دہی کر رہا تھا ۔۔۔ نہ جانے کب سے واسو کی خوبصورت پر نظر تھی اس کی۔ اور واسو غریب بیچاری جان اسی نے اس کی لے لی۔ بیاہ سے پہلے ہی ان دونوں کی پریم بھری کہانیاں مشہور تھیں۔ اور واقعی بڑا سندر جوڑا تھا دونوں کا۔ آس پاس کے گاؤں میں مشہور تھے دونوں۔ کتنا دل والا تھا واسو۔ آج ہوتا تو ہمارا لیڈر ہوتا۔ لاٹھی لے کر پھرتے ہوئے شیر کی طرح ٹوٹ پڑا تھا اتنے بڑے مجمع پر۔ اور جب وہ گرا، کتنی بھیانک تھیں اس کی چیخیں۔ سرجو اس کا نام لے کر چلا رہی تھی، وہ سرجو کو پکارتا دم توڑ رہا تھا ۔۔۔ اور وہ بدکار دیسکھ جیتے جی چارپائی پر ڈٹ کر ہنس رہا تھا۔ کیسی دل ہلا دینے والی تھیں ایسی ہی دقت میں یہ سب چیخیں ۔۔۔ اور عین اسی وقت گاؤں کے چاروں کونوں سے گولیاں چلی تھیں ۔۔۔ چاروں سمتوں سے مزدوروں اور کسانوں کی جے جے کار سنائی دے رہی تھی۔ لٹیرے رضاکار ہکے بکے اپنے محسن دیسکھ کا منہ تک رہے تھے۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے مرگھٹ میں عفریت کانا پھوسی کر رہے ہوں۔ ایک سناٹا گاؤں پر چھا گیا تھا۔ چاروں طرف سے تھوڑی تھوڑی دیر کو فیر ہوتے تھے۔ اس سناٹے کو صرف سرجو کی بھیانک چیخیں توڑ رہی تھیں، کہیں کہیں کوئی کتا رو دیتا۔ یکایک سرجو چھلانگ مار کر واسو کی لاش سے لپٹ گئی تھی۔ رضاکاروں نے بڑھ کر دیسکھ کے پیٹ میں خنجر گھونپ دیا تھا اور وہ بھاگ رہے تھے۔ وہ شاید سمجھتے تھے کہ اسی دیسکھ نے یہ چال چلی تھی۔ لٹا ہوا مال جہاں کا وہیں پڑا تھا۔ مارو پکڑو اور فائر کی آوازوں میں سرجو کے قہقہوں کی آوازیں بھی گم ہو گئی تھیں۔ وہ دیسکھ کے خون میں لتھڑی ہوئی لاش کو ٹھوکریں مار کر خوب قہقہے لگانے لگی۔ بے طرح ہنسی۔ اف کیسی چڑیل دکھائی

سے رہی تھی وہ، اس کا ہندوستان جانے کہاں غائب ہو گئی تھی ——— سارے گاؤں میں صرف وہی دکھی دکھائی دیتی تھی۔ سب کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے تھے۔ گاؤں بھر میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ انصاف اور حق کے لئے لڑنے والے سپاہی مسرتوں کی ایک دنیا لئے ہوئے گاؤں میں داخل ہوئے تھے۔ سبھوں نے خوشی خوشی ان کا سواگت کیا تھا۔ دوسری صبح جب پربتوں کی چوٹیوں سے سورج نے جھانکا تھا تو کھیت ہمارے تھے۔ دھرتی ماتا ہماری تھی۔ گاؤں میں کھیتی کرنے والے ڈھور ڈنگر ہمارے اپنے تھے —— لہلہاتے کھیتوں پر اپنی جوت لٹانے والا سورج بھی اپنا دکھائی دیتا تھا۔ شام ہوئی تو آسمان پر جگمگاتے ہوئے ستارے، ستاروں کے جھرمٹ میں دمکتا ہوا چندرما سب کے سب ہماری اپنی ملکیت تھے۔ دیکھنے کو یہی چاند تارے پہلے بھی تھے۔ یہی سورج پہلے بھی نکلتا تھا۔ یہی پون پہلے بھی چلتی تھی۔ کھیت پہلے بھی لہلہاتے تھے۔ لیکن اس وقت یہ سب ہمارے ہو کر بھی ہمارے نہ تھے۔ پسینہ ٹپکا کر گیلی کی ہوئی مٹی سے جب ہم اناج اگاتے تو یہ اناج لگان اور بیوری کے بہانے نظام کے سونے اور چاندی کی ڈھیریوں میں تبدیل ہو جاتا۔ جو بچ رہتا وہ نظام کے پالے ہوئے بھیڑیوں کے دوزخ کا ایندھن بن جاتا اور ہم بھوکے رہتے —— اور اب ... اب وہی گاؤں، وہی دھرتی سب کچھ وہی ہونے ہونے بھی ہر شئے نئی ہو گئی تھی۔ ہمیں اپنی قوت کا اندازہ ہو چلا تھا۔ ہم نے اپنا محاذ بنا لیا تھا۔ متحدہ محاذ۔ غاصب قوتوں کا قبرستان۔ لٹیروں کا مرگھٹ۔ اور اس نئے محاذ پر بچے، جوان، بوڑھا، مرد، عورت سب کے سب ڈٹ گئے تھے ——— ایک گیدڑ جھاڑی سے نکل کر بھاگا ——— ہو ہو۔ اور وہ چونکا ——— اس کی اندرونی دنیا بیرونی دنیا سے ٹکرا گئی۔ اثنائے راہ میں وہ نہ جانے ان باتوں کے علاوہ بھی اور کیا کیا سوچتا رہا۔ بہرحال وہ اتنا غرق تھا کہ گاؤں کے اس قدر قریب پہنچ جانے پر بھی اس کا خیال تھا کہ اس کو اور کچھ فاصلہ طے کرنا ہے۔ وہ گاؤں میں داخل ہو گیا تو فصیل کے باہر ایک کیچڑ کے گڑھے میں دو تین سور چپڑ چپڑ کر رہے تھے۔ فصیل کے دروازے پر ڈٹے ہوئے سورما نے للکارا اور اس نے اسے مطمئن کر دیا اور آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے دوسرے سے بالکل قریب ہو گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچانا۔ اس نے ہدایت کی بموجب ساری تفصیل کہہ دی۔ پھر گھڑے سے پانی انڈیلا، غٹا غٹ پیا، اور اس سے پہلے کہ گاؤں کے سورما مسلح ہو کر روانہ ہو جائیں، وہ خود قریب کے دوسرے گاؤں کی طرف چل پڑا۔

اسے کسی حد تک جلد ولاس پور پہنچنا تھا۔ ولاس پور پنچایتی حدود سے کافی دور تھا۔ اس لئے اس کو اور اس کے چند متصلہ دیہاتوں کو نظام کے جرگوں سے محفوظ رکھنے میں ذرا مشکلات کا سامنا کرنا ہوتا تھا۔ وہاں کی جنتا لال باوٹے والوں کی ہمدرد تھی۔ عوامی لیڈر بار بار وہاں کے لوگوں سے مل کر ان کو اپنا ہم خیال بنا چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ولاس پور میں ہندو اور مسلمان شیر و شکر کی طرح رہتے تھے، اور ان کے اسی ایکے کی بناء پر رضاکار اس گاؤں کی طرف رخ کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ گو ولاس پور سے قریب ایک گاؤں میں ان بھیڑیوں نے قتل و غارت گری مچا رکھی تھی لیکن وہ ادھر نظریں نہ اٹھا سکتے تھے۔ ولاس پور ان دیہاتوں میں گنا جاتا تھا جو خوش نصیبی سے پکی سڑک کے کنارے آباد تھے۔ اور اب یہی خوش نصیبی ان گاؤں والوں کی سب سے بڑی بدقسمتی بن گئی تھی ——— دوسرے دیہاتوں کی بہ نسبت ولاس پور کا فاصلہ D.T. جر کی پکی سڑک سے کچھ زیادہ ہی تھا لیکن وہ پھر بھی انھیں دیہاتوں کی فہرست میں شامل تھا اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ ضلع کے ہزاروں اندرونی دیہاتوں میں پنچایتی نظام قائم ہو گیا تھا۔ عوامی سیلاب تعلقوں کو اپنی لپیٹ میں لے کر ضلعوں کے سنگم تک پہنچ گیا تھا اور جگہ جگہ جاگیرداری نظام کا جنازہ نکل رہا تھا۔

تو آج ولاس پور کے عوام کو ایک دوسرے ہی خطرے کا سامنا کرنا تھا۔ ہندوستان کی حیدرآباد پر پولیس کارروائی ختم ہو چکی تھی ——— بظاہر رات گذر چکی تھی لیکن دور دور تک سحر کے آثار مفقود تھے۔ ہر طرف ایک قیامت برپا تھی۔ لیکن قتل و غارت گری کے اس ہنگامے اور اس گھٹا ٹوپ اندھا دھند اندھیارے میں عوام کی ایک بڑی تعداد نے زندگی کی راہیں متعین کر لی تھیں اور اب کوئی قوت ایسی نہ تھی جو انھیں اس راستے سے ہٹا سکے ——— اس نے دل ہی دل میں بے پناہ خوشی محسوس کی کہ وہ بھی انھیں میں سے

ایک سے ہے۔ اس کی باچھیں خود بخود پھیل گئیں ــــ غیر شعوری طور پر اس نے اپنے بازوؤں کو زور سے حرکت دی۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا اس کے بازو گوشت پوست کے نہیں بلکہ فولاد سے بنے ہیں ــــ اور اس نے ایک لمبا ڈگ بھرتے ہوئے چاند کی طرف دیکھا جس کے دمکتے چہرے پر بادل کا ایک چھوٹا سا سیاہ ٹکڑا ہلکا ہلکا تیر رہا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر ذرا سے نشیب میں بہتے ہوئے پانی کی دودھیا لکیر اس کو یوں معلوم دے رہی تھی جیسے زمین پر کہکشاں اتر آئی ہو۔ جس نالے کو وہ پھلانگ رہا تھا وہی نالا چکر کاٹ کر پھر اس کے سامنے آ پہنچا تھا۔ نالے کے کنارے کنارے کیچڑ میں دبے ہوئے مینڈک اپنی بے سری رٹ لگائے ہوئے تھے۔ قریب کے چھوٹے چھوٹے پودوں میں دبے ہوئے حشرات الارض نے کائی آرکسٹرا سے کم پر اثر طرز میں مصروف تھے جیسے ان کی اس چیخ پکار کے بغیر دنیا کا نظم برقرار نہیں رہ سکتا تھا ــــ اس کے ریت پر قدم رکھتے ہی کنارے پر دبے ہوئے مینڈک بڑق بڑق کرتے پانی میں پھلانگ گئے ــــ یکایک اس کے کانوں میں اس کی اپنی کیسری کے میٹھے قہقہے گونج گئے ــــ واقعی کتنا رس ہے اس کے قہقہوں میں۔ وہ سوچنے لگا، جب وہ ہنستی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پانی سے بھری ہوئی صراحی اوندھی ہو گئی ہو اور بہتے ہوئے پانی کا البیلا پن اس کے ہونٹوں پر پھیل گیا ــــ کیا جانے تکلیف بڑھ گئی ہو کیسری کی، لیکن اسے اطمینان تھا کہ گاؤں کی سب بڑی بوڑھیاں جمع ہو گئی ہوں گی ــــ فتو دادی جنانے کے فن میں ماہر ہے لیکن اس کے باوجود بھی وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کا سر فخر سے اونچا ہو گیا ہے ــــ وہ ایک بہت اہم کام پر جا رہا ہے۔ دیس کی مائیں اور بہنیں اس کی منتظر ہیں، ایسے میں وہ کیسری کے پریم میں اپنے فرائض کو کیسے بھلا سکتا تھا اور اس کو یوں محسوس ہوا جیسے کیسری کے پیٹ کا بچہ اپنے باپ کی اس حرکت پر گھٹنوں سے تالیاں بجا رہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں کامریڈ شامو کا دس سالہ ننھا پھرنے لگا ــــ کتنا پیارا اور کیسا سمجھدار ہے وہ ــــ رضاکاروں کے خلاف جب بچوں کا ڈرامہ مظاہرہ کیا گیا تھا تو کتنی دلچسپ اور معصوم حرکت کی تھی اس نے۔ دو جتھے بنائے گئے تھے۔ ایک جنتا راج کے لئے لڑ رہا تھا دوسرا جاگیرداری کے پروردہ مسلم اقتدار کی رجعت پسند رٹ لگا رہا تھا ــــ بچوں کو جب سمجھا دیا گیا کہ رضاکار نظام اور اس کے سرمایہ پرست پٹھوؤں کے لئے عوام کا خون چوستے ہیں تو سارے کے سارے بچے برہم ہو گئے تھے ــــ کوئی بھی رضاکاروں کی صف میں لڑنے کے لئے تیار نہ تھا ــــ سب چیخ رہے تھے۔ ہم جنتا راج چاہتے ہیں، ہم عوام کے سپاہی ہیں۔ ہم نظام اور اس کے درندوں کا سر کچل دیں گے ــــ رضاکار مردہ باد۔ جنتا راج امر رہے ــــ بڑی دقت تمام ان میں سے چند کو سمجھا کر رضاکاروں کی ٹکڑی بنائی گئی تھی ــــ وہ بچے کتنے دکھی اور مغموم دکھائی دے رہے تھے جنھیں رضاکاروں کی صف میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ عوامی جتھے کا ہر چہرہ خوشی و مسرت سے تمتما رہا تھا۔ بچوں کو اس کا احساس تھا کہ وہ حق پر ہیں، وہ انسانیت کے دکھوں کا مداوا ہیں ــــ اور دوسرے سوچ رہے تھے کہ وہ آدمیت کا کلنک ہیں۔ عوام کے جائز مطالبات کے خلاف وہ حکومت کی اس کھوکھلی مشنری کی بقا کے لئے لڑ رہے ہیں جو زندگی کی نعمتوں سے انسانیت کو متمتع ہونے نہیں دیتی ــــ جب لڑائی شروع ہوئی تو ان بچوں میں وہ جوش و خروش نہ تھا جو مجاہدوں کے خلاف تھے ــــ وہ سوچنے لگا صحیح تربیت اور سچا احساس آدمی میں کتنے جوہر پیدا کر دیتا ہے ــــ اور پھر اس کی آنکھوں کے آگے اس کا پسندیدہ منظر مجسم ہو گیا۔ کامریڈ شامو کے ننھے نے کیا کیا۔ بڑے سے بڑے لڑکے کو پچھاڑ دیا تھا۔ اس کے غصے کا یہ عالم تھا کہ وہ بغیر کسی رحم و کرم کے نیچے پڑے ہوئے لڑکے کے نرخرے کو اپنی مضبوط گرفت میں لے کر پوری قوت سے دبا رہا تھا ــــ سبھوں نے اسے کھینچ کر جدا کرتے ہوئے سمجھایا کہ یہ لڑکا بھی تو اپنا ہی ہے ــــ شامو نے اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا، دیکھو وہ تو تمہارا دوست ہے، عوامی فوج کا جری سپاہی ــــ تب کہیں ننھا چونکا کہ وہ مظاہرہ تھا، ورنہ وہ سب کچھ بھلا بیٹھا تھا۔ وہ ننھے کی اس دلچسپ حرکت کے محرکات پر غور کر رہا تھا۔ صحیح تربیت اور صحیح تعلیم کے کیسے اچھے اثرات مترتب ہو سکتے ہیں ــــ ننھے کا جوش و خروش اور اس کے مخالف لڑکے کی ہراسانی۔ ایک اپنے ضمیر کی آواز سے مطمئن تھا اور دوسرا ــــ اونگھتا ہوا ایک درخت پوری طرح سے روشنی میں نمایاں ہو کر فوری دھندلا گیا، اور ساتھ ہی اس سرعت سے اپنے خیالات

یہ دھندلی رات! ہر آن وہ بھی چراغیں دھندلکوں میں جا بسا ـــــ کاش غلط قیادت دیس کے نوجوانوں کو تباہ نہ کردیتی ـــــ کاش یہی قومیں کسی صحیح تحریک کا ساتھ دے سکتیں ـــــ آدم کے یہی بیٹے جو آدمیت کا مستقبل بن سکتے تھے اب مستقبل کی پیشانی کا داغ بن گئے ہیں۔ ایسا داغ جو مٹ نہیں سکتا ـــــ فراٹے بھرتی ہوئی ایک موٹر اس کے آگے سے نکل گئی ـــــ وہ جیسے کسی نیند سے چونک اٹھا ـــــ پلی مٹرا کے اتنا قریب آگیا ہوں میں۔ نہ جانے اپنے خیالات میں کب تک گم رہتا ـــــ ہو سکتا تھا کہ یہ موٹر اور کچھ دیر سے گزرتی تو کچلا ہی جاتا میں ـــــ اور وہ سوچنے لگا، ایسی فالتو موت ہوتی۔ اس کے پاس موت کے بھی افادی اور غیر افادی دو پہلو تھے ـــــ اس کے ذہن نے پھر اپنا سلسلہ قائم کر لیا ـــــ موت سے میں نہیں ڈرتا لیکن ایسی فالتو موت کے لئے بھی تیار نہیں ہوں جو نہ صرف غیر افادی ہے بلکہ مضحکہ خیز بھی ـــــ ٹکرا کر مر جانا۔ کنویں میں گر کر مر جانا، اتفاقی حادثہ ہی سہی لیکن اس سے انسان کی عقل کے دیوالیہ پن کا ثبوت ملتا ہے ـــــ موت تو وہ ہے جو حقائق کے لئے باطل سے لڑتے ہوئے واقع ہو ـــــ جیسے اب میں خود چل کر موت کے منہ میں جا رہا ہوں۔ یہ موت میرے لئے کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ـــــ شوکتی اور سنسناتی ہوئی گولیوں کا مجھے خوف نہیں۔ زمین کے پرخچے اڑا دینے والے بموں کی مجھے پروا نہیں ـــــ میں شوکتی ہوئی گولیوں میں مسکراؤں گا ـــــ پھٹتے ہوئے بموں میں ہنسوں گا۔ واقعی ایک وقت موت کتنی بھیانک اور کتنی حسین ہے۔ جب آدمی کو اس کا یقین ہو جائے کہ وہ مرنے کے بعد بھی نہیں مرے گا تو موت کتنی معمولی چیز ہو جاتی ہے کتنی ادنیٰ ـــــ اس کو یکایک خیال گزرا۔ موت پر مسکرانے کا سلیقہ اس نے اپنی [illegible] سے سیکھا ہے ـــــ وہ کہتی تھی کہ ہمارا مستقبل ایک ٹمٹماتی، ایک رقص کرتی زندگی سے بہتر ہو گا، اور آج اس زندگی کی پذیرائی میں ہم مر بھی جائیں تو ہم امر ہو جائیں گے ـــــ سوچو کیسے دن ہوں گے وہ جب انسان کی موت صرف ایک بار آئے گی۔ وہ اور [illegible] زندگی ہی میں ہزار بار نہیں مرے گا ـــــ بھوک اگلتی ستم زدہ زندگی، بدن [illegible] ہے کپڑا نصیب نہیں ـــــ اور جانتے ہو ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ موت [illegible] اختیار میں نہیں ـــــ کیا یہ زندگی موت سے بہتر ہے؟ کیا موت اس زندگی سے زیادہ بھیانک کوئی شئے ہے!! ـــــ تم جانتے ہو! جب میں یہ سوچتی ہوں تو مجھے اپنے اطراف سے نکلتی ہوئی گولیوں کی آوازیں یوں معلوم دیتی ہے جیسے میرا محبوب کسی بھیانک قبرستان میں کھڑا ہوا مجھے منہ موڑ کر بلا رہا ہے ـــــ تم ہی بتاؤ اب میرے لئے اس قبرستان میں کون سا خوف رہ جاتا ہے جو میں تمہیں [illegible] ـــــ وہ سوچنے لگا، واقعی مستقبل ہمارا محبوب ہے اور ہم حال کے قبرستان سے نہیں ڈر سکتے۔ اور پھر جس تحریک کو ایسی بیٹیاں ملیں وہ ظلم و استبداد سے نہیں رک سکتی ـــــ ہر لڑکی جھانسی کی رانی، ہر لڑکی چاند سلطانہ، ہر شخص ٹیپو، ہر شخص ارجن ـــــ جب عالم یہ ہو تو موت بیچاری آنکھیں ملاتے شرمائے گی نہیں تو کیا کرے گی ـــــ "من تنی" پاس ہی گھاس کی گری سے آواز آئی۔

وہ اپنی داخلی دنیا سے باہر نکل آیا۔ اس کو پہلی بار اپنے خیالات کے منقطع ہونے کا افسوس ہوا ـــــ وہ اپنے خیالات کی بہتی ہوئی ندی میں بہت شانت ہو کر بہا جا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس مسئلے کی ساری جزئیات اور تاویلات پر غور کرتا رہے۔ آج اس کو موت جیسی خوفناک طاقت اپنے آگے حقیر اور بے بس معلوم دے رہی تھی۔ وہ کسی قیمت پر اس لذت کو کھونے کے لئے تیار نہیں تھا جو ارجن اور ٹیپو کی صف میں اس کو لا کھڑا کرنے کے بعد اسے حاصل ہو رہی تھی۔ اس نے بادل ناخواستہ گھاس کی گری کی طرف دیکھا۔ کوئی مشٹنڈا بیل گری سے گھاس کھینچ کھینچ کر کھا رہا تھا۔ بعض وقت جمی ہوئی گھاس تودے سے نکل نہ پاتی تو تھوتھنی گھسیڑ کر جھٹکے سے پھرتا اور گھنٹیاں بج اٹھتیں ـــــ مشٹنڈے بیل سے ہٹ کر اس کی نظر ایک بڑے چمڑے کے ڈول پر پڑی جو "موٹ" کی چرخی سے نیچے لٹک رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت بڑی چمگادڑ جھول رہی ہو ـــــ باولی ایک کانٹے لگے احاطے کے بیچوں بیچ واقع تھی۔ باولی کے اطراف پرال اور جوار کے سوکھے ٹھنٹھ کی ڈھیریاں پھیلی ہوئی تھیں ـــــ وہ سمجھ گیا یہ جام خاں نقشبندی کا احاطہ ہے ـــــ جام خاں نقش بندی سنتے ہیں کسی بڑے ولی اللہ کے گھرانے سے ہے۔ اس کے جد اعلیٰ کے متعلق مشہور تھا کہ بڑے جلالی بزرگ گزرے ہیں۔ بعض لوگ تو یہ بھی کہتے کہ اگر جام خاں کو کوئی نقصان پہنچاتا تو اس کے جد اعلیٰ اس کو تباہ کر کے ہی رہتے تھے۔ جام خاں خود اتنا ظالم تھا کہ اس کے ظلم کی وجہ سے بعض

لوگ اس کے جد اعلیٰ کی بھی پوجا ارچنا کرنے میں دریغ نہ کرتے لیکن ان میں بہت سارے ایسے بھی تھے جو محض جام خاں سے خوف کھاتے بلکہ اس کی مدد کرتے اور بعض کھاتے پیتے گھرانے تو جام خاں کے گھر پیشگی غلہ فراہم کر دیتے۔ ان کا خیال تھا کہ جام خاں کا غلہ قبول نہ کرے تو نئے سال کی فصلوں کا خراب ہونا لازمی ہے۔ بہت کم ایسا موقع آتا تھا کہ جام خاں غلہ قبول نہ کرے اور فصلیں خراب ہوں۔ دیہاتی کاروں کا زور ختم ہوا تو جام خاں نقشبندی بھی ان کا سپہ سالار بن بیٹھا تھا اب کیا تھا گویا اس کے مظالم کو قانونی حیثیت سے قبول کر لیا گیا تھا چنانچہ سپہ سالار بنتے ہی اس نے پہلا کام اپنے جد اعلیٰ کی خوشنودی کے لئے یہ کیا کہ گاؤں والوں پر زیادتی کر کے عرس کے لئے چندہ جمع کرنے لگا۔ اس نے تلواروں اور بندوقوں کی دھونس پر کتنا چندہ جمع کیا تھا۔ یہ تو وہ خود جانتا تھا یا اس کے جد اعلیٰ جانتے تھے ۔۔۔ نہ جانے جام خاں کہاں چلا گیا اب۔ سنتے ہیں پارٹی کا قبضہ ہو جانے پر وہ بندوق بھرا اپنے ساتھیوں سمیت کسی سوکھے کنوئیں میں چھپا رہا ——— جام خاں کے احاطے کو چھوڑ کر وہ اب سیدھی گاؤں میں داخل ہونے والی چوڑی سڑک پر چل رہا تھا —— سڑک کی دونوں جانب گل مہر اور املتاس اور آم کے تناور درخت کھڑے تھے۔ درختوں کی ٹہنیاں پھیل کر ایک دوسرے سے مل گئی تھیں جیسے بوڑھے کاہن سر جوڑے ہوئے کسی گہری سازش میں مصروف ہوں —— انھیں درختوں کے گھنے سایوں سے سڑک کافی تاریک سی ہو گئی تھی لیکن پتوں سے چھن چھن کر جھلملاتی روشنی کے دھبے یوں معلوم ہو رہے تھے جیسے سیاہ چادر پر ٹیڑھی میڑھی اشرفیاں بکھر گئی ہوں اور وہ ان اشرفیوں کو روندتا گذر رہا تھا ——— درختوں کے اس سلسلے کے ختم پر ہی وہ گاؤں میں پہنچنے والا تھا۔ وہ کئی بار اس راستے سے گذر چکا تھا اس لئے اسے معلوم تھا کہ سڑک پر سایہ کئے ہوئے ان بوڑھے جادوگروں کا ساتھ گاؤں کے صدر دروازے تک رہے گا۔ گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے اس نے اپنی اہم تیاریاں کر لی تھیں —— وہ اب بوڑھے کمہار کے مکان کے قریب پہنچ گیا تھا جہاں سے گاؤں شروع ہو جاتا تھا۔ چکوے کی جوڑی کسی درخت سے مسلسل چیخ چنگھاڑ رہی تھی ۔۔ کبھی یہی چکوا چکوی اس کی زندگی میں بہت اہمیت حاصل کر گئے تھے۔ وہ کبھی کسی کام پر ہوتا اور چکوا چکوی چیخ اٹھتے تو اس کو یقین ہو جاتا کہ اب اس کا کام نہیں بنے گا —— کئی بار تو ایسا بھی ہوا تھا کہ چکوا چکوی کی آواز سے گھبرا کر اس نے اپنا کام ادھورا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ جب کبھی کسی ضروری کام پر جاتا تو درختوں کے نیچے سے اس طرح پاؤں دبا کر گزرتا گویا رکھوالے کی چوری سے درخت کے قیمتی پھل توڑنا چاہتا ہو لیکن اس کے دل کی تہوں میں وہی ایک خوف کارفرما ہوتا —— اگر چکوا پکار اٹھے تو اگر چکوے نہ بول اٹھے تو ——— اور اگر بالفرض کوئی چکوے کی جوڑی چیخ پڑتی تو جیسے اس پر بجلی گر پڑتی اور اس کی حالت اس ڈاکو کے مشابہ ہو جاتی جو انتہائی دانشمندی سے لوہے کی تجوری میں محفوظ رکھی ہوئی نقدی کو اپنی گرفت میں لے لے لیکن اس کا ہاتھ تجوری میں پھنس جائے اور گھنٹی بج اٹھے —— وہ ہنس پڑا واقعی کیسے کیسے وہموں کا شکار رہتا تھا وہ۔ کتنی مضحکہ خیز ہے یہ بات کہ انسان کی زندگی میں جنگل کے حقیر پرندوں کا اتنا دخل ہو جائے۔ لیکن اس کو یوں معلوم ہوا جیسے وہ خود کو جھٹلا رہا ہے اور یہ خوف اب بھی اس کے دل و دماغ کے تاریک گوشوں میں کہیں کہیں چھپا بیٹھا ہے وہ جھلا اٹھا اسے لگا محاذ کے ارجن اور بھیم اس پر استہزا کرنے لگے —— چیخ چیخ کی آواز کی طرف نظریں پھیر کر وہ پھر ایک بار مسکرایا۔ داہنے کندھے سے بندوق بائیں کندھے پر لٹکا لی اور یہ بھی بھول گیا کہ بندوق کی نالی اس کے زخم سے مس ہو رہی ہے جو ابھی پوری طرح مندمل نہ ہونے پایا تھا۔

گاؤں میں داخل ہو کر جب وہ لمباڑوں کے "ٹانڈے" میں پہنچا تو وہاں پر گاؤں کے بہت سارے لوگ جمع تھے۔ سب کے سب حلقہ باندھے نئے مورچے کی باتیں کر رہے تھے۔ ٹانڈے کے کتے ادھر ادھر بیٹھے کان کھڑے کر کے اس طرح یہ باتیں سننے میں مصروف تھے جیسے وہ بھی متحد ہو رہے ہوں —— بیجرا بائی کا ساجا شاید سو سو کر اٹھ بیٹھا تھا۔ جب سے اس کی ماں لمباڑنوں کا بھدا بدوضع لباس چھوڑ کر ساری پہننے لگی تھی۔ ساجا بہت خوش خوش دکھائی دیتا تھا۔ اس کی ماں جب کبھی اس کو اپنی آغوش میں کھینچتی تھی تو اس کے ننگے بدن پر ماں کی چولی اور لہنگے پر ٹنکے ہوئے کانچ اور شیشے کے ٹکڑے بری طرح چبھتے تھے۔ جب سے ان کا گاؤں لال بولے والوں کے قبضے میں آیا تھا ساجا بہت خوش تھا —— اس کی خوشی ایک نہیں کئی اسباب پر مبنی تھی۔ وہ سب سے زیادہ خوش تو اس بات پر تھا کہ اگلے دنوں کی طرح

ہونی مانگنے پر اس کی ماں جھڑکتی اور ہوستی نہ تھی ۔۔۔ اس کے ننگے بدن پر کمر کی ڈوری اور گلے میں تعویذ کے بجائے قمیص اور چڈی بار دکھانے لگے تھے۔ اس کی ماں اس کو اپنے گود میں کھینچتی تو وہ خوشی سے اس کی آغوش میں دبک جاتا کیونکہ ایک تو خود اس کے بدن پر کپڑے تھے اور پھر اس کی ماں نے بھی وہ بھاری بھرکم "جوا" اپنے بدن سے اتار پھینکا تھا جس سے سر جوڑ دل ہی دل میں خوف کھاتا تھا ۔۔۔ اور پھر یہ خوشی اس کے لئے کچھ کم نہ تھی کہ اس کی ماں کے لہنگے اور چولی میں ٹنکے ہوئے سارے کے سارے کانچ اور پیتل کے گول گول ٹکڑے ۔ کافور اور لاکھ کے دو دو تین تین انگل چوڑی اور موٹی موٹی ٹکڑیاں سب کی سب اس کو کھیلنے کے لئے مل گئے تھے ۔۔۔ اس کے ٹھنڈے دے جتنے ساتھی تھے سب اس کے پاس کھیلنے کے لئے ایسی بہت ساری اشیا جمع ہو گئی تھیں ۔ ایک چیز اور بھی تھی ۔ اس کا باپ اس کی ماں سے ان دنوں بات بات پر ٹھٹھول کرنے لگا تھا ۔ اب وہ پہلے کی طرح آنکھیں نکال کر اس کو گالیاں نہیں دیا کرتا اور اسی وجہ سے اس کی ماں بھی اسے جھٹ پچکارنے لگی تھی ۔۔۔ ورنہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ اس کے باپ نے اس کی ماں کو ٹھیک کیا اور وہ دوڑی ساجا کی گدی تھپکانے لگانے ۔ بہرحال وہ سوچتا ہوگا کہ جب سے ان "ناٹیٹوں" سے میل ملاپ ہوا ہے کچھ اور ہی لیل دنہار ہیں ۔۔۔ اس وقت جس وقت وہ پہنچا ہے ساجا بھی ماں کی گود میں بیٹھا اپنے باپ کے اس طرح بے اختیار بند ہو کر نکل پڑنے سے متعلق سوالات کر رہا تھا اور وہ ساجا کی باتوں کا جواب دینے میں منہمک تھی ۔۔۔ ساجا کے ایک سوال کے جواب میں وہ کہہ رہی تھی کہ ۔۔۔ "ہاں بٹیا ۔ سرکا بھی جنتا سنگ نہیں جانتی ۔ یوں کہنے کو تو وہ جنتا کو جھوٹ موٹ یقین دلاتی ہے کہ وہ بھی جنتا کی سیوا کرنے ہی کے آزادی سمجھتی ہے لیکن اس کی زبان پہ کچھ ہو تو اس کے من میں کچھ اور ہی بسا ہے ۔۔۔ اگر یہ سرکار جنتا راج چاہتی تو ہمیں کچلنے کے لئے اپنی سینا کیوں بھیج دیتی" ۔۔۔ "سچ کہتی ہے اماں ۔ وہ پکار رہا تھا ۔ میں آج ہی تمام ساتھیوں کو جمع کر کے یہ سب باتیں بتلا دوں گا" ۔۔۔ منجو بائی کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس نے جوش میں اچھلتے ہوئے ساجا کو اپنی گود سے الگ کرتے ہوئے پیٹھ کو آہستہ سے سہلایا ۔۔۔ ساجا شریر نظروں سے دیکھتا ہوا چلایا !

"اماں تو جن کیوں نہیں دیتی جلدی سے ، میں اس کو ساتھ لے کر جنتا راج کے لئے لڑوں گا ماں" ۔۔۔ اور سب کے سب ہنسنے لگے ۔

۔۔۔ اس کو اکیلا ہی لوٹنا پڑا کیونکہ یہاں سے پہلے ہی مدد جا چکی تھی ۔ پکی سڑک سے قریبی گاؤں کو لوٹ مار سے بچانے کا فیصلہ ہو چکا تھا ۔ ضلع کے اندر والے گاؤں [illegible] کی وجہ سے محفوظ تھے ۔ فوجی بھیڑیئے لال دھرتی میں داخل ہوتے ہوئے گھبراتے تھے ۔ سڑک والے گاؤں کی حفاظت بہت ضروری تھی ۔۔۔ فوج کے ضلع میں داخل ہوتے ہی عوام دشمن عناصر نے لوٹ مار شروع کر دی تھی ۔۔۔ اس نے سیدھا دلاس پور کا رخ کیا ۔ دلاس پور کے قریبی گاؤں لٹ چکے تھے ۔۔۔ وہ تیز تیز چلنے لگا ، اس کا ذہن بالکل خالی ہو گیا تھا ۔ صرف ایک ہی خیال اس کے ذہن پر ہتھوڑے چلا رہا تھا ۔۔۔ تیز چلنا چاہیے ۔۔۔ اور تیز ۔۔۔ اور تیز ۔

اور اب سحر قریب تھی لیکن ابھی تک عوامی سپاہی گاؤں کو گھیرے ہوئے محاذ پر ڈٹے ہوئے تھے ۔ خطرہ دور ہو گیا تھا ۔ لٹیرے بھاگ نکلے تھے ۔ بچے ماؤں کے سینے سے لگے مزے سے گھروں میں سو رہے تھے ۔ بوڑھیاں شاید نوجوانوں کو دعائیں دے رہی تھیں ۔ ۔۔۔ اور بربریت انسانیت سے ٹکرا کر پسپا ہو چکی تھی ۔ مسجد اور مندر ۔ ایک نئے انسان کو جنم دے رہے تھے جو نہ مسلمان تھا نہ ہندو بلکہ صرف انسان ۔ خداؤں اور دیوتاؤں سے بزرگ و برتر انسان ۔ فرشتوں سے بلند تر مخلوق ، اعلیٰ ، ارفع ، افضل ، اشرف ۔

●

صبا نے پھر در زنداں پہ آ کے دستک دی
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

فیض احمد فیض

علی اختر

دل جمع نہ ہو تو شادمانی کیسی ساغر ہو تہی تو خوش بیانی کیسی
احساس کے ہمراہ ہے جینے کا مزا احساس نہ ہو تو زندگانی کیسی

ہر رند تہی جام نظر آتا ہے ہر بزم میں کہرام نظر آتا ہے
جب فکر نہ ہو محرمِ اسرارِ حیات آغاز میں انجام نظر آتا ہے

خود اپنے ہی سائے سے بھڑک جاتے ہیں جانی ہوئی راہوں سے بھٹک جاتے ہیں
دنیا میں کچھ ایسے بھی ہیں بیگانۂ ہوش پیتے نہیں ہر چند بہک جاتے ہیں

بھولی نہیں اب بھی تو انھیں دانشِ خام آقا نے سکھائے تھے جو اندازِ خرام
آزادی کی صدیاں تو گذر جانے دو آزاد کہیں ہوتے ہیں صدیوں کے غلام

جگن ناتھ آزاد

اے فصلِ خزاں کی روح! اے جانِ بہار
اے جلوۂ آفتابِ نو! اے شبِ تار
اے یادِ حبیب! تو کہاں سے آئی
اے خلد بدوش! اے جہنم بہ کنار

کل تک یہ گھٹا سرور برساتی تھی
گردوں سے پیامِ سرمدی لاتی تھی
آج اس نے شراب بدمزہ کر دی ہے
یہ خود ہی کبھی شراب بن جاتی تھی

رگ رگ میں نشہ بن کے مچلنے والے
نس نس میں درد بن کے ڈھلنے والے
آ، تاکہ قرار میری نظروں کو نہیں
اے روح میں کروٹیں بدلنے والے

مجھ سے بھی نہ دل کا حال کہنا تیرا
امواجِ غم و درد میں بہنا تیرا
اب تو ہی بتا نگاہ کب تک دیکھے
اس عمر میں یوں اداس رہنا تیرا

جلتی ہوئی آگ میں اترتا ہوں میں
تلوار کی دھار سے گزرتا ہوں میں
اے میری نظر سے دور جانے والے
اس طرح سے تجھ کو یاد کرتا ہوں میں

شعلہ سا ہواؤں میں بھڑکتا ہوگا
احساس شمیم کا بھٹکتا ہوگا
جس وقت تجھے خموش پاتی ہوگی
دل موجِ نسیم کا دھڑکتا ہوگا

خلیل الرحمٰن اعظمی

○

پیتا ہوں جو مے تو مجھ کو پینے دو ابھی
سب زخم ہرے ہیں ابھی سینے دو ابھی
بیمار ہوں پھر بھی نہیں مرنے کا ابھی
بیمار ہوں لگا مجھ کو جینے دو ابھی

●

بازار سے چھپائے ہوئے ہیں دل کے یہ داغ
لاؤں نہ بزم میں کہ ٹوٹا ہے ایاغ
جو مجھ پہ پڑی ہے سو اب اس کو کیا سمجھیں
کیا پائے اندھیروں کے طلبگار یہ چراغ

●

یہ سوچ کے جب حضرتِ انساں نکلے
سمجھا کہ پایا ہیں یہ بھی تو ارماں نکلے
جو کام و دہن ساز تھے ان کی مستی پہ
واعظ سے بھی کچھ بڑھ کے وہ ناداں نکلے

●

جن کا نہ کوئی کام نہ کچھ دھندا ہے
شکوہ بھی اس کا ہے سبھی اس کا ہے
جی چاہتا ہے ان سے یہ پوچھیں کہ حضور
آئینہ کبھی آپ نے دیکھا ہے؟

●

باقر مہدی

غفلت کا بھی عنوان بدل جاتا ہے
بیزاری کا اک دور نیا آتا ہے
اب اہل خرد خوش ہیں کہ دیوانہ بھی
محفل میں نئی شمع جلا جاتا ہے

میخانے میں جانے کا یہ ہنگام نہیں
ہنگامہ اٹھانے کا یہ ہنگام نہیں
اس غم کو امیدوں کا جنازہ نہ کہو
اس غم کو مٹانے کا یہ ہنگام نہیں

اک خواب کی تعبیر حقیقت ہی نہ ہو
انداز تغافل میں محبت ہی نہ ہو
خوابوں سے حقیقت کو سمجھنے والو
ممکن ہے تخیل ابھی صداقت ہی نہ ہو

ہر رات امیدوں کی سحر لاتی ہے
ہر روز محبت کی خبر آتی ہے
انسان کی تقدیر کے مالک سے کہو
اس دور میں تقدیر بدل جاتی ہے

شہاب جعفری

تاریخ کہن کا مر رہا ہے انساں
انساں کی قدر کر رہا ہے انساں
سورج کی طرح پہلوئے گیتی سے شہاب
اک اور نیا ابھر رہا ہے انساں

ہر رند کو شاد کام کر دے ساقی
اک قطرہ بھی ہو تو عام کر دے ساقی
ہم نے تجھے نظم میکدہ سونپا ہے
اک جام کے لاکھ جام کر دے ساقی

لبریز تھا جامِ صبر، چھلکانا پڑا
ظلمت میں چراغ دل کو جل جانا پڑا
کب تک نہ شور و غم ابھرتا آخر
حالات کی رحمتوں کا گن گانا پڑا

اے حوصلۂ جہد و عمل اور مچل
اے مرحلۂ حیات آنکھیں نہ بدل
اے معرکۂ غم و نشاط اور بھی تیز
اے قافلۂ عمرِ رواں بڑھتا چل

اس رات کا نشہ چڑھ چلا ہے جھکیں
زلفیں تو بکھیر دے کہ دونوں مہکیں
دکھڑے تو بہت ہیں دکھ کے دن کاٹنے تک
آ دو بھی کہ دو گھڑی کو لہکیں بہکیں

راس آئی نہ ہمدردوں کی صحبت ہم کو
دنیا سے نہ ہو سکے گی نفرت ہم کو
اکتا کے غموں سے کیسے مر جائیں شہاب
جینے کی پڑی ہوئی ہے عادت ہم کو

سہیل عظیم آبادی

بیٹے کی موت

اعظم خاں جب ستارہ کو ساتھ لے کر خان پورہ پہنچا، تو ہر طرف سنسنی پھیل گئی۔ گاؤں میں ایسی بات کبھی نہ ہوئی تھی کہ کوئی پٹھان بازار میں بیٹھنے والی رنڈی سے نکاح کرے اور اسے اپنی بیوی بنا کر گھر میں رکھے۔ اگر کبھی کسی نے کسی کم ذات کی عورت سے بیاہ کر بھی لیا تو وہ بیاہتا نہیں بلکہ نکاحی بیوی کہلاتی تھی اور اس کے بال بچے کم ذات سمجھے جاتے تھے۔ خالص پٹھانوں سے الگ رہتے اور عام طور پر اپنے خاندان والوں کی خدمت گاری کرتے تھے۔ لیکن پورے خان پورے میں، جب وہاں کے پٹھانوں کے پاس دولت تھی، تو بھی کسی نے بازار میں بیٹھنے والی رنڈی سے بیاہ نہیں کیا تھا —— جب اعظم خاں اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا، تو اس کی ماں دروازے پر ہی ملی۔ اور سلام کے جواب میں اس نے غصے میں کہا۔

"یہ رنڈی بچی میرے گھر میں بہو بن کر نہیں رہ سکتی جہاں سے اسے اٹھالایا ہے وہیں پہنچا آ۔"

اعظم خاں پہلے ہی جانتا تھا کہ ستارہ سے بیاہ کرنے کا مطلب ایک بڑے طوفان سے مقابلہ کرنا ہے۔ لیکن اس نے بیاہ کر ہی لیا تھا اور طوفان کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔ اس نے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی اور بولا

"ماں مجھ سے غلطی ہو ہی چکی ہے، میں تمہیں بعد میں ساری باتیں سمجھا دوں گا ......"

لیکن اس کی ماں نے بات بیچ ہی میں کاٹ ڈالی —— "بے شرم کہیں کا۔ ایک تو شہر میں خاندان کا نام اونچا کرتا رہا اور اب اسے گاؤں میں لے آیا۔ لے جا اسے۔ میں گھر میں داخل نہیں ہونے دوں گی۔" اور وہ ستارہ کے ساتھ دروازہ میں داخل ہونا چاہتا تھا کہ اس کی ماں نے دروازہ بند کر دیا اور اندر سے کنڈی لگا دی اور بولی

"یہ رنڈی بچی اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ اسے جہاں سے لایا ہے وہیں چھوڑ آ —— اگر میری بات نہیں مانتا تو جہاں جی میں آئے چلا جا۔ سمجھ لوں گی کہ ایک لڑائی میں شوہر مارا گیا اور دوسری لڑائی میں بیٹا بھی مر گیا۔ جوانی میں بیوہ ہو کر صبر کیا تھا۔ بڑھاپے میں بے اولاد ہو کر صبر کر لوں گی ......"

اعظم خاں بہت دیر تک ستارہ کو ساتھ لئے دروازہ پر کھڑا رہا اور اندر سے طرح طرح کی آوازیں سنتا رہا جس کا مطلب صرف یہ تھا کہ وہ ستارہ کو ساتھ لے کر اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔ اور باہر اس سے ہمدردی کرنے والا تو ایک طرف کوئی بات سننے والا تک نہ تھا۔ سارے رشتہ دار کترائے ہوئے تھے۔ وہ ستارہ کو پہلے ہی ساری باتیں سمجھا چکا تھا۔ لیکن اب اعظم خاں کیا کر سکتا تھا۔ ستارہ اب بازار کی رنڈی نہ تھی۔ اب وہ اس کی بیاہتا بیوی تھی اور اس کی غیرت اسے کس طرح برداشت کرتی کہ جس عورت سے اس نے بیاہ کر لیا ہے اسے پھر ایک بار بازار میں اپنی جوانی بیچنے کے لئے چھوڑ آئے۔ اور اسی عزت کے جذبے سے مجبور ہو کر تو اس نے ستارہ سے بیاہ کیا تھا —— وہ لڑائی کے میدان سے واپس آیا تھا۔ اور کیمپ میں آرام کر رہا تھا ہر روز سیر کے لئے شہر جایا کرتا تھا۔ اور ستارہ کو ایک کوٹھے پر بیٹھا دیکھا کرتا تھا —— جب اسے دیکھتا تو ایسا محسوس کرتا، جیسے وہ اسی کا انتظار کر رہی ہے۔ ایک دن جوانی کے جوش میں بہک کر وہ ستارہ کے کوٹھے پر پہنچ گیا —— ستارہ خوب صورت جوان اور ملنسار تھی —— وہ وہاں ٹھہر گیا —— پھر دوسرے اور تیسرے دن —— اور دونوں کا دل مل گیا۔ پھر دونوں گھل مل گئے —— ستارہ نے کوٹھے پر بیٹھنا ہی چھوڑ دیا، اور اعظم خاں کی ہو رہی۔ اعظم خاں نے دیکھا کہ رنڈیوں کے بارے

میں اس نے جتنی باتیں سن رکھی تھیں ان میں سے ایک بھی ستارہ میں نہ تھی ۔۔۔ لیکن پھوپھی اس کے دل میں ستارہ سے بیاہ کرنے کا خیال کبھی نہ آیا تھا۔ بلکہ کبھی کبھی یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا تھا کہ ایک دن وہ ستارہ کو چھوڑ کر اپنی راہ چلا جائے گا۔ اور پھر نہ جانے اس سے دوبارہ کبھی ملاقات ہو بھی سکے گی یا نہیں۔ لیکن ایک دن سارے حالات یکایک بدل گئے۔ وہ آیا تو ستارہ نے اسے بتایا کہ اس کے بچہ ہونے والا ہے۔ اعظم خاں یہ سن کر پریشان ہو گیا۔ یہ بات اس کے دماغ میں کبھی نہ آئی تھی۔ دو تین دن تک وہ عجیب بے چینی کے عالم میں رہا۔ رہ رہ کر اسے صرف ایک ہی خیال پریشان کرتا تھا۔ اگر ستارہ کے بیٹی پیدا ہوئی تو اس کا حشر بھی ستارہ کا ہو گا۔ وہ بھی جوان ہو کر رنڈی بنے گی اور پٹھان کی غیرت اسے برداشت کرنے کو تیار نہ تھی کہ اس کی بیٹی رنڈی بن کر بازار میں بیٹھے اور اپنا روپ اور اپنی جوانی بیچے۔ اگر ایسا ہوا تو اس کے لئے مر جانے کی بات تھی۔ بہت سوچنے کے بعد اسے ایک ہی راہ نظر آئی اور وہ یہ کہ ستارہ سے بیاہ کر لے۔ چنانچہ اس نے ستارہ سے شادی کے لئے کہا اور اس نے بات مان لی۔ اور نکاح ہو گیا۔

چند دنوں تک تو اس نے کسی طرح وقت کاٹا۔ پھر چھٹی لے کر گھر آ گیا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ سپاہی کا کیا ٹھکانا کس دن آگے بڑھ جانے کا حکم آ جائے۔ وہ جانتا تھا کہ ستارہ کو ساتھ لے کر جانے کا مطلب گھر سے باہر تک سے برائی مول لینا ہے۔ وہ ماں کے غصے اور ضدی طبیعت کو جانتا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی ماں اس کی شادی کی بات اپنی بھتیجی سے طے کر چکی ہے۔ اور اسے اس کا بھی غصہ ہو گا۔ لیکن اب اس کے لئے کوئی دوسری راہ نہیں رہ گئی تھی۔ اسے صرف ایک امید تھی کہ گناہوں کی معافی مانگنے کے بعد ماں کو سمجھائے گا۔ کہ اگر بیٹی ہوتی تو اس کا کیا حشر ہوتا۔ وہ بھی رنڈی بننے پر مجبور ہوتی اور اسے تھوڑی سی امید تھی کہ شاید ماں پر یہ داؤ چل جائے۔ پھر اگر ماں دو چار دن بھی اُسے گھر میں رہنے دے گی، تو ستارہ کی طبیعت اور عقلمندی سے اسے امید تھی کہ ماں کو خوش کر لے گی اور سارا معاملہ درست ہو جائے گا

لیکن اعظم کی ماں نے اُسے کوئی موقع نہیں دیا۔ ستارہ کا سلام لینا تو ایک طرف اس کی شکل تک نہ دیکھی اور گھر میں بند ہو رہی۔ اور اسے گالیاں اور کوسنے دیتی رہی ۔۔۔ گھنٹوں وہ دروازے پر کھڑا رہا لیکن بے نتیجہ۔ اور اسی طرح کئی گھنٹے گزر گئے۔ اعظم خاں نے سمجھ لیا کہ اب گھر میں داخل ہونے کی کوشش کرنا بیکار ہے تو ستارہ کو ساتھ لے کر گاؤں کے کنارے ایک چھوٹے سے مکان میں آیا جسے اس کے باپ نے اس وقت بنایا تھا، جب وہ کھیتی کرتا تھا ۔۔۔ اور اس گھر میں بیل باندھے جاتے تھے اور ان کے لئے چارہ رکھا جاتا تھا ۔۔۔ لیکن اعظم خاں چھوٹا ہی تھا کہ اس کا باپ پہلی بڑی لڑائی میں بھرتی ہو کر چلا گیا تھا اور ایک لڑائی میں مارا گیا۔ ماں نے بڑی مصیبتوں کا مقابلہ کر کے اس کی پرورش کی۔ پھر اس نے جوان ہو کر کھیتی باڑی کی دیکھ بھال شروع کی اور مکان کی مرمت کرائی ہی تھی کہ دوسری بڑی لڑائی شروع ہو گئی اور وہ خود بھی کئی دوسرے رشتہ دار نوجوانوں کے ساتھ فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ اب یہ مکان بس شبنم اور دھوپ سے بچنے کا بہانہ تھا۔

اعظم خاں اسی چھوٹے سے مکان میں ستارہ کو لے کر آیا اور کسی طرح رہنے لگا۔ لیکن ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ اسے زیادہ دنوں تک رہنا بھی نہیں تھا۔ اسے جلد ہی واپس جانا تھا۔ اور رشتہ داروں کا حال تھا کہ کوئی اس سے بات بھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے فکر تھی کہ وہ ستارہ کو کس پر چھوڑ کر جائے۔ اس کے پیچھے اس کی دیکھ بھال کون کریگا ۔۔۔ اور اس مقصد کے لئے وہ اپنے ہر رشتہ دار کے پاس گیا، لیکن بے فائدہ۔ آخر رشتہ کے ایک بوڑھے چچا اس کی حالت پر ترس آ گیا اور اس نے ذمہ داری اپنے سر لی، وہ بھی اس شرط پر کہ ستارہ رہے اسی گاؤں سے باہر والے مکان میں یعنی پٹھانوں کی آبادی میں نہیں ۔۔۔ اعظم خاں کے لئے یہ بھی بہت بڑی بات تھی۔

وہ ہر روز ماں کے پاس آتا، اور طرح طرح اسے سمجھاتا۔ اپنی غلطی تسلیم کرتا اور معافی مانگتا مگر اس کی ماں کسی طرح نرم نہ ہوئی۔ وہ بس ایک ہی جواب دیتی کہ رنڈی کی بچی پٹھانیوں میں کیسے بیٹھ سکتی ہے اور اسے ڈانٹتی۔ آخر چھٹی ختم ہو گئی اور وہ واپس چلا گیا

اعظم خاں کے جانے کے بعد ستارہ کے بچہ پیدا ہوا۔ اس دن اس کی ماں دن بھر گالیاں اور کوسنے دیتی رہی۔ اس نے یہ بھی

سنا کہ ستارہ اور بچے کی طبیعت بہت خراب ہے۔ لیکن ٹس سے مس نہ ہوئی۔ کسی آدمی تک کو دیکھنے کے لئے نہیں بھیجا بلکہ بد دعائیں دیتا رہتا اور ہر روز بد دعائیں دیتی۔ دو بار اس نے اپنے بھائیوں کو للکارا کہ ستارہ کو مار پیٹ کر گھر سے باہر نکال دیں۔ لیکن اس کے بھائیوں نے انکار کر دیا۔ ایک تو یہ کہ اب ستارہ بہرحال اعظم خاں کی بیوی تھی اور اس کو بے عزت کرنا اعظم خاں کو بے عزت کرنا تھا۔ دوسرے اعظم خاں ترقی کر کے صوبیدار ہو چکا تھا اور وہ جانتے تھے کہ کسی فوجی کی غیر حاضری میں اس کے کسی آدمی سے لڑنا مصیبت مول لینا ہے۔ اس کی ایک رپورٹ بہت کچھ ہنگامے پیدا کر سکتی ہے اور وہ اس کے لئے تیار نہ تھے۔

ایک دن ستارہ نے دل کڑا کر کے کہلا بھیجا کہ وہ صرف سلام کرنے کے لئے آنا چاہتی ہے اور بغیر کوئی جواب پائے برقع اوڑھ کر بیٹے کو گودی میں لئے پہنچ گئی۔ اس نے سوچا تھا کہ شاید معصوم بچے کو دیکھ کر اس کے دل میں رحم آجائے لیکن اعظم خاں کی ماں نے اسے سلام کا جواب دیئے بغیر گھر سے کھڑے کھڑے نکال دیا۔ اس دن ستارہ خوب روئی اور خود اپنی موت کی دعائیں کرتی رہی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اب اس کی ساری زندگی روتے اور کڑھتے گذرے گی۔

کافی دنوں سے اعظم خاں کا کوئی خط نہیں آیا تھا اور اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ اتنا جانتی تھی کہ کہیں پھر لڑائی کے میدان میں چلا گیا ہے اور بس۔ ایک دن ایک خط آیا جس سے معلوم ہوا کہ وہ برما کے کسی مورچے پر لڑ رہا ہے۔ اس کے دو دن بعد پھر ایک خط آیا کہ اعظم خاں برما کی ایک لڑائی میں مارا گیا۔ خط میں اس کی بہادری کی بڑی تعریف کی گئی تھی اور اس کی موت پر بہت زیادہ افسوس ظاہر کیا تھا۔

اعظم خاں کی موت کا حال سن کر ستارہ کا جو بھی حال ہوا لیکن اس کی ماں نہ روئی اور نہ چلائی بلکہ ایک لفظ بولی تک نہیں جو اس کے پاس آکر ہمدردی کرتا اس کا منہ تکتی رہتی۔ نہ اس کی آنکھوں میں کسی نے آنسو دیکھے اور نہ زبان سے کوئی بات نکلتے سنی۔ البتہ وہ دو تین راتیں بالکل نہ سوئی بلکہ آنگن میں ٹہلتی اور آسمان میں کچھ ڈھونڈتی رہی اور ایک دن دوپہر کے وقت وہ بغیر کسی پردے کے گھر سے نکل پڑی اور بیچ گاؤں سے ہوتی ہوئی اس چھوٹے سے مکان میں پہنچ گئی۔ جہاں ستارہ رہتی تھی۔ پوتے کو گودی میں اٹھا لیا۔ خوب پیار کیا۔ ستارہ کو پٹا کر خوب روئی اور بہو اور پوتے کو لے کر گھر چلی آئی۔

اعظم خاں کی موت نے اب اس کی ماں کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ وہ چپ چاپ بیٹھی رہتی ہے۔ کسی سے کوئی بات نہیں کرتی۔ کوئی کچھ بولتا ہے تو اس کا منہ تکتی رہتی ہے۔ جب ستارہ اسے کھانا لا کر دیتی ہے تو چپ چاپ کھا لیتی ہے اور جب پوتے کو دیکھتی ہے تو اسے پکڑ کر خوب ہنستی ہے۔ لیکن جب اسے زور کا دورہ پڑتا ہے تو وہ گھر سے نکل جاتی ہے اور خان پورہ کی گلی گلی میں ماری پھرتی ہے اور جو ملتا ہے اس سے کہتی ہے۔

"اپنے بیٹوں کو لڑائی پر نہ جانے دو۔ بیٹے کے خون اور ہڈی کی قیمت نہ کھاؤ۔ جوانی میں بیٹے کو موت کے منہ میں نہ جانے دو......."

اور کبھی کبھی اس طرح بولنے لگتی ہے جیسے وہ ہزاروں ہزار کے مجمع کو مخاطب کر کے تقریر کر رہی ہو۔

"دیکھو لوگو! میں جوانی میں بیوہ ہوئی اور بڑھاپے میں جوان بیٹا کھو بیٹھی۔ یہی لڑائی ہے۔ لڑائی میں اپنے لڑکوں کو مت جانے دو۔ یہ بڑی لعنت ہے۔ نہ جانے کتنے لاکھوں گھر بے چراغ کر چکی ہے........"

اعظم خاں کی ماں، جس کی پچاس سال تک کسی نے پرچھائیں تک نہ دیکھی تھی اب گاؤں میں ماری پھرتی ہے۔ لوگ اس کی حالت دیکھتے اور افسوس کرتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ چیخنے لگتی ہے۔

"میرا شوہر واپس کرو۔ میرا بیٹا مجھے واپس دو۔"

بیٹے کی موت نے بے چاری کا دماغ کر دیا ہے۔

مہندر ناتھ

سندھیا

سندھیا سیدھی میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ اور اس نے کاغذ۔ قلم اور دوات کی خواہش کی۔ میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالے بغیر اسے کاغذ دیا۔ دوات دی اور ساتھ ہی قلم بھی۔ وہ ان چیزوں کو لے کر بستر پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے میلے سے بلاؤز میں سے ایک کاغذ نکالا اور اس کاغذ کو سامنے رکھ کر وہ ایک نئے کاغذ پر کچھ لکھنے لگی۔

شاید وہ کسی کو خط لکھ رہی تھی۔ اور جانے کیا لکھ رہی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو مشغول رکھنے کے لئے حجامت کا سامان نکالا گلاس میں پانی ڈالا۔ اور حجامت کرنے لگا۔ حجامت کرتے کرتے مجھے خیال آیا کہ سندھیا سے پوچھ لوں کہ وہ کس کو خط لکھ رہی ہے۔ لیکن پوچھنے سے کیا فائدہ لکھنے دو خط اسے۔ لیکن دل نہ مانا۔ اور آخر کار میں نے پوچھ ہی لیا۔

"سندھیا۔ کس کو خط لکھ رہی ہو؟"

اس نے میری طرف دیکھا اور پھر مسکرا دی۔ میں اس کی خاموشی سے بہت کچھ سمجھ گیا۔ کیونکہ اس خاموشی کے ساتھ ایک مسکراہٹ بھی تھی۔ ایک پھیکی۔ بے جان۔ اداس سی مسکراہٹ۔ جب لڑکی سب کچھ کھو بیٹھتی ہے۔ تو وہ اس قسم کی مسکراہٹ سے آپ کا خیر مقدم کرتی ہے۔

میں نے شیو کرتے ہوئے سوچا۔ میں نے سندھیا کو کب دیکھا تھا۔ ہاں یاد آیا۔ دو سال پہلے اور اس کے بعد لگاتار دیکھتا رہا سندھیا۔ اس وقت میرے سامنے بیٹھ کر خط لکھ رہی تھی اور میں نہایت بے فکری سے حجامت کر رہا تھا۔ اس کمرے میں کوئی نہ تھا۔ لیکن اس سے پہلے جب وہ کمرے میں داخل ہوتی تھی تو میرے جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑ جاتی تھی اور میں اس وقت چاہتا تھا کہ اس وقت کمرے میں کوئی نہ ہو۔ صرف میں اور سندھیا ہوں۔ اور کوئی نہ ہو۔ اور اس وقت اگر میرا نوکر کمرے میں ہوتا تو اسے باہر بھیج [illegible] آج نوکر بھی کمرے میں نہ تھا۔ لیکن آج کسی کو باہر بھیجنے کی ضرورت نہ تھی۔

اس وقت میرے جسم کا ذرہ ذرہ یہی پکارتا تھا کہ کمرے میں میرے اور اس کے سوا اور کوئی نہ ہو۔ سندھیا کو معلوم تھا کہ میں اسے کتنا چاہتا تھا۔ اور اسے کیوں چاہتا تھا۔ میری محبت کس قسم کی تھی۔ اس میں کتنی گیرائی تھی۔ اس میں کتنی تپش تھی میرے بوسوں میں کتنی آگ تھی۔ اور میں اس کے جوان جسم کے ہر موڑ سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ صرف ایک جسم نہ تھی۔ ایک ناک۔ دو آنکھیں ایک پیٹ۔ ابھری ہوئی چھاتیاں۔ ٹانگیں۔ بال۔ ہونٹ۔ ان سب کو ملا کر سندھیا کچھ اور بن جاتی تھی۔ وہ لمحہ۔ جب ہونٹ ہونٹ کو بچا نہیں سکتے۔ جب نگاہ سے نگاہ مل جاتی ہے اور ایک دوسرے کے اندر جذب ہو جاتی ہے۔ سندھیا ان دنوں بے حد خوبصورت تھی۔

مجھے یاد ہے۔ جب سندھیا جوان ہوئی تو اس کا شباب اپنی تمام رعنائیوں کو لے کر میرے سامنے گھوم گیا۔ مجھے اس وقت یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس قسم کا پھول تھی جو وقت سے پہلے کھل اٹھا ہو۔ میں جو اپنے اندر ضبط کے مادے کو لئے ہوئے اکڑ رہا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی بے دست و پا ہو گیا اور میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سب کچھ کہہ دیا اور سندھیا جو دیکھنے میں کافی کالی تھی۔ لیکن جس کا دل کالا نہ تھا۔ گو اس کی ناک کچھ ٹیڑھی تھی۔ خد و خال اتنے دلکش نہ تھے کہ انسان صرف صورت دیکھ کر اس کی طرف کھنچ جاتا لیکن جب وہ مجموعی حیثیت سے آپ کے سامنے آجاتی تو آپ کے منہ سے "واہ" ضرور نکل جاتی۔ آپ ضرور کہتے کتنی پیاری صورت

سفید۔ خدا اس کو سدا جوان رکھے تو سندھیا کو خاموشی سے نفرت تھی۔ لیکن جب کبھی وہ خاموش ہو جاتی تو پھر اس کا جسم بولتا۔ اس وقت تو وہ قیامت برپا کرتی تھی۔ ان دنوں مجھے یوں ہی احساس ہو رہا تھا کہ سندھیا کا حسن دو روزہ حسن ہے۔ یہ حسن جلدی مٹ جائے گا۔ یہ ابال عارضی ہے۔

میں نے یہ سوچتے سوچتے حجامت ختم کر لی۔ آنکھوں کے سامنے دو سال فلم کی ریل کی طرح گھوم گئے۔ میں نہانے چلا گیا نہا کر واپس آیا تو سندھیا بدستور خط لکھ رہی تھی۔ اتنے انہماک سے اس نے آج تک کسی کو خط نہ لکھا تھا۔

میں اسے بہت قریب سے جانتا ہوں۔ اس لئے آپ کو بتا رہا ہوں۔ وہ آج بہت پریشان ہوگی۔ ہائے اس کا کیا حال ہو گیا تھا۔

دو سال کے عرصے میں اس نے چھ عشق کئے۔ کچھ عشق جسم کے تقاضوں کی وجہ سے۔ کچھ اپنی پسند کے۔

میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ آج کس کو خط لکھ رہی تھی۔

لیکن میں نے سوال پر زور دینا مناسب نہ سمجھا۔ میری آنکھوں میں آج کچھ نہ تھا۔ کوئی فرمائش نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میرا جذبۂ شوق ایک عرصہ سے مدھم پڑ گیا تھا۔ وہ باتیں جو میں اس سے کیا کرتا تھا۔ اب وہ سننے سے محروم ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میں اس کی طرف محض اس کی جسمانی کشش کی وجہ سے آیا تھا اور اب وہ اس کشش کو کھو چکی تھی۔ اسے اس بات کا احساس تھا اور مجھے اس سے زیادہ۔ میں تو اس پجاری کی طرح تھا۔ جو مندر کی خستہ حالت سے آگاہ ہو چکا ہو اور جس کے دل میں مندر کی مورتی کے احترام کا جذبہ بھی سرد پڑ گیا ہو۔

اتنی جلدی وہ حسن کدھر گیا۔ وہ جوان جسم اتنی جوان راتوں میں کہاں پگھل گیا۔ وہ جوش۔ وہ ولولے۔ وہ نگاہ۔ وہ مسکراہٹ۔ وہ حرارت کہاں چلی گئی۔

سندھیا بیس سال سے ایک کھولی میں رہتی تھی۔ ایک کمرہ۔ تاریک سیاہ۔ وہیں اس نے جنم لیا۔ اسی اندھیرے میں وہ پلی، بڑھی اور جوان ہوئی۔ لیکن وہ کمرہ۔ وہ خوراک۔ وہ بستر۔ وہ بو۔ اس سے الگ نہ ہوئی۔ اس نے بہت کوشش کی۔ لیکن ہر کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ یہ چھ عشق اس کوشش کا نتیجہ تھے کہ کہیں تو راستہ مل جائے گو کچھ عرصے کے لئے۔ ذہنی اور مالی فائدہ ہوا۔ لیکن آخر میں وہی کھولی۔ وہی اندھیرا وہی تاریکی۔ لیکن اس تاریکی میں وہ ناچنا سیکھ گئی تھی اور یہ ناچ گوپال نے سکھایا تھا۔ جو خود اس فن کا ماہر تھا۔

میں نے اسے کتنی بار ناچتے دیکھا تھا۔ وہ واقعی اپنے فن کی ماہر تھی اور نہ جانے یہ ناچ اس نے کہاں سے سیکھ لیا۔ لیے ناچ سے کیوں اتنا لگاؤ تھا۔ کوئی بھاؤ بتاؤ فوراً اسے اپنے جسم کے اندر جذب کرے گی اور پھر اس خوبصورتی سے اس بھاؤ کو جسم سے نکالے گی کہ دیکھنے والا واقعی عش عش کرنے لگے گا۔ اس حرکت کو دیکھ کر ایسا معلوم پڑتا تھا جیسے یہ حرکت اس جسم کا ایک حصہ تھی۔

اسے کسی وقت کہو "سندھیا ذرا ناچ کر دکھاؤ" تو وہ فوراً کولھے مٹکاتی ہوئی آپ کے سامنے کھڑی ہو جائے گی اور ترچھی نگاہوں سے آپ کو دیکھنے لگے گی اور آپ اسے دیکھ کر ضرور یہ کہیں گے "کتنی بے شرم عورت ہے"۔

لیکن وہ بے شرم نہ تھی اس کا مجھے پورا علم تھا۔ میں نے بہت سی شرمیلی عورتیں دیکھی ہیں جو کافی بے شرم دکھائی دیتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ اس کے دل میں جو آتا وہ کہہ دیتی۔ اس کا جسم جس کو پکارتا اس سے ضرور ملتی۔ اگر اس حرکت کو بے شرمی کے مترادف سمجھا جائے تو کوئی بات نہیں۔ ایک دن کہنے لگی "مجھ پر ایک سیٹھ مرتا ہے۔ ایک بڑی مل کا مالک ہے اور کہتا ہے اگر تو میری ہو جائے تو سب کچھ تمہارا ہے"۔

"تو تم نے کیا جواب دیا؟"

لیکن اس سیٹھ کی توند بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اس کے مسوڑے پھولے ہوئے تھے اور وہ اتنا موٹا تھا کہ اسے دیکھ کر مجھے نفرت ہونے لگی۔ نہ جانے عورتیں ایسے مردوں کے ساتھ کیسے سوتی ہیں" اور یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی میں ایک نفرت کا اظہار تھا۔ وہ ہنستے ہنستے پھر خاموش ہو گئی۔ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد وہ کہنے لگی۔ "میں نے اس سے کہا پہلے توند گھٹاؤ پھر تشریف لانا۔ نہ توند گھٹے گی۔ نہ وہ میرے پاس دوبارہ اپنی فرمائش لے کر آئے گا" لیکن اس وقت وہ خط لکھ رہی تھی۔ دو سال کے بعد مجھے معلوم تھا کہ ان دنوں اس کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ آج کل ناچ کے لئے کوئی بلاوا نہ آتا تھا۔ پہلے بہت آتے تھے۔ پہلے جسم جوان تھا۔ پہلے جسم میں رعنائی تھی کشش تھی۔ پہلے جسم میں بلاوا تھا۔ آنکھوں میں تبسم تھا۔ ہونٹوں پر ہنسی تھی۔

لیکن اس وقت جسم سو رہا تھا اور اس کھیت کی طرح دکھائی دیتا تھا جس کی ساری فصل کاٹ لی گئی ہو۔ اب کس کو خط لکھ رہی ہو۔ شاید میں سمجھ گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ میرا اندازہ غلط ہو۔

کیا وہ گوپال کو خط لکھ رہی تھی۔ نہیں گوپال تو مر گیا۔ کیا سریندر کو۔ اس بیچارے نے شادی کر لی۔ کیا سہائے کو۔ اس کا تو جی بھر گیا۔

کیا پران کو۔ اس کی بیوی نے اپنے خاوند کو جوتے مار مار کر درست کر لیا۔

کیا ٹکو کو ——— وہ بیچارا ایرانی کی دوکان پر نوکر تھا۔ اور اسے صبح و شام، اپنی تنخواہ میں سے چائے اور بسکٹ کھلایا کرتا اور کبھی کبھار بریانی بھی۔ سندھیا اکثر ٹکو کو دیکھ کر مسکرا دیتی۔ کبھی کبھار جان بوجھ کر اس کے ہاتھوں کو چومتی۔ اسے آنکھ مارتی۔ اپنی چائے میں سے ایک دو گھونٹ چائے اسے دیتی اور وہ پی لیتا۔ وہ چائے کے دو گھونٹ پی کر کتنا خوش ہوتا تھا۔ اس کا اندازہ آپ اور ہم نہیں کر سکتے۔ وہ صرف ٹکو ہی کر سکتا ہے ——— لیکن یہ معاملہ اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ٹکو نے اپنے دل میں سندھیا کے لئے کیا کچھ نہ سوچا ہو گا۔ شاید ایک جھونپڑا بنایا ہو گا۔ اس میں سندھیا رہے گی۔ وہ رہے گا۔ سندھیا اس کا کھانا پکائے گی۔ وہ کام پر جائے گا۔ سندھیا اس کا انتظار کرے گی۔ وہ کام کرنے کے بعد گھر آئے گا۔ سندھیا کو روپے دے گا۔ سندھیا روپے لے کر مسکرائے گی۔ لیکن وہ دن نہ آیا۔ سندھیا کی مسکراہٹ نے اس کی کتنی راتیں حرام کی ہوں گی۔ کون جانتا ہے۔ اور کون کسی کی پروا کرتا ہے اور سندھیا ایسے چھوکروں کی پروا کرنے لگتی تو گلی کا ہر نوجوان چھوکرا اپنے ہاتھوں پر دل رکھے ہوئے اس کے پاس پہنچ جاتا اور کہتا "جان من! یہ دل تمہارا ہے"۔ ٹکو کو وہ کیا خط لکھے گی۔ ٹکو تو خود ان پڑھ تھا۔ لیکن وہ ہے کہاں۔ وہ آج کل یہاں نہ تھا۔ وہ بیچارا اب کا جیل چلا گیا۔ کیونکہ سندھیا کے بسکٹ، اس کی چائے، اس کی بریانی کے دام اتنے چڑھ گئے تھے کہ اگر ٹکو ساری عمر ایرانی کی دوکان پر کام کرتا رہتا۔ جب بھی وہ اس کا قرض نہ چکا سکتا اور جب مالک کا قرض نہ چکا سکا تو اس نے مالک کے ہاں چوری کی۔ ٹکو روپے چرائے۔ پھر پکڑا گیا۔ اور سیدھا جیل بھیج دیا گیا۔

لیکن سندھیا روئی نہیں۔ اب اس کے یہاں ہرگوند آتا تھا۔ ایک کار۔ موٹا تازہ۔ عمر پچاس سال سے اوپر۔

وہ ہرگوند کو بچپن سے جانتی تھی۔ اور ہرگوبند بھی بچپن سے اسے جانتا تھا۔ شروع میں جب سندھیا جوان ہوئی تو سیٹھ نے آنا جانا شروع کیا لیکن سندھیا کے رویے نے اسے مایوس کر دیا۔ یہ سیٹھ بڑے کائیاں ہوتے ہیں۔ گلی، محلوں میں ایسی چھوکریوں پر نگاہ رکھتے ہیں۔ اکثر ایک مسکین سی صورت بنائے ہوئے ان گھروں میں گھستے ہیں۔ لڑکی پر آنکھ رکھتے ہیں اور غریب والدین کی سیوا کرتے ہیں۔ پہلے ہمدردی کرتے ہیں پھر وار کرتے ہیں۔

اور ہری گووند ہی کچھ کرتا۔ جب سندھیا جوان ہوئی تو ہری گووند آیا لیکن سندھیا نے اس کی طرف نہ دیکھا۔ وہ گوپال سے عشق کر رہی تھی۔ اسے گوپال پسند تھا۔

لیکن ہری گووند کے پاس کار تھی اور جب آدمی کے پاس کار ہو تو بیکار وقت زیادہ ہوتا ہے۔

اس لئے بیکار وقت کاٹنے کے لئے وہ سندھیا کے گھر والوں سے ملنے چلا آتا۔ یوں ہی گپیں ہانکتا۔ کبھی کبھی سندھیا کی ماں کہہ جاتی کبھی باپ کو بھی ایک دوست کی طرح اس لئے؟ انھیں ایک پڑوسی سمجھ کر اور کچھ نہیں۔ سندھیا سے کوئی عشق نہیں۔ اس کی جوانی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ ایسے آدمیوں کو عشق نہیں ہوتا۔ سندھیا جب گھر واپس آتی تو گھر والے ہری گووند کا ذکر کرتے۔ اس کی کار کا قصہ چھڑتے۔ اس کی کوٹھی۔ اس کی مل کا تذکرہ ہوتا۔ سندھیا یہ سن کر ناک بھویں چڑھاتی اور غصے میں آکر کہتی "میرے سامنے کچھ کہے تو اس کا منہ جھلس دوں گی۔" لیکن آگ کا منہ جھلسنا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ خود اپنا ہی منہ جھلس جاتا ہے۔

اگر گوپال نہ مرتا تو شاید۔ سندھیا کی یہ حالت نہ ہوتی ——

سریندر آیا۔ لیکن اسے ایک اور لڑکی سے شادی کرنی پڑی۔ سریندر کے جانے کے بعد وہ بے حد روئی۔ اور اتنا روئی کہ اسے سیٹھ ہری گووند کی کار میں بیٹھنا پڑا۔ سیٹھ نے سندھیا کو بمبئی کی سیر کرائی۔ پھر اپنی کوٹھی دکھائی۔ اپنا جوہو کا بنگلہ اور سندھیا یہ سب کچھ دیکھ کر بے حد خوش ہوئی۔ سیٹھ نے کہا۔ یہ بنگلہ تمہارا ہے اور ایک سو کا نوٹ اس کے بلاوز میں رکھ دیا۔ اور ساتھ ہی یہ کہا۔ "جب کبھی روپیوں کی ضرورت ہو مجھ سے مانگ لینا۔"

نہ جانے اس دن سندھیا کو اپنے آپ سے کیوں نفرت ہو گئی۔ "ذلیل کہیں کی۔ روپیوں کے لئے اپنی عزت بیچ دی۔ کوئی اور کام کرو۔ کسی فیکٹری میں نوکر ہو جاؤ۔ کام نہیں ملتا۔ پھل پھروٹ بیچو۔ اگر کھانا نہیں ملتا تو فاقے کرو۔ عزت کیوں بیچی یہ کام بہت برا ہے۔ روپیوں کیلئے اپنا جسم بیچنا انتہائی شرمناک بات ہے۔ تو عورت نہیں۔ تو بازار کی رنڈی ہے۔"

اور ہاں سندھیا کو نفرت تھی۔ اس نام سے۔ اس کام سے۔ پھر اسے سہائے سے محبت ہو گئی۔ سہائے خوبصورت تھا۔ جوان تھا۔ کچھ کماتا تھا۔ اس لئے دونوں کی کچھ دنوں کے لئے نبھ گئی لیکن چند مہینوں بعد سہائے بیکار ہو گیا۔ سہائے نے نوکری کی تلاش کی لیکن نوکری نہ ملی۔ سہائے چلا گیا۔ سندھیا دن بدن دبلی ہونے لگی۔

اور جب حسن اپنے پر سمیٹ لے اور شباب اپنے منہ پر بھوک اور بیکاری کی سیاہ چادر اوڑھ لے اور جب موت منہ کھولے ہوئے آپ کے سامنے کھڑی ہو جائے تو بڑے بڑے انسانوں کا کلیجہ دہل جاتا ہے اور سندھیا تو ایک عورت تھی۔ اس نے پھر ہری گووند کی طرف رخ کیا۔ ایک خط لکھا کچھ روپے آئے۔

دوبارہ پھر روپے مانگے۔ اس بار روپئے آئے۔ لیکن دیر سے۔ ایک بار سیٹھ آیا اور سندھیا کو لے کر چلا گیا۔

بیچ میں پھر وقفہ۔ نہ سیٹھ ہری گووند آیا۔ نہ روپئے۔ پھر فاقے۔ بیکاری ——

سندھیا نے کام کی تلاش کی۔ کام نہ ملا۔ باپ مر چکا تھا۔ ماں کوئی کام کرنے کے قابل نہ تھی۔ عاشق اپنا اپنا راستہ اختیار کر چکے تھے اور حسن اور شباب میں اتنی کشش نہ تھی کہ کسی اور کو اپنی طرف راغب کر سکے اور آج سندھیا خط لکھ رہی تھی۔ وہ کیا لکھ رہی تھی۔ کس کو خط لکھ رہی تھی۔ وہی روپیوں کی مانگ۔ پاگل تھی سندھیا۔ کیا سیٹھ ہری گووند پھر آئے گا۔ سندھیا پہلے اپنا چہرہ کسی آئینہ میں دیکھ لو۔ اب سندھیا نے خط ختم کر لیا تھا۔ اس نے کاغذ کو دوہرا کیا اور پھر اپنے بلاوز میں ایسے رکھ لیا جیسے وہ کسی تصویر کو لاکٹ میں رکھ رہی ہو۔ جیسے بنیا روپیوں کو اپنی تجوری میں رکھتا ہے۔ پھر اس نے جلدی سے چپل پہنی۔ اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ جلدی میں وہ ایک کاغذ کا ٹکڑا بھول گئی۔ میں نے کاغذ کا ٹکڑا اٹھایا۔ اور پڑھنے لگا۔ لکھا تھا

پیارے ہری گووند!

تم آج کل ادھر نہیں آتے۔ سنا ہے تم ہر روز ادھر سے گزرتے ہو۔ لیکن پھر بھی ادھر نہیں آتے۔ یکایک یہ تمہیں کیا ہو گیا۔ میں ہر روز تمہارا راستہ دیکھتی ہوں۔ آج تک تمہارے وعدوں پہ زندہ ہوں۔ اگر تم روپئے نہیں بھیج سکتے تو ایک بار نہ کر دو۔ میں جانتی ہوں۔ تم آج کل بہت مصروف ہو۔ گھر میں راشن نہیں ہے۔ چھ مہینوں سے

مکان کا کرایہ نہیں دیا۔ بجلی کا بل دینا ہے۔ تمہاری قسم میرے پاس ایک کوڑی بھی نہیں۔ تمہارے بھروسے پر زندہ ہوں۔ اب زیادہ پریشان نہ کرو۔ اس میں یہ کہنا چاہتی تھی۔ کہ اگر تم ......

تمہیں خط ختم ہو گیا تھا۔ اس کو سامنے رکھ کر وہ لکھ رہی تھی۔ میں نے کاغذ کو اچھی طرح دیکھا اور پھر پھاڑ دیا۔ سندھیا چلی گئی تھی۔ اگر وہ یہاں ہوتی تو میں اسے بتاتا۔ اب سیٹھ ہرگز نہیں آئے گا۔ وہ کبھی نہیں آئے گا۔ اور اگر تم —— کے بعد تم نے کیا لکھا یہ بتا دوں تو شاید تم برا مان جاؤگی۔ لیکن سندھیا مت جاؤ۔ میں کہتا ہوں مت جاؤ۔ تم تو چلی گئی ہو۔ یہ درست ہے۔ سیٹھ ہرگز نہیں آئے گا۔ کوئی نہیں آئے گا۔ اب ایک سیٹھ نہیں آئے گا۔ بہت سے سیٹھ آئیں گے۔ سیٹھ نہیں آئیں گے تم سیٹھوں کے پاس جاؤگی۔ کوئی کام کر لو۔ نوکری نہیں ملتی۔ ناچو۔ خوب ناچو۔ دل کھول کر ناچو۔ دنیا کے ہر شخص کو اپنی ابھری ہوئی چھاتیاں دکھاؤ۔ اگر چھاتیاں ڈھیلی پڑ گئی ہیں تو ان میں کپاس بھر لو۔ اگر کولہے متناسب نہیں ہیں تو پیڈ لگا لو۔ اگر گال زرد پڑ گئے ہیں تو سرخی لگا لو۔ اگر ہونٹ پتلے اور زرد ہو گئے ہیں تو لپ اسٹک لگا لو۔ پھوٹا یہ پیٹ بھر سکو اور کوئی طریقہ نہیں۔ لیکن مت جاؤ۔ سندھیا یہ راستہ بہت خراب ہے۔ بھوکی رہو۔ فاقے کرو۔ کم کھاؤ مر جاؤ۔ لیکن مت جاؤ۔ تم نے مجھ سے روپیے مانگے ہوتے۔ میں بھی تمہارے جسم کا خریدار تھا۔ تمہارے حسن کا پرستار تھا۔ ہر شخص تم سے الگ ہو گیا ایک ایک کر کے۔ میں جانتا ہوں تم کہاں جاؤگی۔ میں جانتا ہوں تم چلی گئی ہو۔ میں جانتا ہوں تم چلی جا رہی ہو۔ ادھر اندھیرا ہے۔ آتشک ہے۔ سوزاک ہے! کوڑھ ہے۔ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ مت جاؤ۔ روکو اپنے آپ کو۔ میں کہتا ہوں رک جاؤ سندھیا۔ لیکن قدم اٹھ رہے ہیں۔ گھنگرو کی صدا آ رہی ہے۔ میٹھی اور سریلی آواز۔ دادھا کیا اچھی ہے سندھیا! —— جب پیٹ میں روٹی نہیں ہوتی تو عورت اپنی روح بیچ دیتی ہے۔ ٹھیک ہے سندھیا تم نے اپنی روح بیچ دی تاکہ کچھ دن اور زندہ رہ سکو —— میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ صرف تیز اور تند ہوا کھڑکیوں سے اپنا سر پٹخ رہی تھی!

سردار سلیم

دھندلے راستے

"اے رکشا ــــ رکشا!" اسلم نے رکشا والے کو آواز دی "ملک پیٹ چلو گے میاں؟"

"ہاں صاب چلیں گے" رکشا والا اپنی نقلی ریشم کے رومال سے ہینڈل پر لگے ہوئے آئینے کو صاف کرتے ہوئے بولا۔

"کیا لو گے؟"

"دس آنے ہوں گے صاب"

"ارے، دس آنے تو بہت ہیں میاں"

"بس کا کرایہ چھ آنے دیتے نا سرکار، اوپر چار آنے بھی نکو لیو بولے تو کیسا ہوں گا" رکشا والے نے اس طرح یہ دلیل پیش کی جیسے بس سے چار آنے زائد نہ دیئے جائیں تو قیامت ہی آجائے گی۔

اسلم نے اپنے ذہن میں سوچا کہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے بیچارہ، انسانی محنت اور مشین میں کچھ تو فرق ہونا چاہئے اور وہ مسکرا کر بغیر رکشا میں بیٹھ گیا۔ رکشا والے نے جلدی سے رومال گلے میں باندھا۔ تہبند کو ذرا ٹھیک کیا۔ آگے رکے ہوئے ایک ٹھیلے کو ہٹانے کے لئے زور سے آواز لگائی "ہے بنڈی۔ بڑھا بابا" اور رکشا آگے بڑھنے لگا...... چھم..... چھم..... چھم..... رکشا کے پہیوں میں بندھے ہوئے گھنگھرو ایک جھناکے کے ساتھ بج اٹھے۔ پیڈلوں پر کھڑے ہو کر دو چار بار خوب زور سے انھیں گھمانے کے بعد رکشا والے نے پوچھا "ملک پیٹ میں کس جگہ چلوں مالک؟"

"بھئی، ریلوے برج کے پاس چھوڑ دو۔"

"جی اچھا سرکار" وہ تیزی سے پیڈل گھماتے ہوئے بولا۔

اسلم نے جیب سے ایک چارمینار سگریٹ نکال کر جلائی اور طویل کش لگایا۔ رکشا تیزی سے ملک پیٹ کے راستے پر دوڑ رہا تھا..... چھم..... چھم..... چھم، چھم..... چھم۔ بازار میں خوب چہل پہل تھی، دفتروں اور مدرسوں کا وقت ختم ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اور اب شام کی تفریح کا وقت قریب آرہا تھا۔ اس لئے سمنٹ کی کشادہ سڑکوں پر آدمیوں کا ہجوم نظر آرہا تھا۔ موٹروں کے ہارن، سیکلوں کی گھنٹیاں، رکشاؤں میں بندھے ہوئے گھنگھروں کے جھناکے اور انسانوں کی ملی جلی آوازیں ایک اچھے خاصے شور میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ اسلم نے سگریٹ کے دو چار کش لینے کے بعد اپنی جیب کو ہاتھ لگا کر دیکھا۔ نوٹوں کا بنڈل بالکل محفوظ تھا۔ گردن کو ذرا سا جھکا کر اس نے اپنے بائیں جانب کے سینے پر نظر ڈالی تو اسے اپنا سینہ بھی کسی نوخیز دوشیزہ کے سینے کی طرح ابھرا ہوا معلوم ہوا۔

"سالے کیشیر کے بچے نے سب دس دس کے نوٹ دے دیئے" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا "اگر دس، دس کے نوٹوں کے بجائے سو سو کے دے دیتا تو اس کا کیا جاتا؟" لیکن اس سے فرق کیا پڑ جاتا وہ رکشا کی پشت سے ٹیک لگائے سوچنے لگا۔ یہی نا کہ اس کا سینہ کسی نوخیز دوشیزہ کے سینے کی طرح ابھرا ہوا نظر نہ آتا، اور بس، رقم تو اتنی ہی رہتی۔ وہی سات سو چالیس روپے چودہ آنے ـــــ اپنی تنخواہ کے رکھے ہوئے گریبان میں ہاتھ ڈال کر اس نے نوٹوں کے بنڈل کو چھو کر دیکھا۔ اس کی انگلیوں نے کسی پرانے اور میلے کاغذ کے بوڑھے نوٹ کے بجائے جوان اور نئے نوٹوں کے کرارے پن کو محسوس کیا لیکن اسے اس لمس سے کوئی خوشی نہ

ہوئی۔ اس سے پہلے اگر کبھی اس کی جیب میں کھڑکھڑاتے ہوئے نوٹ ہوتے اور اس کی انگلیاں ان سے چھو جاتیں تو اسے بڑی مسرت ہوتی تھی۔ لیکن آج یہ چیز بھی اسے خوش نہ کر سکی ـــــ سات سو چالیس روپے چودہ آنے ـــــ اس سے پہلے اتنی بڑی رقم ایک ساتھ اس کے پاس کبھی نہ آئی تھی۔ اگر یہ رقم اسے معمولی حالات میں ملتی تو شاید اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہتا اور وہ طرح طرح کی اسکیمیں اور منصوبے بناتا۔ اسے خرچ کرنے کے نئے نئے ڈھنگ سوچتا۔ لیکن یہ رقم اسے معمولی حالات میں نہیں ملی تھی۔ آج اس کی نوکری ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی تھی اور یہ اسی کا معاوضہ تھا جسے لے کر وہ اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔

جس دفتر میں وہ چار سال سے کام کرتا آیا تھا۔ اس سے ڈیڑھ سو آدمیوں کو کام کی کمی کی وجہ سے جواب دے دیا گیا ـــــ اکثریت تو ایسے لوگوں کی تھی جنھیں ایک پیسہ بھی معاوضہ نہیں ملا لیکن جیسے ایسے خوش نصیبوں کو جن کی سروس چار سال سے زائد تھی حکومت نے "انعام" دینے کا فیصلہ کیا۔ اسلم بھی انہی خوش نصیبوں میں سے ایک تھا۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کا خیال آیا تو اسے ایک قسم کا سکون سا ہو گیا اور وہ سوچنے لگا چلو میں دوسرے لوگوں سے تو کروڑ درجے بہتر حالت میں ہوں۔ کم از کم کچھ سوچ تو سکتا ہوں، نوکری ملنے تک حلق سینکنے کا سہارا تو ہے۔ ان بیچاروں کو تو اتنا اطمینان بھی نہیں۔ ایک ذرا سے وقفے کے لئے وہ بالکل مطمئن ہو گیا اور اس نے جیب سے پیکٹ نکال کر دوسری سگریٹ سلگائی لیکن پھر خیالات کا ایک ہجوم اس کے دماغ میں گھس آیا۔

اب کیا کیا جائے؟ آئندہ آمدنی کا ذریعہ کیا ہوگا؟ صرف یہی سوال تھا جو اس کے ذہن میں بار بار ابھر رہا تھا۔

اگر وہ تنہا ہوتا تو شاید اسے اتنی فکر نہ ہوتی لیکن ایک اور زندگی بھی اس کی قسمت کے ساتھ بندھی ہوئی تھی اس لئے کوئی ذریعۂ معاش جلد از جلد ڈھونڈنا بیحد ضروری تھا ـــــ گھر پہنچتے پہنچتے اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اسے کوئی ایسا کام کرنا چاہئے جس سے فوری آمدنی کی توقع ہو ورنہ جو رقم اس کی جیب میں تھی وہ تو اتنی زیادہ نہ تھی کہ وہ ایک طویل عرصے تک آمدنی کی فکر نہ کرتا۔

بیوی کو روپے دیتے ہوئے اس نے تخفیف کی بات سنائی تو اس کا نسوانی دماغ فوراً حرکت میں آیا اور ایک ریڈی میڈ تجویز اس کے سامنے پیش ہو گئی "اخبار میں نوکری کر لو"۔

"واللہ رفو! کیا بات سوچی ہے" اسلم کی ساری پریشانیاں جیسے یکدم غائب ہو گئیں "کیا انعام دیا جائے تجھے، ادھر آ"۔

"اسے بھی چھوڑو ..... یہ کیا ہے ...... باورچی خانے میں یوسف بیٹھا ہے"۔

"کہاں ہے" اسلم نے جلدی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہ صحن میں چلی گئی۔

"اچھا، یہ بات ہے"۔

"جی!" اس نے دور ہی سے جواب دیا

"خیر ہم باہر جاتے ہیں پھر ملاقات ہوگی"۔ اسلم نے سینڈل کا تسمہ باندھتے ہوئے کہا اور پھر سیٹی بجاتا ہوا گھر سے نکل گیا۔

اگلی صبح وہ اپنے دوست غلام اکبر سے ملا۔

"یار تیرے اخبار میں نوکری چاہئے" اس نے ادھر ادھر کی دو چار باتیں کرنے کے بعد کہا۔

"کیوں، کیا تیری نوکری چھوٹ گئی"

"ہاں بھئی، اسی لئے تو تیرے پاس آیا ہوں"

"دو چار روپے ہیں تیرے پاس؟" غلام اکبر نے انتہائی سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"ہاں، ہاں ہیں ـــــ کیوں، کچھ کام ہے؟"

"نہیں مجھے تو کوئی کام نہیں، لیکن اگر روپے ہیں تو اپنے لئے تھوڑی سی سنکھیا خرید لے"

"سنبھلیا"

غلام اکبر کی اجڑی اجڑی ویران سی آنکھیں ایک لمحے کے لئے چمک اٹھیں۔

"مجھے پتہ نہیں پیارے، جرنلزم کیا چیز ہے۔ اب مجھی کو دیکھو، دس برس سے قلم گھس رہا ہوں، رات رات بھر جاگتا ہوں، اپنے فرائض سے زیادہ کام کرتا ہوں لیکن اس کے باوجود سو سوا سو مہینہ سے زائد نہیں کما سکتا اور وہ بھی دس دس، پانچ پانچ کی شکل میں ملتے ہیں......."

اسلم نے اخبار کے دفتر تک آتے ہوئے جتنے خیالی محل تعمیر کئے تھے وہ سب کے سب لرزنے لگے ــــ جیسے زلزلہ آگیا ہو۔

"ان ہمارے ایڈیٹر صاحب سے تو تم واقف ہے نا" غلام اکبر رکے بغیر کہے جارہا تھا "یہ حضرت جو بڑے اصول پرست اور محنت کش خیالات رکھنے والے سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی حالت یہ ہے کہ ایڈیٹوریل اسٹاف تو ایک طرف رہا کاتبوں تک کی محنت کا معاوضہ مہینوں نہیں دیتے۔ خود بہترین کھاتے، بہترین پہنتے ہیں، دو سو روپے کرایہ کے مکان میں رہتے ہیں اور اگر اخبار کا کوئی ملازم دس پانچ روپے بھی کسی شدید ضرورت سے مانگے تو صاف ہاتھ اٹھالیں گے ــــ تمہیں شاید معلوم ہوا ابھی دو مہینے قبل ہندستان کے ایک بڑے مشہور شاعر یہاں آئے ہوئے تھے۔ ہمارے ایڈیٹر صاحب نے اپنے نومولود بچے کا بپتسمہ ان کے ہاتھوں کروایا۔ یعنی جس طرح عیسائیوں کا کوئی پادری بچے کے جسم پر مقدس پانی چھڑک کر اسے پاک کرتا اور اس کا نام رکھتا ہے اسی طرح ہمارے ایڈیٹر صاحب کے بچے کے حلق میں پہلی بار ایک مشہور شاعر نے جان ہیگ یا جانی واکر کے چند قطرے ٹپکائے اور تو جانتا ہے اس تقریب پر کتنے روپے صرف ہوئے۔ اخبار کے پورے اسٹاف کی دو مہینے کی تنخواہ! ــــ دو مہینے سے اخبار کے کسی ملازم کو تنخواہ نہیں ملی اس واسطے کہ ایڈیٹر صاحب کو اپنے بچے کا بپتسمہ کروانا تھا ــــ جرنلزم میں کیوں آتا ہے یار، کوئی اور کام کر۔"

"مگر کوئی تو اخبار ایسا ہوگا جہاں پابندی سے تنخواہ ملتی ہو؟" اس نے اپنے لرزتے ہوئے محلوں کو سنبھالنے کی ایک آخری کوشش کی۔

"ہاں ہاں ہے کیوں نہیں، لیکن وہاں نوکری کہاں!"

اسلم کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے سارے خیالی محل دھڑام سے زمین پر آگئے ــــ تھکے تھکے، بوجھل قدموں سے چلتا ہوا وہ گھر واپس گیا۔

بیوی کے ایورریڈی دماغ نے فوراً دوسری تجویز پیش کردی "تیل نمک وغیرہ کی دوکان کرلو"

"جی، کیا فرمایا آپ نے؟" غصے کی حالت میں وہ ہمیشہ ایک دوسرے کو آپ ہی سے مخاطب کرتے تھے۔

"بھئی، یہی کہہ رہی ہوں کہ تیل نمک وغیرہ کی دوکان کرلو روزانہ دو تین روپے کی آمدنی تو ہو جائے گی۔"

"بجا ارشاد، اب یہی باقی رہ گیا ہے کہ آپ کے لئے بنیوں کی طرح تیل اور نمک بیچیں۔"

"تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ اب یہ برابر کے مکان والی خالہ کے شوہر کو دیکھو۔ ایم۔ اے پاس ہیں لیکن دفتر کے بعد شام میں دوکان بھی کرتے ہیں مگر بالکل نہیں شرماتے اور شرمائیں بھی کیوں، کچھ چوری ڈاکہ تو نہیں کرتے، محنت کرتے ہیں اور اپنے بیوی بچوں کو پالتے ہیں۔ ایک تمہیں میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں جو دوکانداری کو اتنی ذلیل چیز سمجھ رہے ہو۔"

اسلم کی طبیعت کچھ جھنجھلا سی گئی تھی۔ وہ صرف اسی قدر کہہ سکا "مجھ میں سرخاب کے پر لگے ہیں اور نہ میں دوکانداری کو ذلیل پیشہ سمجھتا ہوں لیکن تیل نمک بیچنا میرے بس کا روگ نہیں اس لئے آپ اس گفتگو کو چھوڑئیے۔"

"تو پھر پان کی دوکان لگالو" بیوی کے دماغ سے ایک اور تجویز اچھل کر باہر آئی۔

"جی ــــ!"

"بھئی پان کی دو ....."

وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھ کر گھر سے باہر چلا گیا

اسلم نے پان کی دوکان اور تیل نمک کے بیوپار سے پیچھا چھڑانے کے لئے نوکری کی تلاش شروع کر دی اور صبح سے شام تک سرکاری دفتروں اور خانگی کمپنیوں کے چکر کاٹنے لگا لیکن تھوڑے ہی دنوں میں اسے پتہ چل گیا کہ آزاد ہندستان میں بھی نوکریوں کو بڑی حفاظت اور چاؤ سے رکھا جاتا ہے ــــ سنگین حصاروں اور فولادی دروازوں کے پیچھے اور ان دروازوں پہ ایسے بھاری بھاری تالے ڈالے جاتے ہیں جنھیں صرف رشوت یا سفارش کی طلسمی چابیاں ہی کھول سکتی ہیں۔

ایک مہینے تک نوکری کی تلاش ہوتی رہی اور "انعام" کی رقم گھٹتی رہی۔ اس عرصے میں رفعت کے دماغ نے بیسیوں اسکیمیں تخلیق کیں لیکن اسے ایک بھی تجویز پسند نہیں آئی اور وہ نوکری کی طرف سے مایوس ہو جانے کے باوجود کچہریوں اور کمپنیوں کے پھیرے کرتا رہا۔

اسلم جب چھوٹا سا تھا تو اسے مختلف قسم کے جانور پالنے کا بیحد شوق تھا اور اس نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں گلہریوں سے لے کر تیتر، بٹیر، کبوتر، خرگوش اور بکریوں تک ہر قسم کے چھوٹے بڑے جانور پالے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ اس کے اس دور اور آج کے درمیان پورے پندرہ سال کی طویل مدت تھی اور ان پندرہ سالوں میں بہت سی ذہنی اور جسمانی تبدیلیاں بھی آچکی تھیں لیکن یہ طویل مدت بھی غالباً اس کے اس شوق کو پوری طرح نہ مار سکی اور یہ پیار دل کے کسی نامعلوم گوشے میں دبا ہوا خاموشی سے سلگتا رہا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ جب زندگی میں پہلی بار اس کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ رہا اور نوکری کی ساری امیدیں ٹوٹ گئیں تو اس کے دماغ نے اپنے اس شوق ہی کے ذریعے اپنی معاشی مشکلات کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کی ــــ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو، اسلم کے ذہن میں یہ خیال آیا ضرور اور اس نے ایک روز یکایک اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "رفو ایک شاندار اسکیم ذہن میں آئی ہے"

رفعت دالان میں بیٹھی ہوئی چاول صاف کر رہی تھی۔ وہ سوپ کو نیچے رکھ کر مسکرانے لگی "کہیں اس کپڑے والی اسکیم کی طرح تو نہیں؟" جب کبھی رفعت کپڑوں کی اسکیم والا واقعہ یاد دلاتی تو اسلم ہمیشہ بولتے بولتے رک جاتا اور پھر موڈ کے اعتبار سے یا تو ہنسنے لگتا یا عورتوں کی کم فہمی پہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگتا۔

بات صرف اتنی تھی کہ ملازم ہونے سے پہلے اس نے بمبئی سے سستے داموں کپڑے لاکر اپنے عزیزوں اور جان پہچان والوں میں فروخت کرنے کی ایک اسکیم بنائی تھی جو بری طرح ناکام ہوئی۔ کپڑے تو بک گئے لیکن بہت سے عزیزوں سے روپے وصول نہیں ہوئے۔ اس وقت کے بعد سے اسلم کوئی اسکیم بناتا تو رفعت اسے چھیڑنے کے لئے کپڑوں کی اسکیم کا حوالہ ضرور دیتی۔

"ارے نہیں جی۔ فرسٹ کلاس اسکیم ہے" اس نے زندگی میں پہلی بار رفعت کی بات پہ دھیان دیئے بغیر جواب دیا۔
"اور پھر اتنے کم روپوں میں ہونے والی کہ بس پوچھو مت۔"

"اچھا ذرا ہم بھی تو سنیں آپ کی اسکیم"

"مرغیاں پالیں" اسلم نے بہت ہی ڈرامائی انداز میں اپنی اسکیم پیش کی۔

"واہ ..... واہ ..... وا" رفعت ہنستی ہنستی دوہری ہو گئی "بھئی کیا شاندار اسکیم ہے! ..... واہ ..... اوہ ..... اُف!"

"ارے ..... ارے ..... اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

بے تحاشا ہنسنے کی وجہ سے رفعت کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ ساری کے پلو سے اپنی آنکھیں صاف کررہی تھی لیکن اسلم کی بات سن کر پھر اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"ارے بابا پوری بات تو سنو، خواہ مخواہ ہنسے جارہی ہو"

"ہاں بھئی، سنائیے" رفعت نے مشکل سے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"پہلے آپ ذرا اپنی ہنسی کو روکئے اور دھیان دے کر سنیئے تو پھر عرض کرتا ہوں"

اس کے بعد کیا ہونے والا ہے اس کا رفعت کو اچھی طرح اندازہ تھا ــــ اس کے بعد وہ اٹھے گا، دو ایک بار کھنکار کر اپنا گلا صاف کرے گا، بالکل اس انداز میں جیسے کسی اہم ترین لکچر کی تیاری کر رہا ہو اور پھر لکچر شروع ہو جائے گا۔

چنانچہ لکچر شروع ہو گیا "آپ جانتی ہیں جناب پولٹری فارمنگ سے امریکہ کو سالانہ کتنی آمدنی ہوتی ہے؟"

"کس سے؟"

"پولٹری فارمنگ، مرغیاں پالنے سے بھئی، جانتی ہیں آپ؟"

"جی ہاں جانتی ہوں" رفعت نے بہت ہی معصوم صورت بنا کر کہا۔

"کیا!"

"دو روپے چار آنے چھ پائی"

"مذاق چھوڑ دو، ذرا سنجیدگی سے بات سنو"

"اچھا بھئی اب نہیں کرتے مذاق ــــ بولئے"

اسلم نے بڑے عالمانہ انداز میں بات شروع کی "سالانہ کئی کروڑ ڈالر کی آمدنی ہوتی ہے اور آسٹریلیا سے تو سارے یورپ کو انڈے اور مرغیاں جاتی ہیں"

"اچھا!"

"ہاں ہاں بھئی میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ مرغیاں پالنا کوئی معمولی کام نہیں ــــ ماہانہ دو تین سو کی آمدنی تو بالکل معمولی بات ہے"

"ارے تم تو ایسی باتیں کر رہے ہو جیسے مرغیاں سونے کا انڈا دیں گی"

"بالکل، لیکن یہ مرغیاں تھوڑا ہی ہوتی ہیں وہ ــــ یہ دیسی مرغیاں پالیں تو تو دیوالیہ نکل جائے"

"پھر کونسی ہوتی ہیں؟"

اسلم نے سر کو ذرا پیچھے ڈھلکا کر آنکھیں بند کرلیں جیسے کوئی بھولا ہوا سبق یاد کر رہا ہو "چلو گنتی جاؤ" اس نے اپنی انگلیاں پر گنتی کرتے ہوئے کہا "برہما، کوچین، پلیمتھ راک، روڈ آئیلنڈ ریڈ، ہیوڈان، سلکز، لگ ہارن، بلیک مائنارکا، آرپنگٹن۔"

"ارے بس بابا، بس کیجئے میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا"

"کیا سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ جو میں نے ابھی کہا ــــ یہ تو مرغیوں کی مختلف قسمیں ہیں"

"تو یہ مرغیاں پالیں گے جناب"

"جی اب آیا۔ دماغ شریف میں"

"جی ہاں دماغ شریف میں تو آ گیا مگر اس سے دو تین سو ماہانہ کا فائدہ کیسے ہوگا؟" رفعت نے حیرت سے سوال کیا۔

"بھئی فرض کرو ہم نے پندرہ مرغیاں پالیں۔ پندرہ مرغیوں کا مطلب ہے روز دس انڈے اور فی انڈا ایک روپ

کے حساب سے دس روپے یعنی اس طرح ماہانہ تین سو ہوئے یا نہیں" اسلم نے اسے لاجواب کر دینے کے انداز میں کہا۔

"لیکن ان کا خرچ؟"

"خرچ زیادہ سے زیادہ پچاس ساٹھ ہو جائے گا"

"بس!"

"ہاں بس، اور کیا ہوگا۔ چلو ایک سو رکھ لو، پھر بھی دو تین سو بچتے ہیں۔"

"لیکن روپے میں انڈا کون خریدتا ہے؟"

"روپے میں! ـــــ اجی جناب چھ چھ روپے میں بھی انڈا بکتا ہے۔"

سوپ کو دوبارہ اٹھا کر رفعت اس طرح چاولوں سے کنکریاں چننے میں مصروف ہو گئی تھی جیسے بات بالکل ختم ہو گئی ہو مگر، اسلم کا جواب سن کر اس کا ہاتھ کنکریاں چنتے چنتے یکایک رک گیا اور وہ تھوڑی دیر تک کچھ نہ بول سکی۔ اسلم اپنی کامیابی پر مسکراتے ہوئے بولا "خیر اب اس بحث کو چھوڑو، میں شام میں آتے ہوئے ایک کتاب لیتا آؤں گا اس وقت خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔"

"مگر......"

"نا بس اب چھوڑو، شام میں بات کریں گے۔"

شام میں وہ ایک چھوڑ تین تین کتابیں اپنے ساتھ لیتا آیا۔ ایک کتاب میں مختلف قسم کی مرغیوں کی اتنی پیاری پیاری تصویریں تھیں کہ انھیں دیکھ کر تو رفعت کا دل بھی مچل گیا "سچی ہم تو یہ مرغیاں پالیں گے" اس نے صبح کی ساری مخالفت کا خیال کئے بغیر ایک تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ ہیں جناب بارڈ پلیموتھ راک، ان کا رنگ سرمئی ہوتا ہے اور ہر ایک پر کی نوک بالکل سیاہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے سارے جسم پر یہ حسین سیاہ دائرے سے بن جاتے ہیں۔" اسلم نے اپنی معلومات کی دھونس جمائی۔

"کیا نام ہے ان کا؟"

"بارڈ پلیموتھ راک"

"تو بس پھر یہی پالیں" رفعت نے اس انداز میں کہا جیسے صرف نام ہی پر مرغیاں پالنے یا نہ پالنے کا انحصار ہو۔

"ہاں یہ بھی پال سکتے ہیں لیکن اور دیکھو، اور بہت سی تصویریں ہیں۔"

تصویریں ایک سے ایک حسین تھیں۔ کہیں کوئی شب رنگ مرغ تھا۔ رات کی تاریکی سے بھی زیادہ سیاہ پر، سرخ کلغی، سفید کان، چمکدار آنکھیں، سج دھج میں اتنا حسن اور بانکپن کہ نظریں تصویر سے ہٹانا مشکل ہو جائے اور کہیں ہلکے زرد رنگ کا کوئی جوڑا تھا۔ بال و پر اتنے ملائم اور ریشمی جیسے دھنکی ہوئی روئی کو بڑی نفاست کے ساتھ سارے جسم پر لپیٹ دیا گیا ہو، کلغی انتہائی سرخ اور چوٹی کی طرح گندھی ہوئی، پاؤں زرد زرد پروں سے ڈھکے ہوئے، چھوٹی سی سرخ چونچ اور کھڑے ہونے کے انداز میں اتنی دلکشی اور طرحداری کہ دیکھ کر بے اختیار پیار آنے لگے ـــــ رفعت سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مرغیاں بھی اس قدر حسین ہو سکتی ہیں۔ اسے اس وقت بھی یقین نہیں آرہا تھا اس لئے اس نے پوچھا "ان کے رنگ اصلی ہیں؟ یا صرف تصویروں میں ایسے نظر آتے ہیں؟"

"یکدم اصلی ہیں بابا، بہت ریلسٹک کلر ہیں"

"اچھا!"

"ہاں ہاں"

"تو پھر ضرور پالیں گے" رفعت نے قطعی فیصلہ صادر کر دیا۔

اسلم نے اپنے مٹی اور کھپریل کے بنے ہوئے مکان پر نظر ڈالی، اوسط قسم کا چھوٹا سا مکان تھا۔ ایسا ہی جیسے عام طور پر

شہر کے پرانے محلوں میں رہتے ہیں لیکن ضرورت کی ساری چیزیں اس میں موجود تھیں۔ گلی میں جو دروازہ کھلتا تھا اس میں داخل ہوتے ہی آٹھ دس گز کی ایک چھوٹی سی گلیاری تھی جس کی داہنی جانب بیت الخلاء تھا۔ گلیاری کے اختتام پر ایک اور دروازہ تھا جو مکان کے صحن میں کھلتا تھا اس سے لگا ہوا ایک چھوٹا سا حوض، پانی کا ایک نل اور جنبیلی کا ایک گھنا منڈوا تھا۔ صحن میں سیدھی جانب دیوار کے سہارے ٹین کا ایک شیڈ ڈال دیا گیا تھا جس کے آگے بانس کی موٹی جالی لگی ہوئی تھی۔ شیڈ کے دو حصے تھے۔ پہلا حصہ جو صحن کے دروازے سے لگا ہوا تھا۔ بہت شکستہ اور خراب حالت میں تھا۔ دیواریں بھی اوپر سے کچھ ٹوٹ گئی تھیں اس لئے بیکار پڑا رہتا تھا البتہ روزانہ مکان کی صفائی کے بعد گھر کا سارا کوڑا کرکٹ اس کے ایک کونے میں ڈال دیا جاتا اور رفعت دو تین دن میں ایک بار یہ کوڑا باہر پھنکوا دیتی۔ دوسرا حصہ نسبتاً ٹھیک تھا۔ اس میں لال مٹی کے چولہے بنا دیئے گئے تھے اور اس سے باورچی خانے کا کام لیا جاتا تھا۔ صحن کی دوسری جانب تین کمرے تھے۔ پہلے ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جس کی دیواروں سے ہمیشہ مٹی جھڑتی رہتی اور روشنی کے لئے کوئی دریچہ نہ ہونے کی وجہ سے بہت ہی تاریک اور ڈراونی معلوم ہوتی، اس میں جلانے کی لکڑیاں رکھی جاتی تھیں۔ اس سے لگا ہوا ایک بڑا کمرہ تھا جس کا دروازہ صحن میں کھلتا تھا اور اس کی دونوں جانب دو کھڑکیاں تھیں۔ اس لئے روشنی اچھی طرح اندر آتی تھی۔ دراصل سارے گھر میں یہی سب سے اچھا کمرہ تھا اس کی دیواروں پر کی ہوئی پلستر بھی مضبوط تھی اور چھت کی کھپریل زیادہ نہیں ٹپکتی تھی اس لئے اسلم اور رفعت اسے اپنے سونے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ صحن کا تیسرا کمرہ بحد مختصر تھا اس کی چوکھٹ کے نیچے پانی بہنے کے لئے ایک نالی بھی بنی ہوئی تھی اس لئے رفعت نے اس میں لکڑی کی ایک بڑی چوکی ڈال دی تھی اور یہ حمام کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ صحن کے بعد ایک وسیع پیش دالان اور پھر ایک دالان تھا جس کی دونوں جانب ایک ایک کمرہ تھا۔ دائیں جانب والے کمرے میں اناج اور باورچی خانے کا سامان رکھا جاتا تھا اور بائیں طرف کے کمرے میں رفعت اور اسلم کی مختصر سی گرہستی کا سارا ساز و سامان رہتا تھا۔ دالان دن میں اٹھنے بیٹھنے کے لئے تھا اور پیش دالان میں دو ایک ٹوٹی پھوٹی کرسیاں پڑی تھیں جنھیں کوئی استعمال نہیں کرتا تھا۔

تقریباً ایک سال پہلے وہ اس مکان میں آئے تھے۔ اس سے پہلے اسلم اپنے والدین ہی کے ساتھ رہتا تھا۔ لیکن کنبہ بڑا ہو، خیالات میں زمین اور آسمان کا فرق رہے اور آمدنی کے ذرائع محدود ہوں تو نباہ ذرا مشکل ہی سے ہوتا ہے اسی لئے وہ اپنے عزیز و اقارب اور برادری کے سارے لوگوں سے دور اس چھوٹے سے مکان میں اٹھ آئے تھے۔ رفعت نے گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے کے لئے اپنے میکے کی ایک پرانی ملازمہ کے لڑکے، یوسف کو نوکر رکھ لیا تھا اور زندگی تنگی ترشی سے کسی نہ کسی طرح بیت ہی رہی تھی .....

جب یہ طے ہو گیا کہ مرغیاں پالی جائیں تو اس کی تیاریاں بھی زور و شور سے شروع ہو گئیں۔ اسلم نے دوسرے ہی دن رفعت کو صحن والا کمرہ خالی کرنے کا نوٹس دے دیا۔ "لو! اپنا بستر وغیرہ دالان میں کر دا لو اور صحن کا کمرہ خالی کر دو۔"

"کیوں؟" رفعت حیرت سے بولی۔

"مرغیوں کے لئے"

"ارے واہ وا۔ مرغیوں کے لئے سونے کا کمرہ کون دے گا بابا! لکڑیوں کی کوٹھڑی میں رکھو۔"

"بس، اسی کا نام تو جہالت ہے۔" اسلم نے اپنی علمیت کی ڈینگ ماری "مرغیوں کے لئے انسانوں سے آٹھ گنا زائد ہوا اور روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس تاریک غار میں تو آدمی ہی کو زندہ رہنا مشکل ہے، مرغی کیا خاک جئے گی۔"

"افوہ، ابا اتنے چونچلے کرنے ہوں گے؟"

"پھر کیا سمجھتی ہیں آپ، ولایتی مرغیاں ہیں کوئی مذاق تھوڑا ہی ہے۔ ہم جیسے لوگ ان کی دیکھ بھال کا انتظام تو خیر کیا کریں گے تھوڑی سی لیپا پوتی ہی کریں تو سمجھو کہ غنیمت ہے۔"

"بھئی پھر تو میں باز آئی ایسی مرغیوں سے" رفعت نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے۔

بات کچھ بگڑتی ہوئی معلوم ہوئی تو فوراً لکچربازی شروع کردی "بابا! مرغیاں دیسی ہوں یا ولایتی۔ اگر ان کی پرورش کا اچھا انتظام نہ ہو، تازہ ہوا، صاف پانی، رہنے کے لئے ستھری جگہ اور اچھی غذا نہ ملے تو ظاہر ہے کہ وہ زندہ نہیں رہ سکتیں۔ اسی لئے تو ہمارے پاس بے حساب مرغیاں مرتی ہیں۔ تقریباً دس فیصد بیٹھے بیٹھے مر جاتی ہیں۔ بیس فیصد چیچک، ڈائریا اور دوسرے امراض کا شکار ہوتی ہیں، تیس چالیس فیصد رانی کھیت کے موذی مرض کی نذر ہو جاتی ہیں، پندرہ بیس فیصد کتوں، بلیوں اور چیلوں وغیرہ کی غذا بنتی ہیں اور باقی دس فیصد بمشکل ہماری غذا کا کام دیتی ہیں۔ ذرا غور تو کرو رفو، کتنا بڑا نقصان ہے۔ ملک کی مرغیوں کا نوے فیصد حصہ بیماری، جہالت اور کم علمی کی وجہ سے تباہ ہو جاتا ہے حالانکہ اگر ذرا سے سائنٹفک طریقے اختیار کئے جائیں تو اس کے بہت بڑے حصہ کو بچایا جا سکتا ہے۔"

بیوی شوہر کی معلومات سے کافی مرعوب ہو گئی تھی اس لئے دبی دبی آواز میں بولی "اچھا بابا، اب لکچر چھوڑو۔ خالی کر دیتے ہیں ہم کرہ۔"

کمرہ خالی ہو گیا تو اس میں ریت کی ایک موٹی تہہ بچھا دی گئی۔ ڈی ڈی ٹی کا چھڑکاؤ ہوا اور احتیاطاً گندھک کی دھونی بھی دے دی گئی تاکہ مچھروں اور دوسرے بیماری لانے والے کیڑے پتنگوں کا نام و نشان نہ رہنے پائے۔ اسلم نے تین چار دن تک کتابوں کا مطالعہ کرنے اور سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ کاروبار انڈوں سے شروع کیا جائے۔ دوسرے دن صبح میں وہ اپنی جیپ لے کر سرکاری پولٹری فارم کے لئے روانہ ہو گیا۔ جاتے ہوئے اس نے رفعت کو بہت سی ہدایتیں دے دیں اور چوک سے دو کڑک مرغیاں منگوانے کے لئے کہہ دیا۔

شام میں سات آٹھ بجے تک وہ گھر لوٹا تو اس کے ساتھ انڈوں کی دو چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں بھی تھیں۔ اس وقت تک رفعت نے بھی کڑک مرغیاں منگوا لی تھیں۔ "بڑے مشکل اور خوشامدوں سے ملے ہیں یہ انڈے۔" اس نے کپڑے اتارتے ہوئے رفعت سے کہا "صرف دو ہی قسم کی مرغیاں ہیں وہاں، لگ ہارن اور روڈ آئیلنڈ ریڈ۔ لگ ہارن کچھ زیادہ اچھے نہیں۔ دو سو اور دو سو انڈے دینے والی نسل ہے۔ وہ لوگ ابھی کچھ اچھی بلڈ اسٹرین نہیں بنا سکے ہیں، ورنہ یہ قسم تو ایسی ہے جن میں تین تین سو انڈے دینے والی مرغیاں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن روڈ آئیلنڈ اتنی پیاری تھیں کہ تو دیکھتی تو خوش ہو جاتی، بہت عمدہ ٹیبل فاول ہیں ۔۔۔۔ میں ہر ایک کے نو، نو انڈے لیتا آیا ہوں۔"

کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اس نے بڑے غور سے کڑک مرغیوں کا معائنہ کیا۔ مرغیاں کافی بڑی بڑی تھیں اور کسی قسم کی بیماری کی بھی کوئی علامت نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس طرف سے پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد کمرے سے دو ٹوکریاں نکالی گئیں جو پہلے ہی سے اس موقع کے لئے منگوا لی گئی تھیں۔ دونوں ٹوکریوں میں نیچے کاغذ بچھا کر تین چوتھائی حصے تک ریت بھر دی گئی پھر اس پر کافی مقدار میں راکھ ڈالی گئی۔ ڈی ڈی ٹی پاؤڈر کا چھڑکاؤ کیا گیا۔ ایک رکابی کے پیندے سے ایک گڑھا سا بنایا گیا جس میں پرانے بورئیے کا ایک ایک ٹکڑا بچھا دیا گیا تاکہ مرغی آسانی سے انڈوں کو الٹ پلٹ کر سکے ۔۔۔ یہ ہو چکا تو ہر ایک ٹوکری میں نو، نو انڈے رکھ دیئے گئے اور ٹوکریوں کو کمرے کے الگ الگ کونے میں رکھ کر مرغیوں کو ان کے قریب چھوڑ دیا گیا۔

دونوں مرغیاں آسانی کے ساتھ انڈوں پر بیٹھ گئیں ۔۔۔۔ قندیل کی مدھم روشنی میں پہلے انھوں نے گردنیں آگے بڑھا بڑھا کر انڈوں کو خوب غور سے دیکھا۔ ایک دو بار کٹک کٹک کٹ ۔۔۔۔ کٹک کرتی ہوئی ٹوکریوں کے گرد گھومیں اور پھر اسلم اور رفعت کی موجودگی کی پرواہ کئے بغیر اچک کر ٹوکری پر چڑھ گئیں۔ انڈوں پر بیٹھے اور انھیں چونچ سے اچھی طرح اپنے نیچے لینے کے بعد دونوں نے جسم کو ایک خاص قسم کی حرکت دی اور پھر پر پھیلا کر خاموش ہو گئیں جیسے اب پورا پورا اطمینان ہو گیا ہو۔

اسلم اور رفعت بھی مطمئن ہو گئے۔ ہر ٹوکری پر ایک ایک بڑا ٹوکرا ڈھانکنے کے بعد دونوں کمرے سے نکل آئے اور باہر سے

زنجیر چڑھا دی گئی۔

تین ہفتے بڑی مشکلوں سے گزرے۔ اس عرصے میں اسلم نے پچاس ساٹھ روپے صرف کر کے پیدا ہونے والے چوزوں کے لئے ایک خوبصورت پنجرہ بنوایا۔ مختلف بیماریوں کے لئے بازار سے دوائیں خریدیں۔ روزانہ غور سے کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا اور باقی وقت میں مرغیوں کی افادیت پر رفعت کو لکچر دیتا رہا۔

اتنے عرصے تک مسلسل اسلم کی باتیں سنتے سنتے رفعت کو بھی مرغیوں سے خاصی دلچسپی ہو گئی تھی۔ یوں بھی عورتوں میں پیار سے اور پرورش کرنے کا جذبہ کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے اس لئے اکیسویں دن چوزے پیدا ہوئے تو اسلم کے ساتھ ساتھ اسے بھی بے انتہا خوشی ہوئی۔

"ارے کتنا ننھا سا ہے یہ" اس نے ایک چوزے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ چوں، چوں ـــــ چوں، چوں چوزے نے مدد کے لئے اپنی ماں کو آواز دی اور مرغی نے فوراً ایک زوردار ٹھونگ رسید کی "اف" رفعت کی منہ سے ایک دبی ہوئی آواز نکلی اور وہ اپنا ہاتھ چوسنے لگی۔

اسلم نے ہنستے ہوئے اوپر سے ہاتھ بڑھا کر مرغی کے دونوں پنکھ پکڑ لئے اور اسے آہستہ سے ٹوکری سے اٹھا کر ٹوکرے میں بند کر دیا۔ اس ٹوکری میں روڈ آئیلنڈ رڈ کے انڈے رکھے گئے تھے۔ جملہ چھ چوزے نکلے تھے اور بقیہ تین انڈے جوں کے توں دھرے تھے۔

چوں، چوں ـــــ چوں، چوں چوزے زور زور سے چلانے لگے

کک ٹک، کک ـــــ کوک، کک، کک ـــــ کوک مرغی ٹوکرے میں اچھلتے ہوئی چیخنے لگی۔

"اللہ، کتنے پیارے ہیں!" رفعت اس طرح چوزوں کو تکے جارہی تھی جیسے وہ دنیا کی حسین ترین چیز ہوں۔

چوں، چوں ـــــ چوں، چوں ـــــ چوں چوں۔ چوزوں نے سارا کمرہ سر پہ اٹھا لیا۔ مرغی نے ٹوکرے کے اندر سے جوابی کارروائی شروع کی تو کمرے کے دوسرے کونے میں رکھے ہوئے ٹوکرے سے بھی زندگی کا ثبوت ملنے لگا اور چوں چوں اور کک، کک کی ملی جلی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اسلم نے ایک چوزے کو بڑی احتیاط سے اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا اور ٹوکرے کو ذرا سا اٹھا کر اسے اندر چھوڑ دیا، پھر دوسرا، تیسرا اور چوتھا اس طرح جب ایک، ایک کر کے سارے چوزے ٹوکرے میں مرغی کے پاس چھوڑ دیئے گئے تو وہ دوسری ٹوکری کی طرف متوجہ ہوا۔ مرغی کو علیحدہ ٹوکرے میں بند کر دینے کے بعد پتہ چلا کہ اس ٹوکری میں چوزوں کی تعداد زیادہ ہے۔ جملہ آٹھ چوزے تھے اس میں، لیکن ایک انڈے میں پھنسا ہوا دم توڑ چکا تھا البتہ سات پیلے پیلے چوزے اپنی چھوٹی چھوٹی چونچیں کھولے زور زور سے چیخے جارہے تھے۔ اسلم نے انھیں بھی اسی ٹوکرے میں چھوڑ دیا جس میں روڈ آئیلنڈ رڈ کے چوزے تھے۔ جو انڈے بچے ہوئے تھے انھیں اس نے خوب الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کان کے قریب لے جا کر کچھ سننے کی کوشش کی لیکن آثار کہہ رہے تھے کہ ان میں زندگی کی کوئی علامت نہیں۔ اس لئے ٹوکریوں میں بھری ہوئی ریت اور انڈوں کے چھلکوں کے ساتھ انھیں بھی باہر پھنکوا دیا گیا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ٹوکرے میں جھانک کر دیکھا، مرغی نے روڈ آئیلنڈ کے چوزوں کے ساتھ اپنے نئے بچوں کو بھی اپنے پروں میں جگہ دے دی تھی اور پر پھیلائے مزے میں بیٹھی تھی۔ دوسرے ٹوکرے کی مرغی مسلسل چیخے جارہی تھی کک، کک، کوک کک، کک، کوک ر

"آج اس مرغی کو چوک بھجوا دے رفو!" اسلم نے ٹوکرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اتنے چوزوں کے لئے ایک مرغی کافی ہے۔"

اس کے بعد کے تین چار دن بڑی مصروفیت اور ہماہمی میں گزرے۔ اسلم کا خیال تھا کہ جب تک کسی شخص کا یقین پختہ نہیں ہوتا اس وقت تک وہ عمل بھی نہیں کر سکتا اور جہاں تک مرغیوں کی پرورش میں سائنٹفک طریقوں پر عمل کرنے کا تعلق تھا۔ ....

.... رفعت کو ان طریقوں پر پختہ یقین تو ایک طرف رہا وہ ان کی ضرورت تک کو محسوس نہیں کرتی تھی مثلاً اگر اسلم کہتا۔ "دیکھو رفو، پوٹاشیم پرمنگنیٹ ملائے بغیر پانی نہ رکھا کرو" تو وہ فوراً جواب دیتی "کیوں ہم تو ویسا ہی پانی پیتے ہیں، مرغیوں کے لئے اتنے اہتمام کی کیا ضرورت؟"

اسلم دن بھر تو گھر میں نہیں رہتا تھا کہ وہ سارا کام اپنے ہاتھ ہی سے کر لیتا۔ اس کا زیادہ تر وقت اب بھی ملازمت کی تلاش میں گزرتا تھا اس لئے رفعت کو ساری باتیں سمجھانا ضروری تھا تاکہ وہ اس کی غیر موجودگی میں ان کا خیال رکھ سکے اسی لئے وہ بڑی نرمی سے اسے سمجھاتا "دیکھو بھئی، اگر ہم نہیں پیتے ہیں صاف پانی تو کونسا اچھا کام کرتے ہیں، تم آج ہی سے اپنے پینے کے پانی میں بھی دوائی ڈالنا شروع کر دو، بہت سی بیماریوں کی روک تھام تو صرف اسی ایک چیز سے ہو جاسکتی ہے لیکن زیادہ مت ڈالنا، خواہ مخواہ پانی بدمزہ ہو جائے گا، صرف پانی کا رنگ تبدیل ہو جائے تو کافی ہے۔"

کسی بات کی تبلیغ کرنے والا اگر خود اس بات پر ایمان رکھتا ہو اور خلوص و محبت کے ساتھ اس کی تبلیغ کرے تو بات سمجھ میں آہی جاتی ہے اور سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ——— رفعت کے ساتھ بھی یہی ہوا، اسلم کی باتیں کچھ اتنی پر یقین ہوتیں اور وہ انھیں اتنے خلوص کے ساتھ سمجھاتا کہ وہ آہستہ آہستہ متاثر ہوتی گئی اور اب چھوٹی چھوٹی باتوں کا وہ خود ہی خیال رکھنے لگی۔ علی الصبح چوزوں کو کمرے سے نکال کر صحن میں رکھے ہوئے پنجرے میں بند کرتا، پنجرے میں کچھ کپڑے یا ٹاٹ کے تھیلے وغیرہ ڈال دیتا تاکہ اس کا ایک حصہ ہمیشہ چھاؤں میں رہے، پانی ایسے مقام پر رکھنا جہاں دھوپ آنے کا امکان نہ ہو، ڈیڑھ، ڈیڑھ، دو، دو گھنٹوں سے انھیں تھوڑی تھوڑی غذا دیتے رہنا یہ ساری باتیں رفعت کے لئے اب روز کا معمول ہو گئی تھیں اور وہ انھیں خوشی خوشی انجام دیتی، بھولے بھولے، بے بس اور کمزور چوزوں کو اپنے ہاتھوں پھلتے پھولتے اور پروان چڑھتے دیکھ کر اسے ایک قسم کی ذہنی تسکین اور روحانی مسرت کا احساس ہوتا اور وہ بڑے لاڈ اور چاؤ کے ساتھ ان کی دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتی۔

زندگی ایک ڈھرّے پر آ گئی۔ چوزوں کے پیدا ہونے کے بعد کے ابتدائی دنوں کا شور و غوغا، ہماہمی اور مصروفیت دھیرے دھیرے کم ہوتی گئی اور اب دن بڑے ہموار انداز میں بیت رہے تھے۔ دو تین ہفتوں کے بعد ہی چوزوں کے نئے پر پھوٹنے لگے۔ پیدائش کے وقت جسم پر جو ایک رواں سا لپٹا رہتا ہے وہ جھڑنے لگا اور اس کی بجائے موٹی موٹی نکیلی، خون سے بھری ہوئی کلیاں جلد سے ابھر آنے لگیں اور رفتہ رفتہ سر، گردن، پنکھ اور جسم کا سارا حصہ ان موٹی اور بدہیئت کلیوں سے بھر گیا۔ پھر یہ کلیاں بڑھیں، پکیں اور پک کر کھلنے لگیں ——— لگتا ان چوزوں کا جسم ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ان پر موتیا اور چنبیلی کے پھول کھلنے لگے ہیں۔ پھر یہ پھول آہستہ آہستہ بڑھتے گئے، پھیلتے گئے اور چوزوں کا سارا جسم روئی کے سفید گالوں میں تبدیل ہوتا گیا ——— اور "روڈ آئیلنڈ" تو بقول اسلم کے واقعی ایسے پر پرزے نکال رہے تھے کہ نمائش میں رکھنے کے قابل معلوم ہوتے۔ اسلم تو دن رات ان کی تعریف کرتے نہ تھکتا "تو دیکھ لینا رفو، میرے یہ بچے تو دنیا میں ضرور نام پیدا کریں گے" وہ اپنے چوزوں کی تعریف میں ڈینگیں مارنے لگتا "ہر ایک نمائش میں پہلا انعام نہ لیں تو کہنا" اور رفعت زبان سے کوئی جواب نہ دیتے ہوئے بھی اپنے شوہر کی بات پر صدق دل سے ایمان لے آتی اور اس کے بعد اور زیادہ تندہی اور محنت سے ان کی دیکھ بھال کرنے لگتی۔

دن دھیرے دھیرے گذرتے رہے ——— چوزے آہستہ آہستہ بڑے ہوتے گئے۔

تین مہینے اس انداز میں بیت گئے۔ اچھی غذا اور پرورش کی وجہ سے چوزوں کی جسامت اور خوبصورتی میں دن بہ دن اضافہ ہوتا گیا۔ اب تو وہ اتنے بڑے ہو گئے تھے کہ نر اور مادہ میں آسانی سے تمیز کی جاسکتی تھی لیکن اس کے باوجود گھر کی وہ فضا اب باقی نہیں رہی تھی جو تین مہینے پہلے تھی۔ اس وقت گھر میں "انعام" کی رقم تقریباً سب کی سب محفوظ تھی اسی لئے کسی فوری خطرے کا احساس

بھی نہیں تھا، لیکن اب وہ صورت نہیں تھی۔ اب تک اس رقم کا ایک بڑا حصہ صرف ہو چکا تھا اس۔ نئے گھر پر ہمیشہ مستقبل کے خوف اور دہشت کا تاریک سایہ منڈلاتا رہتا ـــــ چوزوں کو انڈوں کے قابل ہونے کیلئے چار مہینے اور چاہئیں، اس وقت تک کیا ہوگا؟ گھر کا خرچ کیسے چلے گا؟ اسلم کو اکثر اس کا خیال آ جاتا اور اس خیال کے آتے ہی اسے یکایک وحشت سی ہونے لگتی۔ کئی بار اس کے جی میں آئی کہ رفعت سے اس سلسلے میں مشورہ کرے لیکن اس کی ہمت نہیں ہوئی اور ہمیشہ اس کام کو دوسرے دن پر ٹالتا رہا۔

رفعت بھی ان دنوں کچھ کھچی کھچی سی رہنے لگی تھی، کچھ دنوں قبل اس نے یوسف کو بھی جواب دے دیا تھا اور اب گھر کا سارا کام کاج خود ہی کرتی تھی۔ مرغیوں سے جو بڑی بڑی امیدیں وابستہ کی گئی تھیں وہ جب ٹوٹ گئیں تو ان سے اس کی دلچسپی بھی ختم ہو گئی۔ اب اگر چوزے کسی وقت دالان میں بھی آ جاتے تو وہ غصے سے بڑبڑانے لگتی۔ اسلم اس جھنجھلاہٹ کے اصلی سبب کو اچھی طرح سمجھتا تھا اس لئے وہ اور زیادہ شدت کے ساتھ نوکری کی تلاش کرنے لگا۔

"رفو! نوکری ملنے کے فی الحال تو کوئی آثار نظر نہیں آ رہے ہیں ـــــ اچھا یہ تو بتا اب روپے کتنے رہ گئے ہیں؟" جو سوال کئی روز سے اس کے ذہن میں کلبلا رہا تھا وہ ایک دن زبان پر آ ہی گیا۔

"پچاس، ساٹھ روپے پڑے ہیں"

"بس!"

"پھر اور کیا ہوگا، پانچ مہینے سے گھر کا خرچ چل رہا ہے۔ سو ڈیڑھ سو آپ کے مرغیوں کے شوق کے نذر ہو گئے۔ اب پچاس ساٹھ نہیں تو اور کیا بچیں گے؟" رفعت نے بہت ہی تنک کر جواب دیا۔

"ارے بابا میں حساب نہیں پوچھ رہا ہوں ـــــ یونہی دریافت کر لیا اس میں برہم ہونے کی کیا بات ہے؟"

"ہاں یہ برہم ہونے کی بات کہاں ہے۔ آپ دن بھر گھومتے رہیے یا اپنی مرغیوں سے دل بہلائیے اور اگر کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی نکل جائے تو کہئے کہ یہ برہم ہونے کی کونسی بات ہے۔ ہم انسان کہاں ہیں، ہمارا کام تو ہمیشہ مسکراتے رہنا ہے۔"

"اچھا بھئی، میں اب تم سے بحث کہاں کروں" اس نے آنے والے طوفان کا اندازہ کرتے ہوئے چپ ہو جانا ہی مناسب سمجھا۔

نوکری..... نوکری..... نوکری..... زندگی پھر اسی محور کے گرد گھومنے لگی۔ دن تیزی سے گذرتے گئے اور دنوں کے ساتھ ساتھ رفعت کے چڑچڑے پن اور اسلم کی فکروں میں بھی اضافہ ہوتا گیا ـــــ آخر وہ دن بھی آ گیا جس کا اسے کئی روز سے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ایک رات اسلم گھر آیا تو اسے پتہ چلا کہ رات گھر میں چولہا ہی نہیں جلا کیونکہ ترکاری کے لئے پیسے نہیں تھے۔ رفعت نے مسکرانے کی ایک بھدی سی کوشش کرتے ہوئے اسے یہ بات بتا دی اور چپ ہو گئی جیسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ اس کے بعد کیا کہے ـــــ دونوں بھوکے ہی بستر پر لیٹ گئے۔

رفعت تو کچھ دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد سو گئی لیکن اسلم بڑی دیر تک بستر پر لیٹا ہوا اپنی بیوی کے چہرے کو دیکھتا رہا اور اس کے دماغ میں سیکڑوں خیالات بھٹکے ہوئے کبوتروں کی طرح چکر کاٹتے رہے۔ پانچ برس پہلے جب رفعت اس کے گھر دولہن بن کر آئی تھی تو وہ کتنی حسین تھی، بہار کے کسی خوشگفتہ پھول کی طرح، رنگت ایسی جیسے کسی نے دودھ میں ہلکا سا گلابی رنگ گھول دیا ہو۔ آنکھیں ایسی کہ اگر جھکیں تو کنول کی بند کلیاں معلوم ہوں اور اٹھیں تو یوں محسوس ہو جیسے دو ستارے جگمگا رہے ہیں۔ ابرو ایسے خمیدہ اور نازک کہ دیکھنے والوں کو ان کی اصلیت میں شبہ پیدا ہو جائے ـــــ اس زمانے میں سچ مچ رفعت ایسی تھی کہ وہ کسی محفل میں چلی جاتی تو ہر ایک کی نظریں اسی پر پڑنے لگتیں اور واپس آنے کے بعد اس کی امی کو تین تین بار آیۃ الکرسی پڑھ کر دم کرنا پڑتا تاکہ کسی کی نظر نہ لگ جائے ـــــ لیکن پچھلے پانچ سالوں میں یہ حسن بڑی حد تک ماند پڑ چکا تھا، رنگت کی سرخی ہلکی ہلکی زردی کے آگے ہتھیار ڈال چکی تھی، کنول کی بند کلیاں سیاہ حلقوں میں گھر گئی تھیں اور ستاروں کی چمک اب اتنی ماند پڑ گئی تھی کہ ان کی جگمگاہٹ کا کبھی کبھا

کا احساس ہوتا تھا۔

بستر پہ خاموش بیٹھا ہوا اسلم نہ جانے کب تک اس قسم کی باتیں سوچتا رہا ـــــ سوچتا رہا اور کروٹیں بدلتا رہا ـــــ تب کہیں جا کر اس کی نیند سورج کے طلوع ہونے سے پہلے ہی اچٹ گئی اور وہ بستر سے اٹھ گیا۔

کچھ دیر کے بعد جب رفعت آنکھیں ملتی ہوئی صحن میں آئی تو وہ بڑے اطمینان کے ساتھ بیٹھا ہوا ایک روڈ آئیلنڈ چوزے کے پر نوچ رہا تھا۔

"ارے، یہ کیا کر دیا تم نے؟" رفعت حیرت سے ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی

"ویڈنگ"

"کیا!"

"ارے بھئی سائنٹفک طریقے سے مرغیاں پالنے والا جو بھی شخص ہوتا ہے نا . . . ."

"ہاں"

"اسے وقتاً فوقتاً ایسے پرندوں کو چھانٹ دینا پڑتا ہے جن میں کوئی خرابی ہو۔ ورنہ ساری نسل تباہ ہو جاتی ہے ـــــ آج صبح اٹھ کر جو میں نے دیکھا تو اس کمبخت کی بائیں آنکھ میں ذرا سا عیب تھا۔"

"کیا عیب تھا آنکھ میں، مجھے تو کبھی کوئی عیب نظر نہیں آیا۔"

"ارے تجھے کیا نظر آتا۔ آج صبح میں نے بھی غور سے دیکھا تو پتہ چلا، بدمعاش ایسی بیماری لئے پھر رہا تھا کہ اگر اور کچھ دنوں تک نظر نہ پڑتی تو خدا جانے دوسرے پرندوں کا کیا حشر ہوتا۔"

رفعت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے "بھئی لیکن اسے ذبح کیوں کر دیا" وہ تقریباً روتے ہوئے بولی "چھانٹنا ہی تھا تو چوک بھجوا دیتے۔"

"لیکن چوک کس کے ہاتھوں بھیجتے، یوسف کو تو تو نے نکال دیا۔"

"ارے بابا میں خالہ کے چھوکرے سے بھجوا دیتی یا کسی اور سے کہتی، ذبح کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"اب چوک کون بھجوائے رفو" اس نے بیوی کی طرف دیکھے بغیر پروں کو جلدی جلدی نوچتے ہوئے جواب دیا "میں نے سوچا چلو آج مرغ ہی کھائیں گے ـــــ مرغ کھائے ہوئے دن بھی تو بہت ہو گئے تھے۔"

"مگر گھر میں چاول بھی تو نہیں ہیں، صرف آدھ سیر جوار کا آٹا پڑا ہے۔"

"بس، بس بہت کافی ہے، چاول میں کیا دھرا ہے صرف نشاستہ ہوتا ہے، خواہ مخواہ آدمی پھول کر کپا ہو جاتا ہے، جوار میں تو کئی قسم کے وٹامن ہیں۔"

رفعت نے کوئی جواب نہیں دیا اور خود بھی اس کے پاس بیٹھ کر پر نوچنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے رکتے رکتے کہا "دیکھو ایک بات کہوں۔"

"ہوں"

"یہ ویڈنگ ویڈنگ کیا کہا تم نے ابھی؟"

"ویڈنگ"

"تم یہ ساری مرغیوں کی ویڈنگ کیوں نہیں کر دیتے؟"

"کیا مطلب؟" ہاتھ پر نوچتے نوچتے یکایک رک گئے

"آج جمعہ ہے"

"ہوگا ـــــ تو؟"

رفعت کی آنکھوں کی رہی سہی چمک بھی اداسی میں تبدیل ہوگئی اور اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا "گھر میں راشن نہیں اور آج راشن کا آخری دن ہے۔ کل دوکان بند رہے گی۔ پانچ سات مرغیاں رکھنے سے کیا حاصل۔ اگر تم کہو تو آج چوک بھجوا دوں۔ کم از کم دو ایک دن کا راشن ہی آجائے گا۔"

"ارے نہیں۔ فوراً راشن کا میں انتظام کرتا ہوں" اسلم نے جواب تو دیدیا لیکن اس کی آواز میں اعتماد نہیں تھا۔

ناشتے کے بعد اس نے کپڑے تبدیل کئے۔ دھیرے دھیرے چلتا ہوا صحن تک گیا۔ پھر وہیں کھڑے ہوکر اس نے اپنی بیوی کو صدا دی "رفو!"

"کیا ہے؟" رفعت نے دسترخوان پر سے رکابیاں اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

"دیکھو، وہ چوک بھجوانی ہے تو بھجوا دے۔"

رفعت شاید کسی اور خیال میں کھوئی ہوئی تھی اس لئے اس نے پوچھا "کیا بھجوا دوں؟"

"ارے آپ تو بالکل بدھو ہیں ـــــ بیوقوف!" اسلم یکایک بھڑک اٹھا "مرغیاں بھجوا دیجئے جناب ـــــ مرغیاں!"

رفعت اس طرح چونک پڑی جیسے اس کا جسم بجلی کے کسی تار سے چھو گیا ہو ـــــ اس کی آنکھوں میں اچانک آنسو بڑے موٹے موٹے قطرے امنڈ آئے اور وہ دھندلائی ہوئی نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھنے لگی جو تیز تیز چلتا ہوا گھر سے باہر جا رہا تھا ـــــ جیسے کسی چیز سے بھاگ رہا ہو۔

داس

شکست

وہ ایک فلم ایکٹر تھا اور جنگ کے اس زمانے میں جب ہندستان میں ہالی وڈ کی نقالی میں سستی اور گھٹیا فلمیں بنائی جاتی تھیں۔ لوگ صرف اس کے رقص کی خاطر فلم دیکھتے تھے۔ دراصل وہ کوئی باقاعدہ تربیت یافتہ یا فن داں رقاص نہیں تھا۔ وہ تو فلم سازی کے دور سے قبل جب ناٹک کمپنیوں کا زور تھا ایک ناٹک کمپنی میں ملازم ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں چونکہ ناٹک میں عورتوں کے لئے کام کرنا دشوار بھی تھا اور مصلحت کے خلاف بھی اس لئے ناٹک والے خوبرو لڑکوں سے عورتوں کے رول ادا کرواتے تھے اور اسے بھی اس طرح کا کام دے دیا گیا تھا۔ وہ ابتداء میں ہیروئن کی سہیلیوں یا خادماؤں کا پارٹ کرتا رہا پھر آہستہ آہستہ اسے گانے اور رقص کرنے والے گروپ میں شامل کیا گیا جہاں اس نے تال اور سر کے ساتھ پیر سے تھاپ دینا اور چند مخصوص زاویوں میں ہاتھ اور کمر کے ذریعہ ارت دکھانا سیکھ لیا تھا۔ رقص کے متعلق اس کی تربیت بس اتنی ہی تھی۔ اسے اس وجدانی کیفیت کا یا تو کوئی پتہ ہی نہیں تھا یا وہ اس کے بس کی بات نہیں تھی جو ایک فن داں اور ماہر رقاص اپنے ابرو کی ہر جنبش، اپنے آنکھوں کے ہر اشارے، اپنے پیر اور بازوؤں کی ہر حرکت، اپنے انگلیوں کی ہر پور اور اپنے گھونگرو کی ہر جھنکار سے پیدا کر سکتا ہے لیکن جب جنگ کے زمانے میں پیسہ سستا ہو گیا اور فلم والوں نے عامیانہ اور رنگین فلمیں بنانا شروع کیں تو اسے بھی کچھ چلتے ہوئے بے معنی اور لچر گانوں کے ساتھ نیم مزاحی قسم کے رقص کے رول بھی دیئے گئے اور وہ سارے ہندستان میں مشہور ہو گیا۔ اس نے کچھ دولت بھی جمع کر لی تھی لیکن اس طرح کے دور چونکہ زیادہ دن نہیں چلتے اور لوگ آخر بیزار آ کر اچھی چیز کا مطالبہ کرتے ہی ہیں اس لئے فلم کے میدان میں اس کیلئے زیادہ موقعہ باقی نہیں رہا اور کسی وجدانی لمحہ میں اس پر یہ وحی نازل ہوئی کہ اسے ایک بیالٹ ٹروپ بنا کر ہندستان کا سفر کرنا چاہیئے اور اس طرح اپنے رقص کا اسٹیج پر مظاہرہ کر کے کچھ پیسے کمانے چاہئیں اور اسی سلسلہ میں وہ یہاں بھی وارد ہوا تھا۔ یہاں آنے کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اسی ریاست کے ایک چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہوا تھا اور اسے خواہ مخواہ یہ امید تھی کہ یہاں اس کا بہت اچھا خیر مقدم کیا جائے گا۔

اس نے سنگھار میز کے آگے کھڑے ہو کر بالوں میں کنگھا کیا اور اپنی ٹی شرٹ کی سلوٹیں درست کیں پھر اپنی پتلون کی کریز کو ٹھیک کر کے اس نے وینشنگ کریم کی شیشی کھولی اور بہت احتیاط سے کریم کو اپنے چہرہ اور ہاتھوں پر ملا۔ اس کی جلد میں اب جھریوں کے آثار پیدا ہونے لگے تھے اور کنپٹیوں پر بال بھی سفید ہو رہے تھے۔ اسے ابھی سیٹھ منی لال کا خیال ستا رہا تھا جن سے ملنے کے لئے وہ سہ پہر میں گیا تھا اور جنھوں نے یہاں اس کے اسٹیج شو کے لئے ساجھے کی بنیاد پر انتظامات کئے تھے اور معقول آمدنی کی امید میں کافی روپیہ خرچ کیا تھا۔

"سالا سیٹھ کہیں کا۔ اس نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔" اس نے پوڈر کی ایک ہلکی تہہ چہرہ اور ہاتھوں پر جماتے ہوئے سوچا اور پھر باتیں کیسی بڑی بڑی کرتا تھا۔ مجھ پر ہی الزام دھرتا ہے کہ میں نے اپنا بیالٹ ٹروپ نہایت لاپرواہی سے ترتیب دیا ہے اور میرے آرٹسٹوں میں کوئی رقص اور موسیقی کے ابتدائی فن سے بھی واقف نہیں۔ جیسے اس کے باپ دادا سب بڑے استاد رہے ہوں۔ وہ تو صرف روپیہ کمانے کا فن جانتا ہے اور اس میں بھی نہ صرف یہ کہ ناکام ہو گیا بلکہ مجھے بھی تباہ کر ڈالا۔ اگر امر

پلیسٹی کی ہوتی تو کبھی مجھے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ اس شہر میں تو بمبئی کے تھرڈ کلاس شروپ بھی ہزاروں روپیہ کمائے جاتے ہیں اور پھر یہ تو میرا اپنا وطن ہے اور میں اتنا مشہور فلم آرٹسٹ ہوں۔ کیا لوگ میرا نام سن کر بھی مجھے دیکھنے نہ آتے؟"

بیرے نے بیرے شیشے لاکر تپائی پر رکھ دیئے اور تپائی کھسکا کر صوفے کے قریب کر دی۔

اس نے سینٹ اپنے کپڑوں پر ملا اور بالوں پر آخری بار برش پھیر کر ایک سگریٹ جلایا اور چپ چاپ آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ بیرے نے شیشہ کھول کر بیئر اس احتیاط سے گلاس میں انڈیلی کہ جھاگ بالکل جمع نہ ہو سکا۔ اس نے سر اٹھا کر خالی نگاہوں سے بیرے کی طرف دیکھا اور کھوکھلے لہجے میں اخلاقاً کہا "تم بہت مشاق ہو۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

"صاب کی طبیعت اب کیسی ہے" بیرے نے ادب سے پوچھا

"ہاں اب ٹھیک ہے۔"

"صاب کے کھانے کے لئے کوئی چیز لاؤں۔ صاب نے کل سے کچھ نہیں کھایا ہے۔"

"ایں کل سے میں نے کچھ نہیں کھایا ہے۔ نہیں، میں نے رات باہر کھانا کھایا ہے۔ دراصل مجھے روز کہیں نہ کہیں دعوت رہتی ہے اس لئے میں تمہاری ہوٹل میں کھانا نہیں کھاتا۔ ضرورت ہوگی تو میں تمہیں بلا لوں گا۔ البتہ کچھ بسکٹ یہاں تپائی پر رکھ جاؤ۔"

بیرے نے بسکٹ تپائی پر رکھ دیئے اور چلا گیا۔

"کیا میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ ہاں ٹھیک ہی تو ہے۔ یہ میرا ہاتھ کیوں اس قدر کانپ رہا ہے۔ سب اسی وجہ سے ہے۔ سب اسی وجہ سے ہے۔ آج بیئر کتنی ٹھنڈی، خوشگوار اور میٹھی معلوم ہو رہی ہے۔ رات بھر ادھر ادھر کی شرابیں پینے کا نتیجہ ہے اور آج تو ساتواں دن ہے کہ میں روز شام میں پانچ بجے سے پینا شروع کر دیتا ہوں اور صبح چار بجے اور پانچ بجے ہوٹل آکر سوتا ہوں اور دن بھر سوتا رہتا ہوں۔ دعوت؟ دعوت یہاں کون خاک دے گا۔ وہ پانچ روپے خرچ کر کے میرا ڈانس دیکھنے آنا تک پسند نہیں کرتے تو مجھے دعوت کیا دیں گے۔ میں ہی بڑا بے حیا ہوں جو رات رات بھر ایک ایک کے گھر دوڑتا پھرتا ہوں۔ اور انھیں جگا کر ان سے باتیں کرنے بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ لوگ بھی میرے پیچھے مجھے گالیاں دیتے ہوں گے کہ میں خواہ مخواہ ان کی نیند خراب کرنے ان کے گھر پہنچ جاتا ہوں۔ اور بعض لوگ تو ملتے ہی نہیں۔ ان کے ملازم آکر کہہ دیتے ہیں کہ "صاحب کو اس وقت جگانے کا حکم نہیں۔ ہٹاؤ ان واہیات قصوں کو۔ آج میں کہیں نہیں جاؤں گا اور کسی سے نہیں ملوں گا۔ یہ بیئر بہت اچھی ہے۔ کونسی ہے۔ لوینفرنگل۔ جرمن ہے۔ کیا کہنا جرمنی کا۔ مگر وہ ہٹلر کے زمانے کی بات اب کہاں۔ کیا انسان تھا۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو جنگ کبھی ختم نہ ہوتی۔ اسے دراصل اس کے ساتھیوں نے ہی زہر دے کر مار دیا تھا۔ ورنہ وہ تو آخر وقت کوئی ایسا حربہ ایجاد کرتا کہ سارا پانسہ پلٹ جاتا اور اس کی وجہ سے صرف جرمنی ہی کو کیا ساری دنیا کو کس قدر فائدہ پہنچا ہے۔ ہم لوگوں نے اس زمانے میں کیا روپیہ کمایا ہے، کیا روپیہ کمایا ہے کہ واہ وا۔ وہ اگر زندہ ہوتا تو آج یہ دن بھلا کیوں دیکھنا نصیب ہوتا۔ وہ کیا مرا کہ ہمارے گھر سے لکشمی چلی گئی۔ ہائے ہٹلر۔ لیکن میرے ہاتھ مسلسل کیوں کانپے جا رہے ہیں۔ حالانکہ میں نے دو گلاس بیئر کے غٹاغٹ پی لئے ہیں اور اب بسکٹ تک مجھ سے نہیں ٹوٹتا۔ یہ سب بھوک اور کمزوری کی وجہ سے ہے۔ مگر بھوک تو مجھے بالکل نہیں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی سخت گولا پیٹ میں پھنس گیا ہو۔ یہ کیوں ہو رہا ہے۔ یقیناً یہ بری شرابوں کی وجہ سے ہے۔ یا ہو سکتا ہے میں رات بھر جو چوڑا، چبینا اور پکوڑے شراب کے ساتھ پھانکتا رہتا ہوں اس کی وجہ سے ہو۔ مجھے کچھ بیئر اور پی لینی چاہئے۔ اس سے طبیعت بالکل سنبھل جائے گی اور میں کچھ کھا سکوں گا۔ وہ اوپنر کہاں رکھ دیا کمبخت نے۔ میں نے تو اس سے کہا تھا کہ وہ تپائی پر رکھے۔ پھر وہ کہاں گیا۔ الو کہیں کا۔ ہاں یہاں کرسی پر رکھا ہے۔ کرسی پر اوپنر رکھا ہے۔ یہاں ہر چیز الٹی ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے۔ یہ سفر میرے لئے سخت منحوس ثابت ہوا ہے۔ خدا ہی خیر کرے۔ وہ بڑا مسبب الاسباب ہے وہ ضرور کچھ نہ کچھ کرے گا۔ افوہ اس میں سے کس قدر جھاگ نکل رہا ہے۔ میں اس بیرے کی اتنی صفائی سے تو خیر بیئر بھر شاید

ضد اندھیل مکمل لیکن اس قدر جھاگ بھی میں نے کبھی نہیں اڑایا۔ لیکن اس جھاگ میں کس نے قوس قزح کو توڑ کر ملا دیا ہے۔ یہ بجلی کس نے جلائی تھی۔ ہاں! ٹھیک تو ہے یہ گوپی رام نے جلائی تھی۔ جب وہ یہاں سے جا رہا تھا تو میں نے ہی اسے کہا تھا کہ بجلی جلا دینا۔ گوپی رام بالکل گدھا ہے۔ بلکہ گدھے کا بچہ ہے اور اس کی وجہ سے بھی میرا اس قدر نقصان ہوا۔ ورنہ مجھے کوئی اچھا سمجھدار ملتا تو میرا کبھی اتنا گھاٹا نہ ہوتا۔ یہ سامنے دیوار پر لگی ہوئی تصویر کتنی خوبصورت ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے یہ کوٹھی پہلے نواب احسان الملک بہادر کی تھی۔ اس وقت میں چھوٹا تھا اور اماں مجھے لے کر یہاں آیا کرتی تھی۔ ہم تین تین چار چار دن اور بعض دفعہ ہفتہ بھر یہاں رہتے تھے۔ اس وقت نواب صاحب مرحوم زندہ تھے اور اوپر ہی رہتے تھے۔ لیکن کبھی ہمیں اوپر جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اور ان کے رشتہ داروں اور مخصوص ملازموں کے سوا کوئی جانے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں جب نواب صاحب حضور والاشان کی پیشی مبارک میں تشریف لے جاتے تو ان کے پوتے اور نواسے وغیرہ سب مل کر کوٹھی کے پیچھے آم اور سیتا پھل کا جو بڑا باغ تھا اس میں جمع ہو کر کھیلتے اور شرارتیں کرتے اور مجھے پکڑ کر بار بار دلہو بنایا جاتا اور میں کچھ نہ کہہ سکتا اس لئے کہ اماں کا حکم تھا کہ صاحبزادے جیسا کہیں ویسا کرنا۔ اب بھی جب کوئی نیا آدمی ملتا ہے اور حیدرآباد کی پرانی باتیں دریافت کرتا ہے تو میں اسے ضرور بتاتا ہوں کہ اس کوٹھی کے پیچھے ایک بڑا باغ تھا اور بمبئی سے جو لوگ میرے ساتھ آئے ہیں انھیں تو میں نے تفصیل سے اس کوٹھی کا ایک ایک چپہ بتایا ہے۔ یہ ہے بھی دیکھنے کے قابل چیز۔ اب لوگوں میں ایسی عالیشان حویلیاں اور ایسی ڈھنگ کی کوٹھیاں بنانے کی تمیز ہی کہاں رہی ہے۔ اب تو لوگ کبوتر کے ڈربے کا چھوٹا موٹا بنگلہ بنا کر اور بیڈ روم کے ساتھ باتھ اٹیچ کر کے بڑا فخر کرتے پھرتے ہیں۔ ان میں اپنے گھر کے لئے صحیح نام تجویز کرنے کی تک تمیز نہیں رہی۔ اب میں نے اپنے گھر کا نام ”محل“ جو رکھ دیا ہے تو لوگ ہنستے ہیں۔ کہتے ہیں یہ تو بڑا پرانا فیشن ہو گیا ہے۔ ارے کمبخت، پرانا فیشن ہی تو معزز لوگوں کا فیشن ہوتا ہے ہر نیا فیشن تو نودولتئے اختیار کرتے ہیں۔ لیکن میں بھی تو بہرحال ایک نودولتیا ہی ہوں۔ آخر میرا باپ بھی تو نواب احسان الملک بہادر کے پاس محرر ہی تھا۔ اور وہ بھی چونکہ میری دادی نواب صاحب مرحوم و مغفور کی انا رہی تھیں اس لئے انھوں نے نواب صاحب مرحوم سے کہہ کر میرے والد کو نوکر رکھا دیا تھا۔ لیکن جو کچھ بھی ہو ہم نے رئیسوں کے آداب تو دیکھے ہیں اور ان کی صحبت میں زندگی کی شان و شوکت سے تو واقف ہو گئے ہیں۔ اب اگر بمبئی میں ہر شخص مجھے حیدرآباد کا ایک رئیس زادہ سمجھتا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میرے عادات و اطوار ہی ایسے ہیں اور یہ سب نوابوں اور نواب زادوں کی صحبت کا صدقہ ہی تو ہے اور پھر ایک طرح میرا رشتہ نواب احسان الملک بہادر سے ملتا ہی ہے اس لئے کہ میری دادی نواب صاحب مرحوم کے والد نواب ایمان الملک کی ”زوجگی“ میں آ گئی تھیں حالانکہ وہ میرے دادا کی بھی آخر عمر تک بیوی رہیں (لیکن یہ تو ہوتا ہی ہے) اور پھر میری دادی نے نواب احسان الملک مرحوم کو دودھ پلایا تھا اور اس گھر میں ان کا رتبہ حضرت بڑی بیگم سے کیا کم ہو گا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ مجھے بھی اس گھر تک رسائی حاصل تھی اور میرے دل میں اس گھر سے اور اس گھر کے بچے بچے سے اتنی عقیدت تھی کہ میں ان کی غلامی تک کرنے تیار ہو جاتا تھا۔ آخر نمک کا کچھ اثر ہوتا ہی ہے ———
لیکن یہ نوابی بمبئی میں مجھے بہت مہنگی پڑی ——— یہ آخر میرے ہاتھ کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ کیوں مسلسل اس قدر کانپ رہا ہے اور یہ بائیں پسلی سے ریڑھ کی ہڈی تک اور ریڑھ کی ہڈی سے کاندھے تک درد کی ٹیس کیوں اٹھ رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں میں رات ایک ہی کروٹ سو گیا تھا۔ مجھے آخر رات کی ہر بات کیوں بھول جانے لگی۔ کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔ لوگ دن میں مجھ سے شکایت کرتے ہیں کہ میں اسٹیج پر ناچتے ناچتے بے تالا ہو جاتا ہوں اور استاد کے بار بار اشارے پر بھی تال اور رات درست نہیں کرتا اور ایک دفعہ تو پنکی میرے ساتھ رقص کرتے کرتے چڑچڑا کر اسٹیج سے چلی گئی تھی۔ مگر مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔ جب کوئی میرے آگے یہ باتیں دہراتا ہے تو خیال کی دھندلاہٹوں میں جیسے جگنو چمکتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ کچھ نظر آ رہا ہے لیکن کچھ نظر نہیں آتا۔ ہاں! ہو گا بھی۔ کچھ ہو گا۔ ممکن ہے کوئی بیماری ہی ہو۔ ذرا یہاں سے کچھ روپیہ کما لوں اور گھر کے خرچ کی طرف سے اطمینان ہو جائے تو بمبئی پہنچ کر اپنی ی۔ی اور ہانٹ کروا لوں گا۔ لیکن اب تو پیسے کمانے کی امید بھی ٹوٹتی جا رہی ہے۔ آج ہی تو کسی وقت نلینی، اس کا شوہر اور اس کے ٹروپ کی لڑکیاں مجھ سے کہہ رہی

تعین کر اگر ان کے پیسے آج نہیں دیے گئے تو وہ بمبئی واپس چلے جائیں گے۔ سالے کمینے کہیں کے۔ جیسے یہاں میں نے بہت روپیہ کما لیا ہے کہ انھیں روز سو روپیہ دیا کروں۔ سالی ذرا کلاسیکل انداز میں ناچتی ہے تو نخرے کرتی ہے۔ جانے کیا کیا ناچتی ہے۔ کتھک، کتھاکلی، منی پوری، ستھال۔ بھلا یہ بھی کوئی ناچ کے نام ہیں۔ جس ناچ کے نام ہی اتنے بے ڈھنگے ہوں وہ ناچ بھی کیا ناچ ہوگا۔ اس پر میرے ناچ سے بیزار ہو کر اسٹیج سے چلی جاتی ہے۔ ارے جا بھی۔ مجھے تیری کب پرواہ ہے۔ تیرا ناچ تو ایک دس بارہ استاد قسم کے لوگ دیکھے ہوں گے یا کوئی شوقین مزاج رئیس دیکھ لیتا ہوگا۔ یہاں مجھے تو لاکھوں سنیما دیکھنے والے جانتے ہیں اور میرے رقص پر خوش ہو کر تالیاں پیٹتے ہیں، سیٹیاں بجاتے ہیں اور تو مجھے سبق سکھاتی ہے۔ ارت درست کرو۔ گھونگروؤں کا خیال رکھو۔ تھاپ گنو۔ ارے ہٹا ——— لیکن یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ میں کیوں اس قدر جھلا رہا ہوں۔ لاحول ولاقوۃ۔ یہ بیر ہے یا پانی۔ اس میں تو کوئی نشہ ہی نہیں۔ لوگ شربت پینے کے لئے تو بیر نہیں پیتے۔ مجھے کچھ وہسکی منگا لینی چاہیئے۔ گھنٹی کہاں ہے۔ ہاں یہ دروازہ کے پاس ہے۔ لیکن یہ بج گئی رہی ہے یا نہیں۔ کہیں آواز ہی نہیں سنائی دیتی۔ لیکن بھئی سچ تو یہ ہے کہ اتنی بڑی کوٹھی میں گھنٹی کی آواز بھلا کیا سنائی دے گی ———
واہ ری قسمت۔ یہ کوٹھی اور دوسری منزل کے یہ کمرے جہاں نواب صاحب مرحوم رہا کرتے تھے۔ کبھی ہم نے یہ خواب بھی نہیں دیکھا تھا کہ ہم اس کمرے میں جھانک بھی سکیں گے اور آج میں اس کمرے میں بیٹھا شراب پی رہا ہوں اور یہ کوٹھی مارواڑی ساہوکاروں نے خرید لی ہے اور اس میں پارسی تاجر بھائیوں نے ہوٹل لگا رکھا ہے۔ کیا گردش ہے زمانے کی۔ ورنہ کبھی نواب صاحب مرحوم یہاں آرام فرماتے ہوں گے۔ یہ جھاڑ اور فانوس اور یہ تصویریں انھیں کے زمانے کی یادگار معلوم ہوتے ہیں۔ کتنی خوبصورت تصویریں ہیں۔ یہ سب ایرانی عورتیں ہوں گی یا یونانی ہوں گی۔ پانی کے کنارے بیٹھی ایک دوسرے سے چہل کر رہی ہیں۔ کس قدر گدرائے ہوئے ہیں ان کے جسم اور یہ عورت جو ایک مخملی کوچ پر بیٹھی آئینہ دیکھ رہی ہے۔ یہ کوئی پرانی انگریز ملکہ ہوگی لیکن انگریز ملکہ کی تصویر ننگی نہیں ہوتی ——— وہ ایک مشہور ملکہ تھی نا۔ جو بہت عیاش تھی اور جس کی ہالی وڈ میں فلم بھی بنی تھی۔ یہ وہی ہوگی ——— ہاں تم آگئے۔ بھئی تمہارے پاس وہسکی کونسی ملے گی ——— جانی واکر مل جائے گی۔ ٹھیک ہے۔ لیکن کم از کم بیس برس پرانی ہونی چاہیئے۔ ہاں تو بس بہت مناسب ہے لے آؤ۔ دو پیگ اور ایک سوڈا۔ مگر جلدی کرو ——— خوب شراب مل رہی ہے یہاں۔ اور بھی جگہ ملتی ہے۔ مگر بلیک مارکٹ سے اور ایک ایک بوتل کے ستر اور اسی روپے دینے پڑتے ہیں اور یہاں ٹھاٹ سے چھتیس روپے میں شیشہ مل رہا ہے۔
اس نے سگریٹ جلایا اور چار دن کے شو کا پروگرام اٹھا کر دیکھنے لگا۔ پورا پروگرام تفصیل سے دیکھ کر اسے پھر اطمینان ہوا کہ اس نے اس شہر میں جو شو کئے ہیں وہ بہت اچھے تھے۔
" ہر پروگرام میں ایک کلاسیکل ڈانس ہے۔ ایک گروپ ڈانس ہے۔ فلموں کے مشہور گانے ہیں، غزلیں ہیں۔ کتنے ہی ڈوئیٹ اور سولو رقص ہیں اور سب مشہور فلموں سے لئے گئے ہیں۔ خود میں ہر پروگرام میں تین تین رقص پیش کرتا ہوں اور پھر کامک ان کے سوا ہے۔ اور یہ سیٹھ کا بچہ مجھ سے کہتا ہے کہ میں بچر پروگرام پیش کرتا ہوں۔ کلاسیکل گانے اور کلاسیکل رقص مانگتا ہے۔ بیوقوف کہیں کا۔ جیسے عام لوگ کلاسیکل چیزیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ ارے لوگوں کا مذاق اتنا اچھا ہوتا تو دن بھر بیٹھے استاد کریم خاں کے ریکارڈ نہ سن لیتے۔ ہماری فلمیں دیکھنے کیوں آتے۔ اب یہی نلینی جب ناچتی ہے تو لوگ بیوقوفوں کی طرح بیٹھے اسے تکتے رہتے ہیں اور اس کے برخلاف جب میرے "گندے انڈے" کا رقص ہوتا ہے یا سریندر جب "آئی لو یو" بالکل انگریزی انداز میں گاتا یا عاشق ومعشوق کا کامک پیش کیا جاتا ہے تو سیٹیاں بجتی ہیں اور لوگ وہ آوازے کستے ہیں کہ جی خوش ہو جاتا ہے اور یہ سیٹھ کا بچہ بتاتا ہے کہ اس سے اچھا پروگرام تو یہاں اسکول کے بچے کر لیتے ہیں اور یہاں ایسے ایسے معیاری پروگرام دن رات مزدوروں کے جلسوں اور کسان سبھاؤں میں پیش کئے جاتے ہیں کہ لوگ میری چیزیں پسند نہیں کرتے۔ بدمعاش کہیں کا۔
"ہاں۔ گلاس یہاں رکھ دو اور یہ خالی شیشے لے جاؤ"

• صاحب کے لئے ٹیلیفون آیا ہے۔ کوئی صاحب سے ملنے آنا چاہتے ہیں۔"

• ارے بھئی! اتار سے منیجر سے کہدو۔ وہ بات کرے گا۔ —— ہاں اسے کہدینا اگر کسی نواب کا ٹیلیفون ہے تو انھیں آنے دے۔ اگر کسی اور کا ہو تو میں ہوٹل پر نہیں ہوں اور اسے یہاں میرے پاس بھیج دو۔"

کس نے ٹیلیفون کیا ہوگا؟ خدا کرے کوئی اور پروگرام کروانا چاہتا ہو۔ اگر کوئی ایسا آدمی مل جائے اور پروگرام دوبارہ شروع ہو تو یقیناً اس دفعہ پوری کسر نکل جائے گی۔ کیا مزا ہو اگر روز دس ہزار روپے کا شو ہو جائے۔ پانچ ہی دن میں پچاس ہزار روپے بن جائیں گے۔ پھر تو میں اپنے پروگرام میں اور توسیع کردوں گا اور دس ہی دن میں ایک لاکھ روپے بن جائیں گے۔ بس پھر فراغت ہی فراغت ہے۔ یہ ہندستان کے اس کونے سے اس کونے تک خالی ہاتھ مارے مارے پھرنے سے تو نجات مل جائے گی اور چین سے بیٹھ کر باقی دن گذاریں گے۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ میں نے جنگ کے زمانے میں ہی مکان خرید لیا تھا اور لڑکیوں کی شادی کردی تھی ورنہ اس تنگی اور افلاس میں سر چھپانے کی جگہ تک نہ ہوتی اور میری لڑکیوں کو کوئی پوچھ کر بھی نہ دیکھتا۔ دراصل میں نے اپنی زندگی بڑی بدتمیزی سے گذاری ہے۔ نواب بننے کی کوشش میں بہت غلط طریقے سے میں نے روپیہ خرچ کیا ہے۔ یہ نوابی بہت مہنگی چیز ہے۔ پتہ نہیں ان نوابوں کے پاس روپیہ کہاں سے آتا ہے۔ اب تو کوئی نواب پانچ روپے خرچ کرکے میرا ڈانس دیکھنے تک نہیں آتا۔ حالانکہ نواب لوگ رقص اور موسیقی کے بڑے قدرداں ہوتے ہیں۔ ہوتے ہوں گے کلاسیکل چیزوں کے قدرداں۔ آج کل ہر شخص پر یہی جنون سوار ہے۔ کلاسیکل ڈانس فوک ڈانس۔ کلاسیکل میوزک۔ فوک میوزک۔ حد یہ ہے کہ میرا لونڈا تک یہی باتیں کرتا ہے۔ دو چار سستی فلموں میں کیا کام مل گیا کہ اپنے آپ کو بڑا آرٹسٹ سمجھنے لگا ہے۔ دو تین سو روپے مہینے پر کام کرتا ہے اور مجھے سکھاتا ہے کہ اب عوام ٹھوس چیزیں مانگتے ہیں۔ اپنے مسائل کے متعلق فلمیں چاہتے ہیں۔ بڑا چلا ہے عوامی مسائل کی فلمیں بنانے۔ ارے مسائل ہی حل کرنے ہیں تو لیڈری کیوں نہیں کرتا۔ آرٹسٹ کیوں بنا پھرتا ہے۔ اتنی بات نہیں سمجھتا کہ ان لوگوں کے پاس پیسہ ویسہ کچھ ہے نہیں اس لئے پندرہ بیس ہزار روپے لے کر عامیانہ سی فلم بنالیتے ہیں۔ سب کیرکٹر چیتھڑے لگائے پھر رہے ہیں۔ نہ کوئی کوسٹوم ہے۔ نہ رقص ہیں۔ نہ گانے ہیں۔ ارے کہاں سے لائیں گے پلے بیک سنگر کو دینے اور جب تک کسی فلم میں آٹھ دس گانے اور پانچ چھ ناچ نہ ہوں پکچر ہی کون دیکھے گا اور اب یہ نالائق آرٹسٹ مل کر بغیر پیسہ خرچ کئے فلم بنائیں گے۔ کوئی کچھ معاوضہ نہیں لے گا اور جب فلم بکے گی تو سب مل کر آپس میں آمدنی کو تقسیم کریں گے اور اس وقت تک کھائیں گے کیا۔ گھانس۔ اور وہ لونڈا مجھے اپنے ساتھ شریک کرنے چلا ہے۔ کہتا ہے آپ فوک ڈانس ناچئے اب یہ رمبا دمبا نہیں چلے گا۔ اب اس عمر میں مجھے نئے سرے سے گویا ناچ سیکھنا پڑے گا۔ ان لوگوں کے کہنے پر۔ ارے ہٹا بھی۔ اب کون ان لفنگوں کا ساتھ دے گا۔ ساری دنیا کیا کہے گی اور لے دے کر سال میں ایک دو کنٹراکٹ مل جاتے ہیں۔ سیٹھ لوگ وہ بھی دینا بند کردیں گے۔ خیر یہ بھی غنیمت ہے کہ وہ کام سے تو لگ گیا۔ اب میرے بعد وہی گھر سنبھالے گا۔ اس کی ماں کو بھی اس پر بڑا بھروسہ ہے۔ کچھ نہ ہوگا تو فاقے تو نہ کرنے پڑیں گے —— ہاں کہو بھئی گوپی رام تم آگئے کس کا ٹیلیفون تھا؟

• جی اسی سیٹھ منشی لال کا تھا۔ کہتا تھا آکر حساب دیکھ لو۔"

• بھئی کیا خاک حساب دیکھو گے۔ جیسے ابھی پانچ دس ہزار دے دے گا —— اچھا دیکھو گوپی رام کل رات ہم کو راجہ بہادر نے اپنے گھر کی کشید کی ہوئی جو شراب دی تھی نا۔ وہ کہاں رکھی ہے۔"

" جی یہیں الماری میں رکھی تھی۔" وہ صوفے کے گرد چکر کاٹ کر الماری تک گیا۔ لیکن وہاں پہنچ کر چند سکنڈ کے لئے رک گیا۔ اس نے سوچا آج رات پھر اگر اسی طرح شراب چلتی رہے تو نہ جانے کیا ہو جائے۔ کل بھی ان پر دل کا سخت دورہ پڑا تھا اس کے بعد ڈاکٹر نے کہا تھا کہ انھیں شراب سے بہرحال پرہیز کرنا چاہئے اور پھر پتہ نہیں یہ کس قسم کی شراب ہے اور اگر پی کر یہ پھر نکل گئے تو

خبر نہیں رات کہاں گزرے گی۔ حالانکہ انھیں بستر سے اٹھنا تک منع ہے۔ یہ میں نے کیا مصیبت مول لی ہے۔ پہلے ہی ان کی بیوی ساتھ آ جاتی۔ وہ شاید انھیں روک لیتی۔ ورنہ ان کو کچھ ہو جائے تو زندگی بھر بیری جان کو روتی رہے گی۔ اسے میرا تار تو مل گیا ہوگا۔ اگر وہ فوراً ہی نکل گئی ہے تو اسے آج پہنچ جانا چاہیئے۔

"ارے بھئی یہ کیا کر رہے ہو اتنی دیر" وہ جھنجھلا کر چلایا۔

"جی ابھی لایا" اس نے جلدی سے بوتل الماری سے نکال لی اور اسے دستی سے صاف کر کے تپائی پر رکھ دیا۔

"کیا بات ہے۔ کیا سوچ رہے تھے" اپنے سامنے بوتل دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک طرح کی تراوٹ آ گئی اور اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ لیکن اس کی آنکھیں شیشہ کی آنکھوں کی طرح مردہ رہیں۔ گوپی رام نے وہسکی کا خالی گلاس سوڈے سے صاف کر کے پھر تپائی پہ رکھ دیا اور اس نے دو پگ گلاس میں انڈیل لئے۔

"جی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر نے رات کہا تھا کہ آپ کو شراب بالکل نہ دی جائے اور آپ کو مکمل آرام لینا چاہیئے۔ پھر آپ نے کئی دن سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے اور آپ کو بیئر پہ وہسکی اور وہسکی پہ یہ شراب تو بالکل نہیں ملانی چاہیئے۔ اس سے آپ کا جگر بالکل خراب ہو جائے گا۔"

"سب واہیات" اس نے ایک ہی سانس میں دو پگ ختم کر دیئے اور تقریباً نصف گلاس بھر کر اپنے آگے رکھ لیا۔ "مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ کچھ سردی لگ گئی ہو گی وہ ابھی صاف ہو جائے گی۔ دراصل یہ شراب بہت عمدہ ہے۔ آگ کی طرح حلق سے پیٹ تک پہنچ گئی ہے۔ مجھے اسی شراب سے ابتدا کرنی چاہیئے تھی۔ لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ اس قدر عمدہ چیز ہے۔"

"میرے خیال میں اب آپ زیادہ مت پیجئے۔ اس لئے کہ ابھی آپ کو بہت کام کرنے ہیں۔ آرٹسٹ نیچے آپ کے منتظر ہیں۔ وہ اپنا معاوضہ مانگتے ہیں۔ ورنہ وہ واپس جانے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ آرکسٹرا والوں کو بھی آپ نے سویرے بلایا تھا اور وہ ابھی بیٹھے ہیں اور دنگا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ہوٹل والوں نے بھی دوپہر سے کھانا دینا بند کر دیا ہے۔ ان کا بل تقریباً دو ہزار روپے کا ہو گیا ہے اور تین سو روپیے کے قریب ٹیکسی والے کے دینے ہیں۔ میں بڑی مشکل سے ان سب کو صبح سے کسی طرح سمجھا رہا ہوں۔ اب آپ ہی آ کر ان سے کہئے تو شاید وہ مان جائیں۔ اب یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میں تو آج رات کی ٹرین سے واپس جا رہا ہوں۔"

"کیا کہا" وہ ایکدم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "تم جا رہے ہو ——— گدھے کہیں کے ——— سور کے بچے ——— نمک حرام ——— اچھا تم جاؤ۔ ان لوگوں سے کہہ دیں ابھی گھنٹہ بھر میں آ کر سب کی ایک ایک پائی چکا دوں گا۔ تم جاؤ یہاں سے۔"

"چلا گیا بے ایمان کہیں کا۔ یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔ میری بیوی آ جائے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میری بیوی ——— سالے سب کمینے ہیں۔ جانے دو سب کو میرا کیا بگڑے گا۔ میں کہاں سے لا کر انھیں پیسے دوں جیسے میں نے بڑی دولت کمائی ہے۔ ذلیل کہیں کے۔ سمجھتے ہیں اس طرح مجھے شکست دے لیں گے۔ سب حرامی ہیں۔ جانے دو۔ مجھے مار تھوڑی ہی ڈالیں گے ——— مار بھی ڈالیں تو میں کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ روشنی اس قدر مدھم کیوں ہو گئی ہے۔ میرا گلاس کہاں ہے۔ ہاں یہ ہے۔ یہ ہے۔ کیا شراب ہے۔ آہا ہا۔ کس قدر عمدہ شراب ہے۔ شراب کے سوا اب سب نے ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ سب کو جانے دو۔ جب تک شراب ہے مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ کس قدر لذیذ اور خوش بو دار شراب ہے۔ ارے بوتل کہاں ہے۔ آخر یہ کیوں کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ ہاتھ کو کیا ٹھنڈی ٹھنڈی چیز لگی ہے۔ یہی تو بوتل ہے۔ اُفوہ یہ اس قدر وزنی کیوں معلوم ہو رہی ہے۔ کوئی پرواہ نہیں۔ کوئی پرواہ نہیں۔ اخاہ! آخر میں نے گلاس میں انڈیل لی نا ——— مجھے بہت نشہ ہو گیا ہے۔ یہ شراب بہت تیز ہوتی ہے۔ راہبر صاحب نے کہا تھا اسے صرف گھونٹ گھونٹ کر کے پینا چاہیئے۔ ہاں اب میں اسی طرح پیوں گا۔ چسکیاں لے لے کر۔ اخاہ۔ بس اس پگ کے بعد

میں اب نہیں پیوں گا۔ مجھے بہت اچھی طرح نیند آ رہی ہے۔ ایک مدت کے بعد اس قدر جلد سونے کا موقع ملا ہے۔ لیکن ابھی تو اس گلاس میں شراب ہے۔ یہ تو ختم ہو جائے۔ اس وقت صوفے پر سر ٹیک دینا کس قدر آرام دہ معلوم ہو رہا ہے۔"

اور جب ایک گھنٹے بعد ہوٹل کا منیجر اپنا بل لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اسی طرح صوفے پر لیٹا تھا۔ گلاس ہٹ کر اس کے زانوؤں میں پڑا تھا اور اس کی آنکھیں شیشے کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں اور اس کا جسم برف کی طرح سرد اور پتھر کی طرح سخت ہو گیا تھا۔

یوسف منان

مجھے انتظار نہیں

بارش موسلا دھار ہو رہی ہے۔ اندھیرا کچھ اور گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ ایرانی کی ہوٹل کی گھڑی میں دن کے گیارہ بج رہے ہیں لیکن ہوٹل کی بتیاں جلائی گئی ہیں۔ ہوٹل کھچا کھچ بھری ہوئی ہے۔ میں سائبان تلے کھڑا ہوں کیونکہ میرے پاس نہ چھتری ہے نہ رین کوٹ اور ڈگم بوٹ ہیں۔ میری اکلوتی پتلون قمیص کی حفاظت مجھے بعض مرتبہ جان سے زیادہ عزیز ہونے لگتی ہے کیونکہ لوگ کپڑے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں اور کچھ میری اپنی طبیعت بھی صاف اور اجلا رہنے پر آمادہ رہتی ہے۔ اس وقت میں بھیگنے کا خوف لئے کھڑا ہوں۔

میرے سامنے شہر کا سب سے بڑا اور مشہور ہسپتال ہے۔ ہسپتال کے پھاٹک کے اندر قیدیوں سے بھری ہوئی دو لاریاں کھڑی ہیں۔ لاری کے پچھلے دروازوں پر دو دو سپاہی بھی بندوق سنبھالے بیٹھے ہیں جو دھندلائے سے لگتے ہیں۔ اس دھندلاہٹ میں ان کا ہلکا سا یونیفارم بھی شامل ہے جو گہرا رنگ یوں جذب کئے ہوئے ہے جیسے جاذب نے روشنائی چوس لی ہو۔ قیدیوں کے لباس کو میں نے تصوراتی دائرہ میں رکھا۔ سفید کھادی کا کرتہ جس پر کالی دھاریاں ہیں، ایک دوسری کو کاٹتی ہوئیں۔ مربع بناتے ہوئے اسی کپڑے کی گول ٹوپی اور آف نیکر ——— ان ہی لباس، بعض اس میں دارڑ ہوں گے جن کی لمبی اور گول پیلے رنگ کی ٹوپیاں ہوں گی جن کو پہن کر شاید وہ خود بھی اپنے آپ پر ہنستے ہوں گے۔ لاری میں سب بیمار قیدی بھرے ہیں۔ سرکاری مہمان اور مہمان کی جان و مال کی حفاظت میزبان پر لازمی ہے۔ اسی لئے بیمار قیدی ہسپتال لائے گئے ہیں۔

میرے ارد گرد اچھا خاصہ مجمع ہے جو دیواروں سے لگا لمبی اور بے ڈھنگی قطار دکھائی دیتا ہے۔ میں بھی اس قطار میں کھڑا ہوں۔ مسکرا رہا ہوں۔ کیونکہ قطار کے تصور نے میرے ذہن میں اقبال کا ایک شعر اگل دیا ہے۔ ایک ہی......

میں مسکراتا ہوں۔ شعر لاجواب ہے۔ لیکن اقبال کے ذہن میں بارش سے بچنے والے وہ لوگ تھوڑے ہی ہوں گے۔ جو ایرانی ہوٹل کے سائبان تلے یوں بے ڈھنگی قطار لگائے ہوئے ہیں۔ وہ شعر تو صف کا لفظ استعمال کرتا ہے جو یا تو فوجی باندھتے ہیں یا پھر نمازی.....

میں اپنی دماغی آوارگی کا بہت بری طرح سے شکار ہوں جو خواہ مخواہ ہر چیز میں کچھ نہ کچھ ڈھونڈنے پر مجبور کرتی ہے۔ میں سر ہلا کر صفوں کی ترتیب تتر بتر کر دیتا ہوں اور اپنے آس پاس کے لوگوں پر نظر ڈالتا ہوں۔ میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب میں ایک ہوٹل کے مالک کو بھی اس بھیڑ میں دیکھ لیتا ہوں۔ اس کی مخصوص لنگی اور سفید قمیص یوں تو آج بھی اس کے جسم پر ہے۔ لیکن بیچارہ، گردشوں نے اسے محتاج بنا دیا۔ ایک چھتری کا پاس ہونا بھی شاید اس کے لئے ایک مسئلہ بن چکا ہے جس کو حل کرنے کے لئے وہ جتنے خانوں کے چکر لگایا کرتا ہے۔ جہاں چرس، گانجہ اور "یا علی توڑ دشمن کی نلی" کے نعروں کی گونج مل کر دھواں پھیلاتے ہیں۔

ایک کریم پتلون والا اپنی چھتری بند کر کے قطار میں شامل ہو گیا۔ میں نے اس کی پتلون کے بھیگے ہوئے پائنچے دیکھے۔ اس کی ریشمی قمیص بھی بائیں کندھے پر بھیگ چکی تھی۔ اس کے چہرے پر تاسف تھا۔ اس نے بڑی حسرت سے اپنی پتلون اور کندھے پر نظر ڈالی۔ پھر اس نے آسمان پر چھائے بادلوں کو دیکھا۔

"صبح سے برس رہا ہے" کسی نے کہا
"آج کام پر بھی نہ جا سکا۔"
"کیا آیا ـــــ؟"
"جو کے سے لوا ـــــ"

میرے ارد گرد آوازیں بھی تھیں۔ جن سے ایک گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ ہوا کے خنک جھونکوں میں، اتنی گرمی بڑا اطمینان بخش رہی ہیں۔ لیکن بیڑی کی دوکان کے نیچے بیٹھا ہوا ایک شخص شدت سے کانپ رہا ہے۔ اس کا لاغر جسم ننگا ہے جس پر اس نے ایک پرانا اور بھیگا ہوا سیاہ کمبل لپیٹ رکھا ہے جو کسی نے رحم کھا کر اس کو دیا ہو گا۔ یہ وہ کمبل تھا جس کو بارش پر دت سمجھ کر گھاٹی لوگ چھتری نہ ہونے کی صورت میں سر پر دہرا تہرا کر کے یوں ڈال لیتے ہیں کہ سر بھی بچا رہے چہرہ اور پیٹ بھی۔ اس بھکاری کے گرد بو تھی جو ناک میں خارش پیدا کر رہی تھی۔ اس نے پیشاب اور پاخانہ وہیں کر رکھا تھا۔ اس کے پاس کچھ پیاز کے چھلکے، پاپڑیاں اور کھانے بھی پڑے تھے۔ ایک آدھی ڈبل روٹی بھی تھی جو بھیگ کر پھول گئی تھی۔ لاغر فقیر تھرتھراتی نظروں سے اس روٹی کو دیکھ رہا تھا کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ یہ سوچ رہا ہے کہ آخر پانی انسان کو کیوں پھلا نہیں دیتا وہ اس کے جسم میں تھرتھری اور کپکپی کیوں پیدا کر دیتا ہے۔

"پسلیاں گن لو سالے کی" کسی نے کہا۔

میں نے جب اس بے درد کی طرف دیکھا تو وہ شخص رومال سے ناک پونچھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑے ہوئے ایک لمبے منحنی شخص نے فقیر کی طرف یوں بیدردی سے دیکھا جیسے اس ڈھانچے کی واقعی ہڈیاں گننے لگا ہے۔ پھر اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا "سالے مر کیوں نہیں جاتے جینے میں کیا مزہ ہے۔ بھوک، بیماری، بیکاری ــــــــــ" اس نے اپنے بڑے بڑے بالوں پر دونوں ہاتھ ایک ساتھ پھیرے۔ اس کی میلی قمیص اور میلی ازار، کافی حد تک بھیگ چکے تھے۔ اس نے یوں تو شیو کر رکھا تھا لیکن کان کے نیچے جبڑوں کی ابتدا میں کچھ بال ایسے رہ گئے تھے جن سے یہ اندازہ لگانا کہ اس نے عجلت میں خود ہی ڈاڑھی بنائی ہے بہت آسان تھا۔ اس نے اپنی بے باک نظریں بادلوں پر ڈالیں اور بولا۔

"بادل چھٹ رہے ہیں" اس کی آواز میں مسرت تھی۔

بارش دھیمی ہو گئی تھی۔ رکی نہیں تھی۔ اس لئے لوگ سائبان تلے سے نکلتے ہوئے شاید گھبرا رہے تھے۔ گرم پتلون اور ریشم کی قمیص والا بڑی دیر سے منہ بنائے کھڑا تھا کیونکہ اس کے پاس کھڑے ہوئے دو قلی نما انسان سیٹھ کی اوپننگ کلوزنگ پر باتیں کر رہے تھے۔ بارش کے دھیمے پن سے اس نے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس نے چھتری کھولی اور رحمت باراں میں شامل ہو گیا۔ وہ جا رہا تھا۔ میں اس کی سیاہ چھتری کو دیکھ رہا تھا جس کی تیلیاں قطروں کی دھار چھوڑ رہی تھیں۔ اس نے پائنچے اٹھا رکھے تھے۔ وہ بڑی ہوشیاری سے بچتا بچاتا جا رہا تھا۔ اپنے آپ کو گول مول کئے وہ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی گنہگار ہو۔

"کیوں بار بار اس بڈھے کا نام لیتا ہے"۔ ایک شخص نے کہا۔ اس نے منہ میں سگریٹ لگائی تھی۔ دیا سلائی کی ڈبیہ اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ ایک جملہ کہنے کے بعد رک گیا تھا۔

"دنیا کچھ بھی بولے، وہ تو مزے اڑا رہا ہے"۔ ایک حریص آدمی نے کہا۔

"ایسے مزے کی ....." اس نے ماں کی گالی دی۔ وہ کش لگا چکا تھا اس لئے دھواں اس کے منہ سے جملے کے ساتھ نکلتا رہا۔

"محنت کرو، اپنی طاقت سے پیدا کرو سالے مالدار عورت سے شادی کر لیتے ہیں"۔ اس نے بڑی نفرت اور بیزاری

سے سگریٹ کے کش لگائے۔ دوسرا آدمی خاموشی سے اپنی ٹوپی ہاتھوں میں گھما رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دبی دبی ہنسی تھی۔ جس کو وہ چھپانا چاہتا تھا اور جس کا اظہار بھی ضروری تھا تاکہ اپنے دوست کو بتلا سکے کہ "ان پیارے یہ بہت برا ہے۔ میرے دل میں ایسا کوئی خیال نہیں ہے لیکن اس کی یہی ہنسی اس کا بھی اظہار کر رہی تھی کہ تم بکتے ہو۔ محنت عیش و آرام نہیں دے سکتی محنت کوڑیوں کے مول بکتی ہے۔ محنت کی کوئی قدر نہیں"۔

میں اس شخص کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا جو ایسا تھکا ہارا مسافر تھا جس نے آرام کرنے کے لئے سرائے کا وہ کمرہ بھی قبول کر لیا ہے۔ جس میں دیہات سے لوٹی ہوئی بھیڑوں کی ٹولی بسیرا لے چکی تھی۔

بارش تھم گئی۔

لوگ ادھر ادھر کھسکنے لگے۔ مجھے اتنے سارے لوگوں کے تتر بتر ہونے پر افسوس بھی تھا۔ افسوس یوں کہ میں ان کی باتوں کی گرمی سے محروم ہو رہا تھا اور خوشی یوں کہ یہ سب اپنے اپنے کاموں کی تکمیل کے لئے جا رہے تھے اور مجھے بھی موقع مل رہا تھا کہ میں اکیلا رہ کر یہ سوچ سکوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

ہسپتال کے احاطے میں قیدی آ ارسے جا چکے تھے۔ وہ ٹک ٹک کر باہر کی دنیا دیکھ رہے تھے۔ عورتوں کو دیکھ رہے تھے بچوں کو دیکھ رہے تھے اور ایرانی ہوٹل کے شوکیس میں رکھے ہوئے طرح طرح کے کیک دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے اپنے ملنے جلنے والوں سے بیڑیاں اور سگریٹ پا لئے تھے۔ جبھی کافی قیدیوں کے پاس سگریٹ، بیڑیاں سلگی ہوئی تھیں۔ سپاہی مطمئن تھے۔ کیونکہ ان کو یہ اندیشہ نہیں تھا کہ یہ قیدی آرام دہ بارکیں، کھانا اور کپڑا چھوڑ کر ایک ایسی دنیا میں بھاگ جائیں گے جہاں لاغر فقیر پرانا کمبل لپیٹے آخری سانس لے رہا ہے۔

فقیر واقعی چند گھنٹوں کا مہمان تھا۔ نہ جانے کیوں وہ ہسپتال کی زرد دیواریں نہیں دیکھ رہا تھا۔ جہاں مریضوں کے لئے آرام دہ بستر ہیں۔ طاقت کی دوائیں ہیں، انجکشن ہیں اور پیاری پیاری نرسیں ہیں جو کبھی ماں بہن یا محبوبہ بن کر جلا بخش دیتی ہیں۔ شاید فقیر کی آنکھوں کی بصارت زائل ہو چکی تھی۔ اس لئے اس کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ اگر وہ دیکھ سکتا تو ضرور اس کا دل ہسپتال کی آرام دہ زندگی کو دیکھ کر جگمگا اٹھتا اور اس کے چہرے پر امید کی کرنیں پھیل جاتیں لیکن وہ ایک ایسا اندھا نظر آ رہا تھا جس کی آنکھوں میں روشنی بھی ہے لیکن وہ دیکھ نہیں پاتا ہم سب کی طرح جو دیکھتے ہیں سمجھتے ہیں۔ ہم سب بھی اندھے ہیں۔

میں کتنی دیر سے کھڑا ہوں لیکن میں نے اس طرف کوئی توجہ ہی نہیں کی کہ سفید سفید اجلے فراک والی نرسوں کی آمد و رفت بھی شروع ہو چکی ہے۔ میری نگاہوں کی بصارت جیسے لوٹ آئی۔ کیونکہ وہ نرسیں جو زندگی بخشتی ہیں میرے سامنے تھیں اور میں ان کے بالوں اور جسموں سے اٹھنے والی خوشبو سے محظوظ ہو رہا تھا۔ حالانکہ ہوٹل کے دروازے پر کھڑا ہوا ایک شخص منہ پر رومال رکھے لاغر فقیر کو ترس بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

مجھے اس کا انتظار ہے جس نے میرے تھکے ہوئے جسم کو راحت دی تھی جس نے میری نغمگی سے ناآشنا کانوں میں امرت ٹپکایا تھا اور جس نے میرے ٹھہرے ہونٹوں کو قوت گویائی دی تھی جس نے میرے ذہن کے انتشار کو سکون بخشا تھا۔ میری سلگتی ہوئی روح کو اپنے پیار کی خنکی دی تھی۔ لیکن اس کا انتظار کافی طوالت لے چکا تھا۔ جس نے ذہن کو اکتا دیا تھا۔ جس نے پیروں کو تھکا دیا تھا جیسے میں نے ہزاروں میل کا لمبا سفر پیدل طے کیا ہے۔

میں نے پیار سے اس فقیر کو دیکھا جو چند گھنٹوں بعد مر جائے گا۔ اس کا پوسٹ مارٹم ہوگا۔ میں نے پیار سے اس قیدی کو دیکھا جو بڑے بے ہودہ ڈھنگ سے ٹرام کی منتظر ایک عورت کو انگلی دکھا رہا تھا۔ ہم سب کو محبت کی ضرورت ہے۔ ہم سب بیمار ہیں۔

پھاٹک میں آنے جانے والوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ کھانستے ہوئے۔ لنگڑاتے ہوئے لوگ آ رہے تھے جا رہے تھے۔ پٹیاں پہنے، دواؤں کی بوتلیں سنبھالتے ہوئے عورت، مرد، بچے۔

اتنے میں دو آدمی اسٹریچر اٹھائے ہوئے آئے اور انھوں نے اس لاغر فقیر کو اس پر لٹا دیا اور اٹھا کر یوں چلے جیسے کرنا کوئی کرٹ لئے جا رہے ہیں۔ لاغر فقیر کا کمبل رہ گیا جس کو ایک کونے میں دبکا فقیر بڑے پیار سے دیکھ رہا ہے۔ بدبو اب بھی باقی ہے۔ گندگی اب بھی قائم ہے۔ لاغر فقیر نہ جانے غسل صحت پائے گا یا غسل میت۔ یہ سوائے ڈاکٹروں کے کون بتلا سکتا ہے وہ مر جائے۔ اس کی طبعی عمر چالیس پینتالیس سال ہی ہے۔ جی کر بھی وہ کیا کرے گا۔ وہی بھیک فاقہ ..... جاؤ دوست یہ ہسپتال بھی ایک دنیا ہے۔ جینے کی جدوجہد کرنے والے مریضوں کی دنیا۔ جاؤ اپنی زندگی کو تلاش کرو۔ اس احاطے میں گھری دنیا جس کے پھاٹک پہ قیدی بھی ہیں اور سپاہی بھی جو تمہیں نفرت سے دیکھ رہے ہیں۔

میری نفرت بھی ابھر آتی ہے۔ پاجی۔ دو کے کندھے پر جا رہا ہے۔ اسے چل کر جانا چاہئیے جیسے اور مریض جاتے ہیں۔ اسے اس وقت جانا چاہئیے تھا جب اس نے لاغری کا پہلا حملہ محسوس کیا تھا۔ اسی وقت سوچ لینا تھا کہ اسے زندہ رہنا ہے۔ ہر قیمت پہ ہر صورت میں۔ زندگی ایک خوبصورت نرس کی طرح اجلی اور بشاش ہوتی ہے۔ منحوس یہ جانے بغیر فٹ پاتھ پر پڑا رہا۔

میں بھی آہستہ آہستہ سڑک پہ آگیا۔ ٹرام مسافروں کو لئے ہوئے گذر گئی۔ برما شیل کی ایک رنگ برنگی لاری نے بھی بلی کی طرح راستہ کاٹا اور ایک گھوڑا گاڑی بھی چھینٹیں اڑاتی گذر گئی۔ میں نے سڑک پار کی۔

میں پھاٹک میں داخل ہو گیا۔

قیدیوں نے مجھے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں رشک تھا۔ سپاہیوں نے دیکھا۔ ان کی نظریں مجھے گھور رہی تھیں۔ مریضوں نے بھی دیکھا۔ وہ میری بیماری کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن میں ان سب کے لئے ایک معمہ تھا۔

مجھے جستجو تھی۔ میں نے انتظار چھوڑ دیا تھا۔ میں اس کو احاطے میں گھری دنیا میں تلاش کر رہا تھا۔ ایک اجلی اور بشاش نرس کی جستجو۔ جو مجھے زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔

اوراقِ پریشاں

آمنہ ابو الحسن

۱۸ جنوری ۱۹۵۴ء

صبح ہوئی اور مصروفیات نے گھیرا، ناشتہ کی تیاری، نوکروں کی نگرانی، بچوں کی چیخ پکار، اسکول جانے کا ہنگامہ ——— نو بجے سکون چھا گیا ——— جانے والے چلے گئے، صرف وہی بچ رہے جنھیں کہیں نہ جانا تھا ——— بچے کھیلنے کے لئے چلے گئے ——— میں نے کتابیں سنبھالیں ——— کتنا دلچسپ ہے یہ مشغلہ بھی کہ نہ وقت کٹنے کا پتہ چلتا ہے نہ تنہائی کا احساس ——— لگتا ہے ہم نہیں دنیا ہی ہماری مٹھی میں بند ہے ——— کامیڈی، ٹریجیڈی، ہنسی مذاق سنجیدگی سبھی کچھ تو مل جاتی ہے ——— "اے حمید" کے "سنہرے گلاب" نے زندگی کو پھر ایک پہیلی بنا دیا۔ ہونٹوں کے قہقہے غم اور فکر کے دھندلکے میں ڈوب کر رہ گئے۔ ذرہ ذرہ، بوٹا بوٹا، پتہ پتہ، جیسے ہنسنا بھول کر سوچنے لگا ——— وہ انجانی باتیں ——— وہ انوکھے طریقے، جو فکر کو گہرائی بخشتے اور نامعلوم طریقے پر احساس کو اجاگر کر کے کبھی مجروح کرتے، کبھی جینا سکھاتے ہیں ——— کتنی خاموش محبت، کیسی پیاری، کیسی اچھوتی، کتنی گہری ——— دل خواہ مخواہ اس محبت کیلئے مچلنے لگا جو بار بار جتائی نہ جائے بلکہ جس کا اظہار انسان کے اپنے عمل سے ہو ——— اس کے سلوک سے ہو، اس کی آنکھوں کی گہرائی سے ہو جیسے ——— جیسے پروفیسر کی محبت اور رضیہ کا رول ——— جی چاہا خود رضیہ بن جاؤں ——— مگر ——— پروفیسر کہاں؟ یہاں تو دن بدن خلوص و محبت ناپید ہوتے جا رہے ہیں پھر ایسی بلند، ایسی ارفع ہستی کہاں ملے جو پروفیسر کی جانشین بن سکے ———————— !؟

"ن" نے پھر پاگل پن شروع کر دیا ——— اس کی محبت میں وہ اضطراب نہیں جو خود کو بے کل کر دے، بلکہ ایسا اطمینان ہے جو سب کچھ پا لینے کے احساس سے ہوتا ہے ——— پگلا کہیں کا ——— مجھے سمجھنے کا دعویٰ کرتا ہے مگر یہی نہیں سمجھتا کہ میں کیا چاہتی ہوں ——— کاش ——— پروفیسر کی گہرائی اس میں پیدا ہو جائے تاکہ ایک لمحے کو رضیہ بننے کا احساس مجھے بھی ہو جائے ——— یہ ایک لمحہ میرے لئے بڑا قیمتی ہوگا ——— زندگی بھر سے زیادہ قیمتی ——— دن ڈھل چکا ——— رات آ رہی ہے ——— !!

رات کچھ اس طرح دبے پاؤں میرے دروازے پر آ کھڑی ہوئی کہ خواہ مخواہ محسوس ہونے لگا جیسے رات کائنات کے لئے نہیں صرف میرے ہی گھر آئی ہے ——— تنہائی، اداسی بے کلی ——— چاند گہنا کے کمبخت اور نکھر گیا ——— نور کا دریا سا بہہ رہا ہے، مگر مجھے کیا۔ میرا احساس تو بڑا مجروح ہے ——— انتشار، الجھن، پریشانی ——— سکون کا میلوں پتہ نہیں ——— !

بچوں کو کھلا پلا کر سلا چکی تو وقت کچھ گذرتا محسوس ہوا ——— "ن" نے وقت گذاری کے لئے رات کی دعوت بھی دے دی ——— "کہیں باہر چلیں نا ——— باہر ——— مگر باہر کیا رکھا ہے ——— !؟ چاند تو میرے سر پہ ہے ——— اب کس طرح "ن" کو سمجھاؤں کہ میرے پیچھے حیران نہ ہو ——— کانچ کا اعتبار ہی کیا ——— گرفت رہی تو سلامت، گرفت چھوٹی تو ریزہ ریزہ ——— میں نے فیصلہ کر لیا آج کہیں نہ جاؤں گی۔ تو پھر وقت کیسے گذرے ؟! لاؤ کچھ پڑھ ہی لوں ——— میں نے ورق گردانی شروع کی ——— مگر "زرد گلاب" کے بعد کچھ اچھا نہ لگا ——— اچھے اچھے شہ پارے بھی متاثر نہ کر سکے ——— میں نے گلاب کی کلی نکالی ——— گلابی گلاب ——— گلابی کلی ——— ادھ کھلا پھول جو "ن" نے آج ہی بھیجا ہے ——— کتنا نازک، اور پیارا تحفہ ہے ——— مگر جو کھلنے سے پہلے ہی توڑ لیا جائے اس میں مکمل ہونے کا احساس کہاں ——— کلی پھول نہیں ——— میں میں نہیں ——— ! "یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید ہے" :

۱۸ جنوری سنہ ۱۹۵۷ء

صبح سات بجے اٹھی ــــ اناج آچکا تھا ــــ تلواتے تلواتے ہی دس بج گئے ــــ چائے کی ایک پیالی نے دس بجے تک سنبھال رکھا ــــ جب اباجی دفتر اور بچے اسکول چلے گئے تو میں نے ناشتہ کیا ــــ دنوں بعد "ص" کا خط آیا ــــ "ص" بھی عجیب ہستی ہے جو کبھی دور کبھی نزدیک ــــ اس سرگوشی کی طرح جو کبھی دبا ہو کبھی ابھرتا ــــ اچھا دوست ہے ــــ!

میں بھی عجیب ہوں ــــ اس صدائے بازگشت کی طرح جس کا ڈوبنا ابھرنا صرف ایک ہی آدمی سن سکے ــــ! کاش وہ جہاں کے لئے ہوتی ــــ سب جہاں کے کام آتی ــــ زندگی پر سے ایقان کبھی کبھی نہ جانے کیوں اٹھ جاتا ہے ــــ پھر لاکھ کوشش کے باوجود نہیں آتا۔ ایسے موقع پر چھوٹی بڑی چیز نئی بن جاتی ہے، ہر جانا پہچانا آدمی اجنبی لگتا ہے ــــ جیسے دنیا میں تنہا آئی، تنہا چلی جاؤں گی ــــ دنیا میری نہیں ــــ کوئی میرا نہیں ــــ میں کسی کی نہیں ــــ ایک طویل راستہ، ایک ایسی راہگذار ہے جس پر سے بس یوں ہی گزر رہی ہوں ــــ جب یہ راستہ ختم ہو جائیگا قدم خود بخود رک جائیں گے ــــ قدم جہاں رکیں گے وہی منزل ہوگی یا نہیں ــــ یہ نہیں جانتی ــــ کون کہہ سکتا ہے کہ وہی منزل ہے ــــ؟! ہو سکتا ہے وہاں سے ایک نیا راستہ آگے بڑھ جائے ــــ کاش راستے بھی اتنے مٹ جانے والے ہوتے کہ جب چاہتے مٹ جاتے، جب چاہتے بن جاتے مگر یہ راستے ــــ یہ پگڈنڈیاں ــــ جن پر قدم رکھتے ہوئے زندگی گذرتی ہے، بنتے ان مٹ ہوتے ہیں ــــ صدیوں کے نقوش کہیں راہیں بناتے ہیں پھر انھیں مٹانے کے لئے بھی صدیاں ہی چاہیئے ــــ اور میں چلی جا رہی ہوں منزل متعین کئے بغیر ــــ کچھ پانے کی ہوس نہ کچھ کھونے کا خوف ــــ جیسے اس دنیا سے مجھے مطلب ہی نہیں ــــ یوں ہی آئی تھی یوں ہی چلی جاؤں گی ــــ بہاروں کے پھول سمیٹے ــــ خزاؤں کے خس و خاشاک کے لئے ــــ ایک نشیمن بناتی ــــ ایک نشیمن اجاڑتی ــــ!!

"س" نے مدد کیا مانگی مجھے اپنی نااہلی کا اور بھی شدید احساس ہو گیا ــــ کاش اپنی زندگی کی مالک ہوتی ــــ خود مختار ہوتی ــــ پھر اسے مدد دینا کتنا آسان ہوتا ــــ اور اسے مسرور دیکھنا کتنا دل خوش کن ــــ؟ چند یادوں کی طرح، چند ساتھی بھی بڑے محبوب ہوتے ہیں۔ یہ طے کرنا ہی مشکل ہوتا ہے کہ ان چند ہستیوں میں سب سے محبوب ہستی کون ہے ــــ!!

پھول سب اپنی نوعیت کے اچھے ہوتے ہیں ــــ کوئی خوش رنگ، کوئی خوشبو دار اور کوئی بغیر خوشبو اور رنگ کے لطیف، کوئی سورج کی زرنگار کرنوں پر کھلنے والا، کوئی چاند کی نرم کرنوں پر پھولنے والا، کوئی صبح کا ستارہ، کوئی شب کا پجاری ــــ عشق پیچاں، بید مجنوں، نرگس بیمار ــــ اور وہ چھوئی موئی ــــ نازک نازک، کول کول ــــ اچھوتی سی ــــ میرے احساس کی طرح ــــ پل میں جاگتی، پل سوتی، پل میں بولتی، پل میں خاموش ہو جاتی ــــ کتنا دل چاہتا ہے کسی ایک کو منتخب کر لوں ــــ مگر پھر یہی دل پلٹ جاتا ہے ــــ ایک سے دل نہیں بہلتا ــــ جی چاہتا ہے جس طرف پلٹوں، ادھر رنگوں اور خوشبوؤں کا طوفان ہو ــــ اپنے رنگ میں نہائے، اپنی خصوصیت میں ڈوبے، قدم سے قدم ملائے سب ساتھ رہیں ہنستے، بولتے مسرور ــــ مگر ــــ اف یہ دنیا ــــ؟! نیکی کیا ہے؟ ایک کو دیوتا قرار دیکر سب کو مسترد کر دینا ــــ اسی لئے تو نہیں بڑھاتی قدم ــــ نہ اتنی مستقل مزاج ہوں نہ اتنی سنگدل، نہ اتنی سخت جاں ــــ کسی کا سکنا نہ سن سکتی ہوں نہ دیکھ سکتی ہوں ــــ بس تو پھر یہی اچھا ہے کہ سب کے ساتھ رہوں ــــ سب سے ہنسوں بولوں اور جب مر جاؤں تو یہ غم نہ رہے کہ کسی کو میں نے دکھ دیا، کسی کے بڑھتے ہاتھ روک دئیے، کسی کی زندگی اجاڑ کر رکھ دی ــــ وہ چمن بننا چاہتی ہوں جہاں بھانت بھانت کے پھول کھلیں، جہاں دور دور سے لوگ آئیں، جہاں سب کی نظریں سکون حاصل کریں، کوئی تشنہ نہ رہے، کوئی مرجھانے نہ پائے، کوئی لوٹ نہ جائے ــــ سب سیراب ہوں اور میں سب کے لئے زندہ رہوں ــــ!!!

جب سے "ب" دواخانہ گئی ہیں اور اکیلی ہو گئی ہوں ــــ "ع" اور بچوں کے اسکول چلے جانے کے بعد تو یہ تنہائی اور شدید ہو جاتی ہے ــــ بھائی سب الگ غائب ــــ اباجی دفتر میں ــــ میں ہی میں گھر میں ہوتی ہوں ــــ دل کتنا اکتاتا ہوگا ــــ کاش کوئی

سوچ سکتا ——؟ مگر جب لوگ بہت جمع ہو جائیں تب بھی تو کچھ اچھا نہیں لگتا —— تب سکون کی خواہش اسقدر بڑھ کیوں جاتی ہے ——؟ طبیعت کی اسی دورنگی سے تو عاجز ہوں —— نہ یوں چین نہ دیسے قرار —— نہ جانے چین ہے کہاں —— جو کسی صورت ملتا ہی نہیں ——؟! دو روز سے "ع" بھائی بھی نہیں آئے —— نہ آئیں —— مجبور بھی تو نہیں کرسکتی —— معروف آدمی ہیں —— جب فرصت ہوگی ضرور آئیں گے —— کاش انھیں فرصت جلد مل جائے ——!!

"ن" کا خط کوئی دم میں آتا ہی ہوگا —— کتنا اصرار ہے اس کا اداس نہ رہا کروں —— ہنسوں، ہنساؤں، مسرور رہوں، روز تفریح کروں اور نمائش آیا کروں —— دیوانہ لڑکا —— وارفتگی کی حدوں کو پار کر کے جنون کی حدود کو چھو رہا ہے —— کتنی بار کہا اس سے مجھے بھول جائے، میرے پیچھے حیران نہ ہو —— جسے اپنے آپ پر خود بھروسہ نہیں وہ دوسروں کے لئے قابل اعتماد کیسے ہو سکتی ہے ——؟ مگر اسے تو جیسے جنون ہے میرا —— نہ جانے یہ جنون اسے کہاں لے جائے ؟! اس کا یقین بھی عجیب ہے! "تم اپنے آپ پر اعتماد کرو یا نہ کرو، مجھے تم پر، اپنے آپ سے، دنیا بھر سے زیادہ اعتماد ہے" —— واہ رے اعتماد!! اگر واقعی کوئی چیز ہے تو منزل یقیناً آہی جائے گی —— اب میں کہاں تک سر پھوڑوں —— اس کا تڑپنا، اس کا اداس ہونا دیکھ نہیں سکتی تو کہہ دیتی ہوں —— "جاؤ خوش رہو تمہاری خاطر جئے جا رہی ہوں" —— مگر کون جانے کس خاطر جی رہی ہوں —— کس کو فریب دے رہی ہوں —— اپنے آپ کو یا اس غریب کو. ——؟!!!

دو بج رہے ہیں مگر اس وقت تک کچھ پڑھنے کی فرصت نہیں ملی —— کل تو جیسے سانا ختم کرنے پر تل گئی تھی اور آج —— آج وقت نے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ رسالے کو چھو سکتی —— "ص" کا جواب بھی ادھورا ہے کوشش کر کے شام میں پورا کر دوں گی —— آج دواخانہ تو جانا نہیں ہے۔ بجلی کا چولہا "ف" کے ہاتھ "ب" منگوا دوں گی اور اسی کے ساتھ اپنی مخلص آرزوئیں بھی —— شام کا انتظار ہے —— خدا کرے اچھی گزرے ——!!

"ن" کا خط آگیا —— آج اس نے سکون نہیں دیا —— اس احساس کے باوجود کہ قلم میرے ہی لئے اٹھایا گیا یہ احساس بھی ہوتا رہا کہ قلم مجبور رہا ہے اپنے مالک کے ہاتھوں —— ورنہ حروف اس قدر عجلت میں نہ لکھے جاتے اور سیاہی یوں پھیلی نہ ہوتی کہ تحریر پڑھی نہ جاسکے —— وہی نمائش کا اصرار —— "تم آؤ —— آتشبازی کا خاص مظاہرہ ہے —— میں کلب کے پاس منتظر رہوں گا" —— ستم اس نے یہ کیا کہ خط کے ساتھ سینٹ بھی بھیج دیا —— اف کتنی محبوب خوشبو —— کتنی بھینی، کتنی میٹھی، کتنی یادوں کے رس میں رچی ہوئی، نیند میری پلکوں پر تیرنے لگی، اس مدھم، میٹھی، جاں نواز بو کے ساتھ ہی ماضی کے دھندلکوں سے بچھڑی ہوئی محبوب ہستیوں نے سر اٹھانا شروع کیا جیسے یہ بو —— بو نہیں تھی —— بچھڑے ہوؤں کا ملاپ تھا، ان کی قربت تھی، ان کی سانس کی مدھم آنچ تھی جس نے ہستی —— کے منجدھار میں ایک بار پھر دلیا سنسنی پیدا کر دی —— اف کتنی محبوب تھی یہ خوشبو بھی —— ہر محبوب سے زیادہ محبوب —— ہر یاد سے زیادہ دل کش —— ہر اقرار سے زیادہ پائدار —— میں نے شیشی قریب رکھ لی —— نیند نے مجھے پہلو میں جگہ دے دی —— "ن" کا شکریہ تو ادا کرنا ہی تھا میں نے سوچا یہ بھی لکھ دوں گی کہ تم بہلے رہو —— بہلنے ہی میں آرام ملتا ہے اور یہ بھی کہ تمہارے قلم نے تم سے غداری کی اور میری ڈائری کے اوراق مکمل ہوتے جا رہے ہیں —— وہ بے وفا نہیں —— مورکھ ضرور ہے ——!!!

۱۰ر جنوری ۱۹۵۴ء

"ممی اٹھو نا" —— نسرین نے اپنے چھوٹے ہاتھوں سے میرے گال تھپتھپائے اور نیند پریشان ہو کر بھاگ گئی —— غصہ مجھے ایکدم سے آگیا۔ اف یہ بچے!! سونے بھی نہیں دیتے چین سے —— مگر پھول ایسے چہرے پر اس کی کالی آنکھیں چمک رہی تھیں —— جیسے جاننا چاہتی ہوں کہ میں واقعی میں ہوں یا ......؟! "تم جاؤ باہر آجاؤں گی" —— میں نے پھر دلائی اٹھا دیا —— "اوں —— ہوں ——

تمہارے ساتھ ـــ اس نے اصرار کیا ـــ " اچھا بھئی اچھا چلتی ہوں ابھی ـــ تب تک چائے تم بھی لیتو" ـــ مجھے اٹھتا دیکھ کر وہ پھر لحاف میں دبک گئی ـــ نسرین میری ننھی بھانجی ـــ گڑیا ایسی ـــ پیاری، پیاری ـــ طلوع ہوتی صبح کی طرح معصوم اور حسین ـــ صبح کے پھولوں کی طرح مصروف گذری ـــ تین ماہ بعد بھائی جان آئے تھے "ان سے خوب خوب باتیں ہوئیں ـــ بیتے دنوں کی باتیں ـــ مستقبل قریب کی باتیں ـــ بھابی کی، بچوں کی، سنہرے سپنوں کی باتیں ـــ زراعت کی الجھنوں کی، نفع نقصان کی باتیں ـــ ساڑھے گیارہ بجے جب وہ دوستوں سے ملنے چلے گئے ـــ میں نے پہلو بدلا ـــ شیلف سے کتابوں نے پکارا ـــ لال قلم نے زبان نکالی ـــ " ش" کا ادھورا خط یاد آیا۔ میں جواب لکھنے بیٹھ گئی مگر عجیب تشنگی سی محسوس ہوتی رہی ـــ جیسے یا تو قلم رک رہا تھا یا الفاظ نہ مل رہے تھے یا اظہار مطلب غلط تھا۔ طبیعت جھنجھلا گئی ـــ میں تو ایسا جواب لکھنا چاہتی تھی جو نرم پھوار کی طرح اس کے احساسات پر برسے اور وہ بھول جائے کہ میں نے اسے صدمہ نہیں دی، اسے خراش کر دیا ـــ!!

لائٹر کے کھٹکے نے ـــ ہاتھ کی جنبش نے شعلہ بنا دیا ـــ انگلیوں کے درمیان ندرین، روشنی کانپتی رہی ـــ "کیپسٹن" میرے ہونٹوں میں جلتا رہا ـــ متعدد سگریٹیں پینے کے بعد کچھ موڈ آیا ـــ ساور کی ابلتی چائے نے خیالات میں روانی دوڑا دی ـــ قلم چل نکلا۔ مگر خط ختم ہوا تو پھر یہ احساس شروع کہ خط لکھا ہی نہیں گیا۔ زچ ہو کر میں نے لکھ دیا۔

"میرے دکھ کی دوا کرے کوئی ......!

آج کی ڈاک بھرپور تھی۔ میں جتنی خالی الذہن تھی خطوط اتنے ہی بھرپور ـــ ایک ایک کرکے سب پڑھ گئی ـــ زیادہ خطوط مختلف رسائل کے ایڈیٹروں کے تھے ـــ یہ ایڈیٹر بھی بس کمال کے آدمی ہوتے ہیں ـــ بھلا ان کا بس چلے تو قلم ہی مجھ سے چھین لیں۔ ـــ ہر ایک کی فرمائش " اپنی تازہ تخلیق سے جلد از جلد نواز دیجئے"۔ ایک بار تو چڑھ کر جی میں آئی سب کو ایک سا جواب لکھ بھیجوں " ناچیز کی تازہ "تخلیقات" یہاں نہیں "...... " کے پاس ملتی ہیں، خواہش مند حضرات بہ نفس نفیس لے جائیں" ـــ کیونکہ ان دنوں ساری تخلیقات باسی ہو چکی تھیں اور قلم کی ساری توانائیاں "...... " کو خطوط لکھتے ختم ہو رہی تھیں ـــ

"ش" کا خط بڑا دردناک تھا جیسے کسی نے زخم کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا اور درد کی لہریں خون بن کر جسم میں پھیلتی گئیں ـــ احساس ٹوٹ کر رہ گیا جیسے کوئی پیچدار کمانی جھٹ سے کھل گئی ہو ـــ اب اس کی زندگی اجڑ گئی تو اس میں میرا کیا دوش ـــ ویسے ایک شاعر کی زندگی ـــ زندگی ہی کب ہوتی ہے ـ وہ تو از سرتاپا ـــ ازل سے ابد تک ایک نامکمل مصرعہ ہی ہوتی ہے۔ جس کی تکمیل میں شاعر عمر بھر سرگرداں رہتا ہے ـــ مگر پھر یہ سرگرانی کیوں؟ احساس کا بوجھل پن کیوں؟؟ جیسے گناہ کے بعد گناہ سے بھاگنے والا آدمی ضمیر کے ہاتھوں اور زیادہ گنہگار بن جائے ـــ مگر یہ گناہ ہے کیا چیز ـــ؟ مجھے "شاہراہ" کا ایک لطیفہ سا یاد آیا اور دل بیقرار چاہا فراق کی فراست پہ قربان جاؤں ـــ دل ہلکا ہو گیا ـــ بڑی دلچسپی اور سلیقے سے میں نے اسے خط لکھا ۔

" اپنا راستہ آپ بناؤ ـــ جنگل میں چلتے ہوئے تھک کر اونچی چٹانوں، گھنے درختوں کا سایہ ضرور لو ـــ میٹھے چشموں کا پانی ضرور پیو ـــ مگر ان میں ڈوب کر نہ رہ جاؤ ـــ اپنی کشتی کا سوراخ تم خود بند کرو ـــ دنیا غرض مند ہے دوسرا کوئی تمہاری مدد نہیں کرے گا ـــ نہ بہن، نہ بھائی، نہ محبوب!!! میرے قدموں کے نقوش مٹا دو اگر وہ تمہیں بھٹکاتے ہیں ـــ نظر آگے اٹھاؤ ـــ آنے والا کل ہے زیادہ سبک خرام ہو ـــ!!"

خط لکھ کر بڑے سکون کا احساس ہوا جیسے کوئی بھاری بوجھ سر سے اتر گیا ہو ـــ تین بج رہے تھے ـــ بھائی جان اب تک نہ آئے تھے ـــ ہوں ـــ کسی دوست نے پکڑ لیا ہوگا ـــ بڑے وہ ہیں بھائی جان بھی ـــ ایک تو اتنے دن بعد آئے اور پھر آئے بھی تو مسلسل غیر حاضر ـــ اب آکر صاف کہہ دیں گے " میں کیا کروں اتو! منصور نے پکڑ لیا، ذاکر چھوڑتا

ہی نہ تھا' اور رشید تو ایک لمحہ کی جدائی کے خیال ہی سے بے ہوش ہو ہو جا رہا تھا ــــ ہوں ــــ اور یہ فکر بھا نہیں جناب کو کہ چھوٹی بہن بغیر کھائے گھر میں اکیلی راہ دیکھ رہی ہو گی ــــ کتنے چاؤ سے اس نے مختلف ڈشیں بنائی ہوں گی۔ نمک مرچ تو کم ہی' محبت زیادہ ڈال کر ــــ اور یہ بھائی جان ــــ عجیب ہیں ــــ؟! میرے ہی بھائی ایسے ہیں یا سب کے ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا ــــ دل نے کہا پگلی ــــ بھائی تو سب کے ایسے ہی ہوتے نہیں ــــ لا یہ واہ' نٹ کھٹ!! ہٹاؤ بھی اب کون کرتا ہے ان کا انتظار ــــ!! اب تو بھو کے بھی آئیں تو کھانا نہ کھاؤں ــــ یہ سوچ میں نے یہ قصہ بھی ختم کیا ــــ کھانے کے بعد سونے کی بہت کوشش کی ــــ مگر نیند روٹھ گئی ــــ نہیں آؤں گی ــــ اس نے انکار کر دیا۔ کمبخت تو نے ساتھ دیا ہی کیا ہے ــــ نہ آ ــــ میں سدا گوار تھوڑے ہی ہوں ــــ میں نے پلنگ چھوڑ دیا اور "ن" کی یاد میں بہت سارے محل بنائے ــــ محل!! ــــ سونے چاندی کے تھے نہیں ــــ ہیرے جواہرات کے نہیں ــــ امنگوں اور آرزوؤں کے محل' جن کے خاموش جھروکوں سے آشائیں جھانک رہی تھیں۔ ــــ جن کے منقش دروازوں پر امیدیں استقبال کو کھڑی تھیں ــــ جن کے بالا خانوں پر خوش آمدید کہتی آزادیاں رقص کناں تھیں اور جن کے اونچے سنہری میناروں پر اڑتی فاختائیں چونچ میں زیتون کی ٹہنیاں لئے "امن" کا گیت سنا رہی تھیں ــــ!! سہ پہر ساری ان ہی سپنوں میں بیتی ــــ یہ جاگتے سپنے' خوابیدہ سپنوں سے کس قدر مختلف تھے ــــــــ؟!!!

پانچ بجے بھائی جان آگئے ــــ "امو"! ــــ انھوں نے باہر ہی سے آواز دی۔ میں نے جھٹ آنکھیں موند رضائی سر پر کھینچ لی۔ اور دل میں سوچ لیا۔ وہ چاہے لاکھ منائیں ہرگز ہرگز نہ مانوں گی ــــ!

"ارے! سو گئیں ــــ؟ ابھی تو جاگ رہی تھیں میں نے خود کھڑکی میں سے تمہیں بیٹھے دیکھا تھا ــــ!!"

یا اللہ ــــ یہ تو تانک جھانک میں بھی ماہر ہو گئے ــــ میں نے سوچا' مگر حرکت نہ کی ــــ!

"بھئی اٹھو نا" ــــ انھوں نے شاید عاجز آکر کہا ــــ!

آج تو پیر چھونا پڑے گا جناب ــــ بڑے بن گئے تو کیا ہوا ــــ میں نے دل میں کہا ــــ!

"اچھا تو نہ اٹھو ــــ اب کون اس بوجھ کو سنبھالتا پھرے ــــ نسرین' پروین' ظفر' آؤ بھئی سب" انھوں نے آواز دی۔

لحاف دور پھینک کر میں اٹھ کھڑی ہوئی ــــ!

"ارے آپ تو سو رہی تھیں ــــ؟" انھوں نے ہنسی روک کر کہا۔

"لائیے ــــ لائیے ــــ!" میں نے سنجیدہ بنتے ہوئے کہا ــــ

"مگر آپ تو صاحب سو ہی جائیے ــــ آپ کہیں تو میں لحاف بھی اڑھا دوں ــــ؟!"

"اللہ بھائی جان" ــــ!! میں بیزار ہو گئی ــــ کہاں تو جناب سے پیر پڑوانے کا خیال اور کہاں اب یہ نوبت خود پڑنے والی تھی ــــ "چاکلیٹ کیک" ان کے ہاتھ میں تھا ــــ شکر کے موتیوں اور کریم کے پھولوں سے سجا سجایا ــــ میرا مرغوب کیک ــــ وہ جانتے تھے اس ایک کیک کے بدلہ وہ میری ہر خفگی کو خرید سکتے ہیں ــــ!!

"نہ دیجئے' ہم کب مانگتے ہیں؟" دل کڑا کر کے میں بے نیاز ہو گئی۔

"ارے کہاں چلیں ــــ؟" انھوں نے پلٹ کر حسب عادت کندھوں سے مجھے پکڑا اور قہقہوں کے درمیان ہماری صلح ہو گئی۔ چائے پی کر جب وہ پھر جلد نیچے میں اوپر چلی آئی ــــ ڈوبتا ہوا نارنجی سورج تاڑ کے پتوں میں اوجھل ہو رہا تھا' شام کی سرمئی سیاہیاں آسمان کے دریچوں سے جھانک رہی تھیں اور زمیں ــــ کہیں گلنار' کہیں سرمئی' عجیب سی لگ رہی تھی ــــ مشرقی رومان مشرقی حسن کا ایک ثبوت میرے سامنے تھا ــــ تاڑ کے پیچھے چھپتا سورج ــــ سورج تو لگتا ہی نہ تھا ــــ یہ محسوس ہوتا تھا جیسے دنیا انوکھے

واقعات پر حیران کوئی خوبصورت کنواری چہرے کو انگلیوں میں چھپائے، شرمگیں نگاہوں سے انگلیوں کے جھروکوں سے جھانک رہا ہے احساس کے چہرے کی گلنار رنگت انگلیوں سے چھن چھن کر دنیا پر برس رہا ہے ——— !!!

گودام کا کام بند ہو چکا تھا ——— دن بھر اناج کی وزنی بوریاں اٹھانے والے حمال اب کام ختم کر کے قطاروں میں چلے جا رہے تھے۔ ہندستان کے سپوت ——— ہندستان کی خاص پیداوار ——— آہن پیکر، فولادی بدن ——— رنگین رومالوں کو کمر کے گرد کسے، میلی ٹوپیوں اور کنٹوپوں کو سر پہ جمائے، بیڑی منہ میں دبائے ——— ہنستے بولتے، قہقہے لگاتے، مذاق کرتے، بے فکر، مطمئن ——— جیسے دن بھر انھوں نے بوجھ نہیں ڈھویا ——— ہنسیوں اور لاابالیوں کے خزانے ڈھو رہے ہیں ——— ان کے سیاہ میلے سینوں میں ان کے شفاف چمکیلے دل کھلکھلاتے رہے اور انسپکٹر گودام نے دروازہ بند کر کے بڑے تالے میں چابی گھما دی ——— ایک داڑھی والے صاحب جو کام کے دوران میں دن بھر اکڑوں بیٹھے گپیں ہانکتے رہے تھے اس وقت دونوں ہاتھ ملائے کسی راہگیر کو "نمستے" کر رہے تھے ——— "نمستے" ——— جس پر ہلی ہلی کر داڑھی ان کا مذاق اڑا رہی تھی ——— انسپکٹر نے بھاری بوٹوں کو حرکت دی ——— چوکیدار خمیدہ ہو گیا ——— شام کے ساتھ ہی فضا پر ایک بار پھر سکون چھا گیا ——— البتہ دور سڑک پر جاتے ہوئے حمالوں کی سیاہ پیٹھیں اب بھی چمکتی رہیں جن پر بوریوں کے وزن نے عجیب ملگجے نشان بنا دیئے تھے ——— جیسے کھال چھل گئی ہو ——— !!

سورج یکایک ڈوب گیا ——— اندھیرا ہر طرف سے امنڈ آیا ——— حمالوں کے محنت کشوں کے چہروں میں بشاش، چمکیلا، اندھیرا نہیں بلکہ سوتا ہوا اندھیرا جو صرف رات کا اندھیرا ہو سکتا ہے ——— !!!

سینے میں ہزاروں جذبات لئے میں نیچے اتر آئی ——— ارے مگر یہ کیا ——— ؟! کسی نے لائٹ کیوں نہیں جلائی ——— ؟؟! سارا گھر اندھیرا کیوں پڑا ہے ؟!! میں نے بجلی جلائی مگر روشنی پھر بھی نہ آئی ——— دور آسمان پر ایک ستارہ جھلملا کر میری اس ناکام کوشش پر ہنستا رہا ——— !!

کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول
کیا ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

۱۳ر جنوری ۱۹۵۷ء

صبح بھی مصروف اور دوپہر بھی ——— کام! کام!! کام!!! ——— میں تھی اور کام ——— جیسے ہم دونوں ازل کے ساتھ ہوں ——— ؟ مدرسے کو کھانا بھجوا کر جب اوپر آئی گھڑی کی سوئیاں ایک بجا رہی تھیں ——— صبح کا سبک خرام سورج، تپتی "شعاعوں" کے انعکاس میں مصروف تھا ——— بھائی جان جا چکے تھے ——— صرف ایک دن کی یادیں دامن سے ابھی بار بار بہلا رہی تھیں ——— شیلف پر رکھی ٹائم پیس ٹِک ٹِک چلا رہی تھی ——— "کیوپڈ" کا ننھا اسٹیچو بدھا کے قدموں میں سرنگوں تھا جیسے بدھا کے سامنے اس کے سارے ترکش بے کار ہو چکے تھے ——— جی چاہا کمند سے آخری تیر بھی نکال لوں تاکہ "عشق" پر کبھی مغرور ہو ہی نہ سکے۔ اندھا کیوپڈ آنکھیں کھول کر اپنا ہار دیکھے اور مسکرا کر پھر بدھا کے آگے خمیدہ ہو جائے ——— !!!

صدیوں سے وراثت میں آتی خوبصورتی دن بدن اس قدر مسخ ہوتی جا رہی تھی کہ عشق مہمل سی چیز بن کر رہ گیا تھا، جسے دیکھو عشق کا پتلا، جسے دیکھو حسن کا پجاری ——— جیسے کائنات کائنات نہ رہی تھی حسن اور عشق کا ایک دلچسپ لطیفہ بن گئی تھی جس میں ہر روز ایک تازہ واردات عشق کے ہاتھوں سرزد ہوتی اور ہر رات ایک پردہ، نئی واردات کے لئے پرانے واقعات پر گر جاتا ——— مگر دراصل نہ جہاں میں عشق رہا تھا نہ حسن، صرف دھوکا ہی رہ گئی تھی ——— جنگ کے بعد جنگ کا خطرہ تھا ——— موت کے بعد ایک اور موت تھی ——— دنیا حیران تھی ——— پریشانیاں سرچند تھیں اور میں ——— میں سوچ رہی تھی بیدم کی اس غزل کو سراہوں یا سہگل کی اس آواز کو جو نغمہ بکھیر رہی تھی ———

"غم رده پیکاں ہوا جاتا ہے   دل کا ارمان ہوا جاتا ہے"

"د" کا خط آیا ۔۔ اداسیوں میں ڈوبا ہوا ۔۔۔ پگلا کہیں کا ۔۔۔ تحفہ بھیج کر بھی خوش نہیں ۔۔۔؟ لکھتا ہے "شیشی پھوڑ دو اگر تیلیاں [illegible] بہ [illegible] ہیں" ۔۔۔ اب اسے کون بتائے کہ میرے ماضی میں صرف دہکتے الاؤ ہی نہیں، مہکتے پھول بھی نہیں ۔۔۔ اجڑے گلستانوں [illegible] کو کملایا ہے [illegible] ان میں نے صرف مسکرانا ہی نہیں ہوا، خونِ جگر بھی ٹپکایا ہے ۔۔۔ میں نے اسے تسلیاں دیں ۔۔۔ اسے آس [illegible] اسے سمجھایا کہ خوش رہے ۔۔۔!!

سہ پہر [illegible] اداس آئی ۔۔۔ دبائی ہوئی قنوطیت پسندی پھر عود کر آئی ۔۔۔ زندگی کے سارے تلخ تجربے زہر کے کڑوے گھونٹوں کی طرح لبوں کو زہر آلود کرتے گئے ۔۔۔ دل کچھ اس انداز سے گھبرایا کہ اپنی ہستی، ساری دنیا ہیچ معلوم ہونے لگی ۔۔۔ ایک کڑی بھی ایسی [illegible] جو زندگی کا رشتہ پچھلی خوشیوں سے جوڑ سکتی ۔۔۔ زندگی کا سارا حسن، چھوٹی چھوٹی باتوں پہ جھنے جانے کے بڑے بڑے حوصلے، وہ امنگ، وہ [illegible]، نہ معلوم کہاں کھو گئی ۔۔۔ کہاں سو گئی، کہاں چھوٹ گئی کہ بار بار ڈھونڈنے پر بھی نہ ملی ۔۔۔ کوئی نہیں جان سکتا جب دل میں زندگی کی خواہش نہ ہو، زندگی سے وابستہ کوئی ارمان نہ ہو، کسی حصول کی تمنا نہ ہو، کسی فراق کی تڑپ نہ ہو تو دل کیا کچھ کرنے کو چاہتا ہے ۔۔۔ دروازہ بند کئے ہو چپ لیٹ رہی ۔۔۔ زندگی کے دلولوں سے ناآشنا، قدموں کی چاپ سے بے بہرہ، نہ کسی کا انتظار تھا نہ کسی کے جانے کا غم [illegible] ۔۔۔ ایک ہولناک سناٹا، ایک بے جان ویرانی، ایک سوگوار سکوت، جیسے کوئی سرشار شرابی صبوحی کے آخری گھونٹ کو پی کر دن بھر کے لئے فارغ ہو چکا ہو!

شام بہنوں کے اصرار پہ باہر نکلی ۔۔۔ باہر کی دنیا اتنی ہی روشن، اتنی ہی معمور، اتنی مسرور تھی ۔۔۔ چوراہے پر رنگین قمقموں کے درمیان سینما کے اشتہارات چمک رہے تھے ۔۔۔ میں سیدھی اسپتال چلی گئی ۔۔۔ "ب" کچھ رو بہ صحت ضرور تھیں ۔۔۔ چہرے کی مردنی صحت کی علامتوں میں چھپ گئی تھی ۔۔۔ آنکھوں کی مانند روشنی چمکیلے جگنوؤں کی طرح [illegible] تھی اور ہمیشہ بند رہنے والے ہونٹ کبھی کبھی کھل کر جیسے قہقہوں کو اگل جاتے تھے ۔۔۔!!

[illegible] بجے واپس آئی تو چاند بھی ساتھ ساتھ آیا ۔۔۔ چودھویں رات کے ہاتھوں لٹا ہوا چاند جو اب بھی محبوب کے آئینہ کی طرح نکھرا ہوا تھا ۔۔۔ موسیقی کی نرم لہریں، ہواؤں کے دوش پر اڑتی اس طرح دبی دبی سرگوشیاں کرنے لگیں جیسے "......" ۔۔۔ جیسے کوئی دل کے تاروں کو مرتعش کر کے بڑے دلربا انداز میں التجا کر رہا ہو ۔۔۔ "میرے پاس آجاؤ ۔۔۔ میری بات مان لو ۔۔۔!"

دیر تک چاندنی سے ہم آغوش رہی ۔۔۔ "مخدوم" کا کلام میرے ذہن میں ابھرنے لگا ۔۔۔ جیسے مخدوم کے شعر صرف شعر نہیں چاند کی روح، چاندنی کے چشمے ہوں ۔۔۔ جو ایک ایک کرن کے ساتھ پھوٹتے چلے جائیں اور ہر لہر گنگناتی جائے!

"ہر طرف پھیلی ہوئی ہے چاندنی ہی چاندنی ۔۔۔!"

میں نے دل کے پٹ بھیڑ دیئے ۔۔۔ اب کوئی اندر نہ آسکتا تھا ۔۔۔ صرف رات تھی جو چاندنی کے پھول سمیٹے میرے دل کے شبستان میں جلوہ گر تھی ۔۔۔ اور ایک قاتل پیکر، جو سامنے نہ ہوتے ہوئے بھی سامنے ہی کہیں آس پاس تھا ۔۔۔!!!

۲۴ر جنوری ۱۹۵۴ء

رات دیر تک جاگنے کے باعث صبح دیر تک سوتی رہی ۔۔۔ رات نیند کہاں تھی ۔۔۔؟! میں نے دفعتاً سوچا ۔۔۔ کہیں ماضی کے ویران کھنڈروں میں تو نہیں ۔۔۔؟! یہ "ماضی" ۔۔۔ ماضی بھی عجیب زمانہ ہے، جو بیت کر بھی بیت نہیں چکتا ۔۔۔ جو پرانا ہو کر بھی ہر دم نیا رہتا ہے، جیسے مرجھایا ہوا، سوکھا ہوا پھول، جو نئے بیج دیتا ہے کہ انھیں بو کر نئے درخت اگاؤ ۔۔۔ نئے پودے پروان چڑھاؤ ۔۔۔!!

آج سے کرکٹ میچ شروع ہو رہا تھا ۔۔۔ بھائیوں نے گھر میں قیامت مچا رکھی تھی ۔۔۔ "جلدی کرو جلدی" ۔۔۔ "ناشتہ لاؤ"

—— "جانے والا" —— "ارے ذرا میرے پرس ڈال دو" —— "آمنا" یہ تو دیکھو —— دوپٹہ —— ہاں ہاں
—— جا رہے ہیں —— میری اچھی جان —— ذرا جلدی کر دو نا —— جبھی میرا کنگھا کہاں گیا —— ذرا تمہارا دوپٹہ —— اور
کھنے لگے تو —— سب کا کام جلد جلد کئے جا رہی تھی —— بھائی —— جونٹ کھڑے اور لاؤ واہ ہو کر بھی بیٹھے رہا —— ہو —— ہوا
کے بوسے ستاروں کی طرح —— جنھیں ہاتھ نہ لگاؤ تو خاموش رہیں اور چھو تو آپ ہی آپ بج اٹھیں ——!!

گزشتہ سال ہم نے بھی تو اسی طرح دھوم مچائی تھی —— "اللہ بھائی جان کے لئے ناشتہ جلد دے دو —— دیر ہو گی تو سیٹ نہیں ملے گی —— پیچھے سے ٹھیک دکھائی نہیں دیتا —— دیکھو بھیا جلد تیار ہو جاؤ —— نہیں تو تمہیں چھوڑ جائیں گے ——!! تمہارا یا سب کو بھی خبر ہی کسی بھی دوست کے ساتھ بیٹھ جاؤ گے —— مشکل تو ہماری ہے —— اُفّ —— وہ بھی نظام کالج کا —— لڑکے ایسے شریر کہ الاماں —— چلو تو دیکھیں بیٹھو تو دیکھیں، یہاں تک کہ آنکھیں کھلاڑیوں پر اور کان لڑکیوں کی قطار کی طرف —— بھئی سب کے درمیان سے گزرنا تو اچھا نہیں لگتا —— ہم پہلے ہی اپنی نشست کیوں نہ لے لیں ؟! اور دیکھیے بھائی جان گاڑی جلد بھجوا دیجئے دوسری چکر میں تو بہت دیر ہو جاتی ہے —— یا پھر ایسا کیجئے نا —— ہم پہلے چلے جائیں بعد آپ آ جائیے —— اللہ بھائی جان کتنے پیارے ہیں آپ ؟!" —— اور دھوم مچا کر سب کو پھسلا کر ہم چل دیتے ——!!

پر وہ سال تو بیت گیا —— اس بار میچ دیکھنے طبیعت ہی نہ چاہی —— نہ جانے طبیعت کو ہو کیا گیا ہے —— اداس اداس سی کبھی کبھی سی رہتی —— حالانکہ پاکستان ٹیم کے نہ ہوتے ہوئے بھی حنیف کی مہارت اور فضل محمود کی اسٹائلش بولنگ کے ننھے بچوں میں اب بھی اس انہماک سے چلتے ہیں جیسے بڑے ہو کر سب کے سب حنیف یا فضل محمود ضرور ہی بنیں گے —— ! کتنی پرجوش ہے یہ ننھی پود بھی ——؟! اور وہ "بولتی نگاہیں" —— جو کرکٹ کے ہنگاموں ہی میں ایک داستان سنا کر خاموش ہو گئیں —— نہ جانے اب کہاں ہوں گی —— اب بھی کوئی کہانی کہتی ہوں گی یا نہیں ——؟! ایک کسک سی دل میں اٹھتی جیسے کوئی جلے زخموں پر ٹھنڈے پانی کی پچکاریاں مار رہا ہو —— وہ نگاہیں جنھیں میں نے اپنا سمجھا مگر جو میری نہ ہوئیں —— وہ شاید کسی کی نہ ہوں —— ہر ایک کو یوں ہی کہانیاں سناتی رہیں، ہر ایک کو یوں ہی بھٹکاتی رہیں ——!!

"آمنا" ! —— "ص" گاڑی میں بیٹھے بیٹھے بھاگ آیا —— "کل نمائش سے تمہارے لئے کیک لایا تھا تمہیں دینا ہی بھول گیا —— یہ لو ——" وہ ایک ڈبہ میرے آگے پھینک کر تیز بھاگ گیا —— وہی "چاکلیٹ کیک" —— وہی شکر کے موتی، وہی کریم کے پھول —— میری مرغوب پسند ——!! محبت کا دریا ابل پڑا —— میرا بھیا —— چھوٹا بھیا —— پیارا پیارا ——!!!

دس بجے گھر میں ایسی خاموشی چھائی جیسے برات والے رات بھر دھوم مچا کر صبح تڑکے دلہن کو لے جا چکے ہوں اور صبح کے باوجود لوگ رات کی نیند کو پلکوں پر سمیٹے اٹھنے کی بجائے ابھی لوٹ پوٹ رہے ہوں ——!

لاری جا رہی تھی میں نے بچوں کو بھیج دیا —— خاموشی اور بڑھ گئی —— پھر میں تھی اور گھر —— خاموشی میں —— بولتا گھر —— جس کی دیواریں، دروازے، کھڑکیاں تک میری بچپن کی معصوم شرارتوں کی آئینہ دار تھیں —— ڈریسنگ کیبنٹ پر چڑیوں کا ایک مسرور جوڑا بڑی دلچسپ حرکتیں کر رہا تھا —— صبح کی نرم دھوپ ابھی تیز نہ ہوئی تھی —— کانپتی ہوا، نیم کے پتوں کو چھو کر جھوم جھوم رہی تھی —— ایک بلبل نہ جانے کہاں سے بھٹک آیا —— کچھ دیر چنبیلی کے منڈوے پر ستا کر، وہ پھر اڑ گیا ——!!

میں نے پانی گرم کروایا اور کھٹکا چڑھا، نیم گرم ٹب میں اتر گئی —— ہلکی ہلکی گرمی —— دھیمے دھیمے تھپیڑے —— سارا گرد و غبار بہا لے گئے ——!

جب نہا چکی، کافی چست ہو گئی —— سادر میں چائے کی پتی ڈال کر میں نے کتابیں سنبھالیں اور دنیا پھر میری مٹھی میں سمٹ آئی ——!! مگر یہ تو بھول ہی گئی کہ مجھے باہر جانا ہے —— باہر —— کسی سے ملنے —— ایک بے قرار سے —— جس کی بیقراریاں

بغیر مجھ سے ملے کم ہی نہ ہوتی تھیں ـــــــــــ جس نے میرے لئے ایک دنیا کو بھلا رکھا تھا ـــــــــ!!

تین بجے چلی گئی ـــــ پانچ بجے واپس آئی ـــــ تو دھوپ رخصت ہو رہی تھی ـــــ انار کے درخت پر بے شمار انار کلیاں کھل کر مرجھا رہی تھیں ـــــ جیسے دھوپ ایک جابر شہنشاہ کی طرح ان کے خاتمے کا حکم سنا کر دنیا کے ایوان سے اڑ رہی تھی ـــــ اور رات اندھیرے کی دیواریں لئے انھیں صبح تک قید کرنے آ رہی تھی ـــــ بیچاری انار کلیاں ـــــ معصوم اور حسین ـــــ جن کی شگفتگی بھی قیامت جن کا حسن بھی جان لیوا ـــــ قاتلانہ ـــــ دھوپ چلی گئی ـــــ اندھیرے نے سب کچھ چھپا لیا ـــــ چاند ابھی سو رہا تھا ـ تاروں کی قندیلی چھاؤں میں صرف ایک تصویر جھلکتی رہی ـــــ جس میں مور ناچ ناچ کر تھک چکا تھا ـــــ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور مورنی پاس کھڑی ان آنسوؤں کو پی رہی تھی ـــــ!!

میں نے رسائل اٹھائے مگر دل تو آج بڑا مطمئن تھا ـــــ وہ ضدی ـــــ سرکش دل جو اپنے لئے سخت تھا، بغاوتوں کے لئے سرکش تھا، ـــــ مگر دنیا کے لئے ـــــ دوستوں کے لئے ـــــ "ن" کے لئے ـــــ نرم اور رحمدل ـــــ!! پچھلے گھروں میں ڈھولک بجتی رہی ـــــ مرد عورتیں آواز ملا ملا کر گاتے رہے جیسے رات نہیں گذار رہے کوئی تہوار منا رہے ہوں ـــــ؟!! ـــــ اور میں سونے سے پہلے دیر تک سوچتی رہی ـــــ "ن" کی مسکراہٹ نے اتنا سکون کیوں دیا ـــــ جیسے وہ ہنسا تو اس کے ساتھ کائنات ہنس پڑی اور ـــــ اب نہ کہیں دکھ ہے نہ غم ـــــــــ!!!!

ریشمی کہانی

لاجپت رائے

بہت دنوں کی بات ہے جب کہ میں چھوٹا سا تھا تو میری دادی نے مجھے ایک کہانی سنائی تھی۔ کہانی بہت خوبصورت تھی۔ کہانی ریشم کی طرح ملائم اور روئی کی طرح نرم تھی۔ اس کہانی میں ایک خوبصورت محل تھا اور اس محل میں ایک بہت بڑا باغ جس میں طرح طرح کے میوے تھے۔ انگور، ناشپاتی، انار، خوبانیاں وغیرہ۔ یہ میوے میں بازار میں بھی دیکھ رہا ہوں مگر بہت مہنگے ہوتے ہیں۔ اس باغ میں ایک خوبصورت سی جھیل تھی اور اس جھیل کے ارد گرد رنگا رنگ کے پھول تھے۔ پیلے پھول۔ نیلے پھول۔ سرخ پھول۔ ہر طرف پھول ہی پھول تھے۔ اس محل میں ایک خوبصورت شہزادہ رہتا تھا جس کے پاس اچھے اچھے کپڑے تھے۔ اس کے سر پر ہیروں کا تاج تھا اور اس تاج میں خوب پر لگے ہوئے تھے۔ یہ شہزادہ ماں باپ کا اکلوتا لڑکا تھا۔ اس لئے بڑے ناز و نعمت سے پالا گیا تھا۔ میں بھی اپنے ماں باپ کا اکلوتا لڑکا ہوں لیکن مجھ کو وہ ناز و نعمت میسر نہیں جو اس کہانی کے شہزادے کو میسر تھے ـــــ لیکن خیر میں آپ کو وہ خوبصورت اور ریشمی کہانی سنا رہا تھا جو میری دادی مجھے اکثر سنایا کرتی تھی ایک دن وہ شہزادہ باغ میں گھوم رہا تھا کہ اس نے پھولوں کی کیاری میں ایک سرخ پھول کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔ وہ پھول بہت خوبصورت تھا۔ شہزادے نے اس سے پہلے اتنا خوبصورت پھول کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شہزادے کو وہ پھول بہت پسند آیا اور وہ اسے اپنے محل میں لے آیا، اور بستر پر رکھ دیا اور سو گیا۔ نیند میں اس نے محسوس کیا کہ بستر میں کوئی چیز ہل رہی ہے اور اس کی ناک میں نہایت بھینی بھینی خوش بو آ رہی ہے اور جب اس نے آنکھ کھولی تو اس نے دیکھا کہ اس کے بستر پر ایک نہایت حسین عورت لیٹی ہوئی ہے۔ وہ عورت بہت ہی حسین تھی۔ بے حد حسین! اس کے بال ریشم کی طرح ملائم تھے اور چاندنی کی طرح چمکدار تھے۔ اس کے بالوں سے چنبیلی کے پھولوں کی خوش بو آ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح تپتے اور نرم تھے۔ اس کے جسم میں سورج کی گرمی تھی، چاند کی ٹھنڈک تھی اور پھولوں کی کوملتا تھی اور اس کی آنکھیں شراب میں بھیگی ہوئی تھیں۔ شہزادے کو وہ عورت بہت پسند آئی اور اس نے اسے اپنی شہزادی بنا لیا۔

یہ کہانی مجھے بہت پسند ہے۔ یہ کہانی میں نے اپنی دادی سے بار بار سنی اور میری دادی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہیں بھی ایسی ہی خوبصورت شہزادی لاؤں گی۔ مگر میری دادی نے جھوٹ بولا تھا۔ اس نے خود اپنے ہاتھوں سے نند جولاہے کی لڑکی درگی سے میرا بیاہ رچایا تھا۔ درگی اچھی لڑکی ہے۔ سارے گھر کا کام کاج وہی کرتی ہے۔ میری ماں بھی اسے بہت چاہتی ہے۔ درگی میری بھی بہت سیوا کرتی ہے۔ جب دن بھر محنت مزدوری کر کے میں گھر لوٹتا ہوں تو وہ بڑے پیار سے مجھے کھانا کھلاتی ہے اور جب میں کھانا کھاتا ہوں تب وہ اپنے پاؤں کی انگلیوں سے چولھے کی راکھ کو کریدتی رہتی ہے اور جب میں سونے لگتا ہوں تب وہ میرے پاؤں داتبی رہتی ہے اور پھر میرے پیروں کی طرف سر رکھ کر سو جاتی ہے۔ درگی بہت اچھی لڑکی ہے مگر اس کے بالوں میں کہانی کی شہزادی کے بالوں کی طرح چنبیلی کے پھولوں کی مہک نہیں آتی بلکہ اس کے بالوں سے سرسوں کے کڑوے تیل کی بو آتی ہے۔ میں نے اس سے کئی بار کہا ہے کہ درگی تو سرسوں کے بجائے کھوپرے کا تیل لگایا کر مگر وہ میری بات مانتی ہی نہیں اور ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیتی ہے کہ سرسوں کے تیل سے سر میں جوئیں نہیں پڑتیں .... اور میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ درگی کے جسم سے گلاب کے پھولوں کی مہک بھی نہیں آتی بلکہ اس کے جسم سے مرچ، مسالے اور لہسن کی بو آتی ہے۔ لہسن سے مجھے سخت چڑ ہے یہ کیا کیا جائے۔ بچاری سارا دن تو

... نہیں رونق ہے ... اس کا چہرہ پھیکا پھیکا سا، بے جان سا ہے۔ اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا کچھ تیرتا رہتا ہے ۔۔۔ ... اداس ... اس کی آنکھیں ۔۔۔ اف ۔۔۔ لیکن دُرگی پھر بھی خوبصورت ہے میرا مطلب ہے راجو کی بیوی ۔۔۔ زیادہ ... شاموں کی بیوی ... دانت ہی باہر نکلے رہتے ہیں اور غفور میاں کی بیوی کے گال پچکے ہوئے ہیں ..... میری دُرگی ان سب سے اچھی ہے .... لیکن کہانی کی شہزادی ۔۔۔ اس کے بالوں میں چنبیلی کے پھولوں کی مہک ۔۔۔ چنبیلی کے پھول ۔۔۔ آہ چنبیلی کے پھول مجھے کتنے اچھے لگتے ہیں!

یہ کہانی جو میری دادی نے مجھے سنائی تھی جب کہ میں چھوٹا سا تھا مجھے اب بھی یاد ہے۔ اب جب کہ میں بڑا ہو گیا ہوں اور یہیں شہر میں کپڑے کی مل میں کام کرتا ہوں۔ بھونپو بجنے سے پہلے ہی مل میں پہنچ جاتا ہوں اور تمام دن مشینوں کے ساتھ میرا دل میرے ہاتھ اور میرا دماغ بھی چلتا رہتا ہے اور جب شام کو مشینیں بند ہو جاتی ہیں تو میرا دماغ بھی بند ہو جاتا ہے۔ دل سوچنا چھوڑ دیتا ہے اور برف کی طرح جم کر رہ جاتا ہے۔ اور دل ۔۔۔ دل حرکت کرتا ہے گھڑی کی سوئی کی طرح ۔۔۔ ٹک ٹک ۔۔۔ ٹک ۔۔۔ ٹک اور میں سڑکوں پر گھومتا ہوں۔ کبھی کبھی راستے میں چنے کھاتا ہوں اور راستے پر چلتی ہوئی ٹراموں کو، موٹروں کو، بسوں کو، مردوں کو، عورتوں کو اور بچوں کو چلتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ میری ہی طرح چلتے ہیں یہ لوگ۔ کبھی آہستہ کبھی تیز۔ کبھی گنگناتے ہیں کبھی مسکراتے ہیں اور کبھی روتے ہیں۔ میں بھی کبھی کبھی مسکراتا ہوں اور کبھی کبھی روتا ہوں۔ لیکن مسکراتا کم اور روتا زیادہ ہوں۔ باقی لوگوں کا کیا حال ہے مجھے نہیں معلوم۔ کبھی میں راستے میں کسی بڑی دکان کے سامنے ٹھہر جاتا ہوں اور گرم اور ریشمی اور سوتی کپڑوں کو دیکھتا ہوں۔ ایسا سوتی اور رنگ برنگے پھولوں والا کپڑا اپنی مل میں بھی تیار ہوتا ہے اور ان لوگوں کو بھی دیکھتا ہوں جو یہ خوبصورت کپڑے پہنتے ہیں اور بالکل کہانی کے شہزادے کی طرح لگتے ہیں۔ ہمارے مل مالک کی لونڈیا جو سلیٹی رنگ کی کار میں ہماری مل میں کبھی کبھار آ جاتی ہے۔ وہ بھی کہانی کی شہزادی کی طرح خوبصورت ہے۔ اس کے ہونٹ بھی کہانی کی شہزادی کے ہونٹوں کی طرح پتلے اور نرم ۔۔۔ گلاب کی پتیوں کی طرح ہیں اور اسے دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ شہزادی صرف میری دادی کی ریشمی کہانی میں ہی نہیں ہے بلکہ ہماری اس دھرتی پر بھی ہے میں نے ایسی کئی شہزادیوں کو دیکھا ہے۔ اپنے اس شہر میں ۔۔۔ فورٹ میں سمندر کے کنارے ۔۔۔ میں نے کئی ایسی شہزادیوں کو دیکھا ہے جو کہانی کی شہزادی سے ۔۔۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ کومل ۔۔۔ سندر ۔۔۔ حسین ۔۔۔ بے حد حسین۔ اور تب میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنی دُرگی کو بھی ایسی شہزادی بنا دوں۔ دُرگی ایسی شہزادی بن سکتی ہے۔ دُرگی خوبصورت ہے۔ جوان ہے۔ اس کی آنکھیں ۔۔۔ میرا مطلب ہے اس کی بناوٹ بہت اچھی ہے ۔۔۔ لیکن وہ خشک ہیں۔ اداس ہیں۔ بے جان ہیں۔ دُرگی بھی کہانی کی شہزادی کی طرح خوبصورت بن سکتی ہے۔ صرف اسے اچھے کھانے کی ضرورت ہے۔ اچھے کپڑوں کی ضرورت ہے۔ بالوں میں چنبیلی کے تیل کی ضرورت ہے۔ آنکھوں میں کاجل کی ضرورت ہے۔ پاؤں میں اونچی ایڑی کے سینڈلوں کی ضرورت ہے۔ دُرگی شہزادی بن سکتی ہے۔ مگر ۔۔۔ مگر میں بہت کم کماتا ہوں۔ حالانکہ کام زیادہ کرتا ہوں اور بھونپو بجنے سے پہلے ہی مل میں پہنچ جاتا ہوں اور تمام دن کام کرتا ہوں اور پھر مجھے ڈھائی روپے ملتے ہیں۔ پہلے دن ڈھائی روپے، دوسرے دن ڈھائی روپے، تیسرے دن ڈھائی روپے..... اور میں کام کرتے کرتے سوچتا ہوں کہ اس مہینے ضرور دُرگی کے لئے ایک جاپانی سلک کی ساڑھی لے لوں گا اور پھر وہ کچھ کچھ شہزادی نظر آنے لگے گی اور پھر میں کام کرتا ہوں، تیس دن کام کرتا ہوں اور پھر میری جیب میں پچھتر (۷۵) روپے آ جاتے ہیں۔ اور جب میں گھر آتا ہوں تو یہ روپے ماں کو دے دیتا ہوں اور اس سے ہر ماہ کہتا ہوں کہ دیکھو ماں اس مہینے ذرا سوچ سمجھ کر خرچ کرو۔ دیکھو میں دُرگی کے لئے ایک ساڑھی خریدنا چاہتا ہوں اور میری ماں روپے پاندان میں رکھ دیتی ہے اور پھر روزانہ روپے پاندان سے نکالنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ روپیہ راشن والے کے پاس جاتا ہے۔ مکان والے کے پاس جاتا ہے۔ کھولی کا بھاڑہ پندرہ روپے ۔۔۔ بھاڑہ بہت زیادہ ہے اور مکان بہت گندہ ہے ۔۔۔ مگر آجکل مکان ملتے کہاں ہیں ۔۔۔ خیر راشن تیس روپے، کوئلہ

— مرچی — نمک — تیل — ماچس — ہلدی — اور روپے پاندان سے نکلتے رہتے ہیں اور پھر ختم — روپے پیسے ختم ہوتے ہیں اور مہینہ پیچھے ختم ہوتا ہے۔ روپے پیسے کیوں ختم ہوتے ہیں اور مہینہ پیچھے کیوں؟ مجھے نہیں معلوم۔ اور اس کا علاج؟ — میرا خیال ہے کہ یا تو مزدوری بڑھ جانی چاہئیے یا مہینہ چھوٹا ہو جانا چاہئیے۔ لیکن میں پانچ سال سے اس مل میں کام کر رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ نہ تو میری مزدوری بڑھتی ہے اور نہ مہینہ چھوٹا ہوتا ہے۔ ہماری مل میں — میرا مطلب ہے کہ ہمارے سیٹھ کی مل میں کبھی کبھی لال باوٹے والے بھی آتے ہیں اور چلاتے ہیں — مزدوری بڑھاؤ، بھتہ دو اور کبھی کبھی تو سالے جوش میں آکر ہڑتال بھی کرا دیتے ہیں۔ مجھے بھی کہتے ہیں کہ منگلو تو بھی ہڑتال میں شامل ہو جا۔ پر میرا کوئی دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دیکھو بھائی چلانے اور گلا پھاڑنے سے کچھ بھی نہیں بنتا۔ جب بھگوان کی مرضی ہو گی اپنی مزدوری بڑھ جائے گی اور اگر سیٹھ نے نکال دیا تو اپن گئے بارہ کے بھاؤ میں۔ چار آنے پونے ملتے ہیں۔ یہی غنیمت ہیں۔ بھگوان کی کرپا ہے۔ بھگوان دیالو ہیں۔ شکر ہے بھگوان کا کہ کھانے کو ملتا ہے۔ نہیں تو کئی بے چارے ایسے ہیں جنھیں کھانے کو بھی نہیں ملتا۔ پچھلے دنوں اپنا رحیمو بیکار رہا — وہی رحیمو جو سالا ہڑتال کراتا پھرتا تھا۔ بڑا حرامی لیڈر بنا پھرتا تھا۔ مر گیا نہ بھوکا۔ سالے کی بچی بیمار ہوئی اور مر گئی اور اب خود بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ شکر ہے بھگوان تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو کھانے کو دیتا ہے۔ میں ہر روز بھگوان کی پوجا کرتا ہوں اور کچھ دیر کے لئے من کو شانتی بھی ملتی ہے۔ مگر جب مجھے دادی کی ریشمی کہانی یاد آتی ہے اور میں اپنی درگی کے جسم پر ریشمی ساڑھی کو لہراتے ہوئے نہیں دیکھتا۔ اس کی آنکھوں میں کاجل نہیں دیکھتا تو یہ لوبھی من پھر اداس ہو جاتا ہے۔ پھر مچل جاتا ہے اور میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ یار منگلو یہ بھگوان وگوان سب سالا ڈھونگ ہے۔ بھگوان وگوان کچھ بھی نہیں۔ اوپر نیلا نیلا آسمان ہے۔ آسمان پر دن کو سورج چمکتا ہے اور رات کو تارے جگمگاتے ہیں اور چاند مسکراتا ہے — مسکراتا ہے یا روتا ہے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اور اس کے سوا اوپر کچھ بھی نہیں مگر پھر جیسے مجھے کوئی تھپڑ مار دیتا ہے۔ اور میرے بال مٹھی میں بھینچ لیتا ہے اور کہتا ہے — ابے سالے منگلو سوچنا بند کر دے تو ناستک ہوتا جا رہا ہے۔ یہ سب سوچنے کا دوش ہے۔ مایا کے لوبھ میں پھنس کر تو دھرم کی ڈگر سے ہٹ رہا ہے۔ نرک — آگ — نرک — منگلو انسان اس دنیا میں خالی ہاتھ آتا ہے اور خالی ہاتھ چلا جاتا ہے۔ درگی کو ریشمی ساڑھی مل جائے گی۔ مگر کیا یہ ساڑھی وہ پرلوک ساتھ لے جائے گی اور پھر میرا سر بھگوان کے چرنوں میں گر جاتا ہے۔ لیکن پھر میں سوچتا ہوں کہ ٹھیک ہے درگی یہ ساڑھی پرلوک تو نہیں لے جائے گی لیکن جب تک اس لوک میں ہے تب تک تو اسے ملنی چاہئیے! اسے شہزادی بننا چاہئیے! اگر پھر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب سوچنا فضول ہے۔ سوچنے سے انسان ناستک ہو جاتا ہے۔ اس لئے آج کل میں بہت کم سوچتا ہوں لیکن میری ایک تمنا ہے کہ کوئی ایک ایسی کہانی لکھے جس میں شہزادہ بنوں اور درگی شہزادی۔ جس میں خوبصورت محل ہو اور باغ ہو اور ریشمی لباس ہوں — اور — اور — مگر کون لکھے گا ایسی کہانی۔ کہانی لکھنے والے تو بڑے بڑے آدمی ہوتے ہوں گے اور ہماری ان تک پہنچ کہاں؟

ایک دن میں کام کرنے کے بعد چھٹ پاتھ پر دوائیاں بیچنے والے کے مجمع میں کھڑا تھا کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا پہلے تو میں سمجھا سالا کوئی جیب کترا ہے مگر پلٹ کر جو دیکھتا ہوں تو میرا پرانا یار برکت ہے۔

میں نے کہا — "ابے برکت تو سالا یہاں کہاں؟"

ہم دونوں مجمع سے باہر آئے اور دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ برکت اور میں بچپن میں ساتھ ساتھ پڑھا کرتے تھے، کھیلا کرتے تھے اور سڑک سے چن چن کر سگریٹیں پیا کرتے تھے۔ پھر نہ جانے برکت کہاں چلا گیا اور پھر آج بہت دنوں کے بعد ملا تو بڑی خوشی ہوئی۔

میں نے کہا — "کیا کام کرتا ہے رے آج کل؟"

کہنے لگا ــــ "کہانیاں لکھتا ہوں"

میں نے کہا ــــ "تو جھک مارتا ہے۔ ارے کہانیاں لکھنے والے تو بڑے بڑے آدمی ہوتے ہیں۔ اور تو ــــ تو ــــ رحمت جلاہے کا لڑکا ــــ تو کہانی لکھے گا ــــ رحمت تیرے کی ــــ سالے بیڑی نکال۔"

برکت نے مجھے بیڑی دی اور کہا ــــ "چل تجھے کہانی سناؤں۔"

ہم دونوں ایرانی کے ہوٹل میں گئے۔ دو سنگل چائے منگائی اور پھر برکت نے اپنے کوٹ کی جیب سے کچھ کاغذ نکالے اور پھر انھیں میز پر بکھیر دیا اور پھر برکت نے مجھے کہانی سنائی۔ میں کہانی سنتا رہا۔ کہانی بڑی اداس تھی۔ کہانی مجھ جیسے ایک مزدور کی تھی۔ اس کی ایک ماں تھی ــــ جس کا نام ماں تھا ــــ میری ماں کا نام بھی ماں ہے ــــ ہر عورت ماں ہوتی ہے ــــ اس کی ایک بیوی تھی ــــ جس کا نام چمپا تھا ــــ میری بھی ایک بیوی ہے جس کا نام درگی ہے۔ اس کے تین بچے تھے جو ننگے تھے ــــ میرے بھی دو بچے ہیں جو ادھ ننگے ہیں۔ اس کہانی میں ایک راشن والا تھا۔ ایک سود خور پٹھان تھا۔ ایک ڈاکٹر تھا جو فیس زیادہ مانگتا تھا۔ اس کہانی میں مزدور چاہتا تھا کہ اس کی بیوی اچھے کپڑے پہنے۔ اچھے مکان میں رہے۔ اچھا کھانا کھائے۔ اس کی بیوی شہزادی بنے میری دادی کی ریشمی کہانی کی طرح ــــ لیکن آگے کہانی بڑی دردناک تھی۔ مزدور کے بچے بیماری میں مر جاتے ہیں۔ اس کی بیوی چتا میں جا بیٹھتی ہے۔ درگی چتا میں جا بیٹھتی ہے اور مزدور مر جاتا ہے ــــ منگلو مر جاتا ہے۔

میں نے کہا "برکت یہ کہانی میری ہے۔ وہ مزدور مر گیا ہے مگر منگلو زندہ ہے۔ یہ کہانی منگلو کی ہے برکت"

برکت نے کہا ــــ "منگلو یہ صرف تیری کہانی نہیں ہے۔ یہ سب کی کہانی ہے۔"

میں نے کہا ــــ "ٹھیک ہے برکت یہ ہم سب کی کہانی ہے۔ یہ منگلو کی کہانی ہے۔ تو نے میری کہانی لکھی ہے۔ مگر یہ کہانی بڑی دردناک ہے۔ تو میرا دوست ہے۔ تجھے کہانی لکھنی آتی ہے۔ اب دیکھ تو ایک ایسی کہانی لکھ ..... ایسی ــــ ایسی ــــ ایسی اور پھر میں نے اسے اپنی دادی کی ریشمی کہانی سنائی جس میں خوبصورت محل تھا۔ طرح طرح کے پھل تھے۔ رنگا رنگ کے پھول تھے ــــ پیلے پھول، نیلے پھول، سرخ پھول، ہر رنگ کے پھول اور شہزادی تھی۔ جہاں راشن کا جھگڑا نہیں تھا۔ جہاں اچھے اچھے کپڑے تھے اور دیکھ تو ایسی ریشمی کہانی لکھ جیسی میری دادی نے سنائی تھی۔"

برکت نے کہا ــــ "منگلو میں ایسی کہانی نہیں لکھ سکتا۔ وہ کہانی بڑی سندر ہے۔ لیکن ایسی کہانی لکھنے کے لئے ہمیں لڑنا ہوگا۔ ہم سب کو لڑنا ہوگا۔"

میں نے کہا ــــ "سالے تجھے لڑنے مرنے کے سوا دنیا میں کوئی دوسرا کام نہیں۔ بچپن میں تو گلی کے لڑکوں سے لڑا کرتا تھا۔ ان کے پیسے چھین لیا کرتا تھا۔ وہ بچپن کے دن تھے۔ اب کیا بڑا ہو کر بھی تو نے لڑنا نہیں چھوڑا۔ چل جلدی سے چائے پی اور باہر چلیں ــــ پگلا کہیں کا!"

برکت نے جلدی سے چائے پی اور ہم دونوں باہر آئے۔ میں نے دیکھا کہ برکت بہت اداس تھا۔ نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ جب ہم دونوں ہند ماتا سینما کے نکڑ پہ پہنچے تو مزدوروں کا ایک جلوس جا رہا تھا۔ آج گیس مزدوروں کی ہڑتال تھی۔ ان کے ہاتھ میں لال جھنڈے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ لال باوٹے والے ہیں۔ برکت انھیں دیکھتا رہا۔ پھر مسکراہٹ اس کی آنکھوں سے پھسلتی ہوئی اس کے چہرے پر رینگنے لگی اور اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو گئی۔ اس نے میرے بازو کو زور سے بھینچا اور کہا ــــ "چل منگلو چلیں جلوس میں۔"

میں نے اس کا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا ــــ "اچھا، اچھی ــــ جلسے میں ــــ لال باوٹے والوں کے جلسے میں، ارے برکت وہاں پولیس لاٹھی چلائے گی اور گولی چلائے گی اور دنگا ہوگا۔ کیا رکھا ہے جلسے میں۔ چل فلم دیکھیں گے کہیں۔"

برکت نے میرے بازو کو اور زور سے بھینچا اور کہا ــــ "چل منگلو تجھے میری قسم۔ منگلو تجھے نہیں معلوم کہ یہ لوگ تیری دادی کی ریشمی کہانی کے لئے لڑنے جا رہے ہیں۔ چل۔" اور اس نے میرے بازو کو اتنی زور سے بھینچا کہ میرے پاؤں زمین سے اکھڑ گئے اور ہم دونوں جلوس کی طرف چل دیئے۔

اثر لکھنوی

ختم جس دن امتیازِ این و آں ہو جائے گا
آدمیت کا جو منشا ہے عیاں ہو جائے گا

آرزو ہوگی خود اپنی اور اپنا انتظار
عشق بڑھ کر جانِ جاں آرامِ جاں ہو جائے گا

وہ دے بربط ہو جانے تو وہ سازِ حیات
مطربِ غم گنگنا کر نغمہ خواں ہو جائے گا

ضبط میں کاوش نہ کرتے ہم اگر یہ جانتے
ہر نفس اک پردۂ سازِ فغاں ہو جائے گا

پھر کیا آزاد اے صیاد تو احسان کیا؟
جب اسیروں کو قفس ہی آشیاں ہو جائے گا

اے اثر ماضی کہاں تک حال میں جینا بھی سیکھ
قصۂ پارینہ جورِ آسماں ہو جائے گا

ہے نفس کی آمد و شد میں نہاں شورِ جرس
اٹھ کہ دم بھر میں روانہ کارواں ہو جائے گا

ہے یہی محویتِ نظارہ تو اے عندلیب
حسنِ روئے گل چراغِ آشیاں ہو جائے گا

سوچ کر اے بے خبر انجامِ عشرت سوچ کر
نغمۂ رنگیں، نوائے خوں چکاں ہو جائے گا

فتنہ و پیکار کا ممکن جبھی ہے انسداد
جب اخوت مسلکِ ہندوستاں ہو جائے گا

دے دیا دل بے وفا کو، ہم نہ کہتے تھے اثر
جان پر بن جائے گی، جی کا زیاں ہو جائے گا

صفی اورنگ آبادی

وعدوں میں تمہاری یہ ذرا بھول ذرا یاد
واللہ مزہ آگیا "کیا بھول ہے کیا یاد"

اس یاد کے پردے کو ولائے کوئی کیا یاد
میرا ہی کہا یاد نہ اپنا ہی کہا یاد

دل بستۂ دیرینہ کو کچھ خوف نہیں ہے
ہر جرم کی ہے آپ کے مجرم کو سزا یاد

حاصل نہ ہوا عیش تو تکلیف میں گزری
تم یاد نہیں آئے تو آیا ہے خدا یاد

حیرت میں ہیں سب آپ سے بیگانے یگانے
ہر بھول الگ بھول ہے ہر یاد جدا یاد

اس بھول کے قربان خطا اپنی فراموش
اس یاد کے صدقے ہوں فقط میری خطا یاد

بیگانوں کی صورت درِ دولت پہ کھڑا ہوں
کیوں یاد کیا تھا انہیں کچھ بھی نہ رہا یاد

یوں یاد نہیں معشوق کی دوری و حضوری
دوری کی بنا بھول حضوری کی بنا یاد

میں کو نیا احساں نیا بھول گیا ہوں
اے دشمنِ اربابِ وفا! کچھ تو دلا یاد

تو سب کی خوشی کر نہ سکے گا مرے ساقی!
ایک ایک بلاکش کو ہے ایک ایک مزا یاد

مقطع میں صفی بھول گیا مقصدِ آخر
تھا ٹیپ کا جو بند وہ ہم کو نہ رہا یاد

تمکین سرمست

یہ سادگی اور یہ پرکاری ہر ایک کے بس کا کام نہیں
ہر جام ہے ساقی کا لیکن ساقی کا کوئی جام نہیں

بے وجہ تڑپ بے وجہ سکوں تکلیف نہیں آرام نہیں
اک درد ہے ایسا بھی دل میں جس درد کا کوئی نام نہیں

اے دوست جو حالت ہے دل کی کس طرح کہوں اور کس سے کہوں
کیوں کر یہ کوئی باور کر لے آرام ہے اور آرام نہیں

ساقی بھی ہے پاس اور پیاس بھی ہے اب کیا کہوں میں کیونکر پیاسا ہوں
یہ بھی نہیں میخانے میں مری تقدیر کا کوئی جام نہیں

میخانہ ہے رندوں کے دم سے اور رند ہی پیاسے رہ جائیں
ہے جراتِ رندانہ کی کمی ساقی یہ کوئی الزام نہیں

قیدی بھی وہی زنداں بھی وہی عنوانِ اسیری بدلا ہے
اب کوئی اسیرِ دام نہیں اور کون اسیرِ دام نہیں

ہنستوں کو رُلانا آسان تھا روتوں کو ہنسانا مشکل ہے
بے فائدہ کیوں زحمت کیجئے یہ آپ کے بس کا کام نہیں

وہ رابطۂ خاص اور ہی شئے ہے جس کو گلستاں کہتے ہیں
پھولوں کو اکٹھا کر لینے کا ورنہ گلستاں نام نہیں

اب دورِ ستم اور دورِ کرم میں اس سے زیادہ فرق نہیں
بدنام بہت تھا دورِ ستم اور دورِ کرم بدنام نہیں

اپنے کو مٹا دینے والا قطرہ دریا کہلاتا ہے
جب تک ہے سکتِ ناکامیوں کی ناکام کوئی ناکام نہیں

اللہ رے سرورِ بے طاہی مسرور ہے دل ساغر خالی
یہ تشنہ لبی اور سرمستی تمکیںؔ کچھ آساں کام نہیں

پرویز شاہدی

موقعِ یاس کبھی تیری نظر نے نہ دیا
شرطِ جینے کی لگا دی مجھے مرنے نہ دیا

کم سے کم میں غمِ دنیا کو بھلا سکتا تھا
پر تری یاد نے یہ کام بھی کرنے نہ دیا

اس رقابت پہ فدا میری پریشاں حالی
اپنی زلفوں کو کبھی تو نے سنورنے نہ دیا

تیری غم خوار نگاہوں کے تصدق کہ مجھے
غمِ ہستی کی بلندی سے اترنے نہ دیا

حسن ہمدرد ترا ہم سفرِ شوق رہا
مجھ کو تنہا کسی منزل سے گذرنے نہ دیا

وہ تری شوخیٔ عارض کے قریب آ نہ سکی
رنگ جس فکر کو بھی خونِ جگر نے نہ دیا

میں نے دیکھا ہے ترے حسنِ خود آگاہ کا رعب
اجنبی نظروں کو چہرے پہ نکھرنے نہ دیا

کتنی خوش ذوق ہے تیری نگہِ بادہ فروش
خالی رہنے نہ دیا جام کو بھرنے نہ دیا

ظہیر کاشمیری

شورشِ نالہ و فریاد ابھی باقی
ہے
طمطراقِ دلِ برباد ابھی باقی
ہے
غنچے غنچے میں ابھی تک ہیں قفس پوشیدہ
برگِ گل میں کفِ صیاد ابھی باقی ہے
زخمِ سر آج بھی ہے درد پرستوں کا علاج
عظمتِ تیشۂ فرہاد ابھی باقی
ہے
دلِ پرخوں سے کہو حیلۂ مرہم نہ کرے
شہر میں اک ستم ایجاد ابھی باقی ہے
ابھی خوننابۂ محشر سے گزرنا ہوگا
چشمِ تر اک نئی افتاد ابھی باقی
ہے
بزم میں شعلۂ لب سوز جلانے والو!
شہرتِ نغمۂ آزاد ابھی باقی
ہے
دلِ مرحوم کی خاموش فضاؤں میں ظہیر
اک سلگتی ہوئی فریاد ابھی باقی ہے

قتیل شفائی

آباد ہیں سینے میں احساس کے بت خانے
کافر ہوں کہ مومن ہوں، اب یہ تو خدا جانے
ایماں سے کہیں بڑھ کر وہ کفر مقدس ہے
انساں سے نہیں لیتا جو خون کے نذرانے
کیوں چاک کرے کوئی دامانِ حیات اپنا
اے کاش بہاروں سے روٹھے رہیں دیوانے
شب کیسی کٹی اپنی؟ کچھ یاد نہیں آتا
بکھرے ہیں سرِ محفل ٹوٹے ہوئے پیمانے
اے ابرِ کرم تجھ سے منکر تو نہیں کوئی
لیکن ترے سائے میں جلتے رہے کاشانے
آنسو بھی قتیل اپنی آنکھوں میں نہیں باقی
ایسے تو نہ دیکھے تھے ہم نے کبھی ویرانے

شاہد صدیقی

کیا ہوا جو گھبرا کے ہر طرف پکار آئے
اس سے حالِ دل کہیئے جس کو اعتبار آئے

یہ عجب تماشا ہے دوست مجھ کو تڑپاتیں
اور میری حالت پہ دشمنوں کو پیار آئے

آپ جیت کر خوش ہیں اور یہ نہیں معلوم
کس قمار خانے میں کیسی چیز ہار آئے

کاش پوچھ لے بڑھ کے کوئی ناخداؤں سے
کس کو غرق کر ڈالا، کس کو پار اتار آئے

غلام ربانی تاباں

گناہگارِ محبت ہوں میں قصور ہوا
مگر ادھر سے اشارہ کوئی ضرور ہوا

یہ رازِ میکدہ سمجھا نہ محتسب نہ فقیہہ
اِدھر غروب اُدھر مہر کا ظہور ہوا

جو پوچھ پاؤ تو پوچھو نگاہِ ساقی سے
کسی کا ساغرِ دل کیسے چور چور ہوا

نگاہ و دل کی سیاست بھی کیا سیاست ہے
حضورِ یار جنوں اور ناصبور ہوا

نگاہ اٹھی شعاعیں بکھر گئیں تاباںؔ
تمام عالمِ دل غرقِ موجِ نور ہوا

نظر حیدر آبادی

مئے رنگیں کا کیا ہوتا یہ میخانے کہاں جاتے
نگاہ یار مل جاتی تو پیمانے کہاں جاتے

بہار آئی تو یوں آئی کہ اب کہنا ہی پڑتا ہے
نہ اڑتی خاک گلشن میں تو دیوانے کہاں جاتے

غنیمت ہے یہی افسردہ گذرے روز و شب اپنے
طبیعت رنگ پر آتی تو بہلانے کہاں جاتے

خدا رکھے کسے ملتا ہے لطف عیش تنہائی
اگر آباد ہو جاتے تو ویرانے کہاں جاتے

ہم ایسے لوگ، گر ملتا نہ رستہ کوئے جاناں کا
نکل کر دیر و کعبہ سے خدا جانے کہاں جاتے

وطن سے دور لے جان وطن ناشادماں اچھے
تری محفل میں ہم ہوتے تو پہچانے کہاں جاتے

اختر انصاری اکبر آبادی

زندگی بدلی محبت کے چلن بدلے گئے
محفلیں بدلیں، نظر بدلی، سخن بدلے گئے

آہ کی ہم نے تو دل کے زخم تازہ کر لئے
مسکرائے تم تو انداز چمن بدلے گئے

شام گذری، رات گذری، صبح آئی بھی تو کیا
ہر بہانے سے طریق انجمن بدلے گئے

رہنمایان کرہ ہزاروں رہنما آئے مگر
راہزن ہی رہ گئے، جب راہزن بدلے گئے

جس کو اہل ہوش بھی سمجھے نمود علم و فن
اس طریقے سے اصول فکر و فن بدلے گئے

مبتلا رہتے فریب رنگ و بو میں تا کجا
خود نہیں بدلے تو حالات چمن بدلے گئے

سردار الحامد

آؤ اس مہ جبیں کی بات کریں
مہ وش و نازنیں کی بات کریں

واعظا چھوڑ ذکرِ حور و قصور
آ مئے دلنشیں کی بات کریں

چھیڑ دیں قصۂ تجلیٔ طور
تیرے روئے حسیں کی بات کریں

ذکرِ طاعت کہاں، کہاں یہ دل
صنمِ دل نشیں کی بات کریں

کیسا کعبہ کہاں کے دیر و حرم
آستان و جبیں کی بات کریں

زیبِ ہر داستاں ہے ذکرِ حبیب
اہلِ عرفاں کہیں کی بات کریں

حسن کی خسروی سلامت باد
آؤ تاج و نگیں کی بات کریں

قمر ساحری

شبِ سیاہ میں میری نظر جہاں ٹھہری
وہیں پہ ہو گیا روشن ستارۂ سحری

مجھے کسی کی قیادت پہ شک نہیں لیکن
کہیں چراغوں کی ظلمت نے کی ہے راہبری

ابھی کچھ اور مٹے کا مشیتوں کا غرور
کھلیں گے اور ابھی رازِ عظمتِ بشری

تمام تہمتِ غارت گری بجا لیکن
ہمارے اپنے لہو سے ہے کائنات ہری

جہانِ خرد نے گرائے ہیں جہل کے پردے
مرے جنون نے کی ہے وہیں پہ پردہ دری

ابھی شباب پہ آیا نہیں چمن کا نکھار
کچھ اور خون کی محتاج ہے بہار گری

اچھال دی ہیں سرِ دار زخم کی آنچیں
بتا دئیے ہیں ستاروں کو رازِ صبح گری

رفعت سروش

زندگی کی گلفشانی کی قسم
لالہ و گل کی جوانی کی قسم
پھول بن کر مسکرائی تھی حیات
روزِ اول کی کہانی کی قسم
ڈوبتی جاتی ہے نبضِ کائنات
چارہ گر کی مہربانی کی قسم
زہر سے لبریز ہے جامِ شراب
غمزدہ سی شادمانی کی قسم
کیفِ محرومی کے تیور ہیں عجیب
جلتی بجھتی زندگانی کی قسم
علم کے دریا میں طغیانی نہیں
جاہلوں کی پاسبانی کی قسم
میرے لب پر ہے حدیثِ رنگ و بو
اہلِ فن کی نکتہ دانی کی قسم
دل کی اک دھڑکن میں نغمے ہیں ہزار
زندگی کی کامرانی کی قسم
ایک نفس ہی حاصلِ کونین ہے
جوئے ہستی کی روانی کی قسم
آپ ہیں شوریدہ سر رفعت سروش
نطق کی شعلہ بیانی کی قسم

نور محمد نور

بے بسی فکر کا حاصل تو نہیں ہو سکتی
سرنگونی میری منزل تو نہیں ہو سکتی
بند آنکھیں تو نہ ہوں ظلمتِ شب کے ڈر سے
حل کچھ اس طرح سے مشکل تو نہیں ہو سکتی
کارواں رک تو گیا پھر بھی قدم ہیں بیتاب
دل بھی کہتا ہے یہ منزل تو نہیں ہو سکتی
ناخدا تو نے غلط وقت پہ لنگر ڈالا
موج ابھری ہوئی ساحل تو نہیں ہو سکتی
آؤ لیلائے تمنا کا نظارہ بھی کریں
نظر آسودۂ محمل تو نہیں ہو سکتی
منزلِ دار و رسن کی مجھے عظمت تسلیم
وہ بھی قربان گہ دل تو نہیں ہو سکتی
نغمۂ عیش بھی پیدا ہمیں کرنا ہوگا
زندگی شورِ سلاسل تو نہیں ہو سکتی
غنچہ و گل پہ جو پہرے ہیں انھیں اٹھنا ہے
رائگاں سعیِ عنادل تو نہیں ہو سکتی
سست رو قافلۂ شوق نہ ہو نور کہیں
استراحت سرِ منزل تو نہیں ہو سکتی

اکبر حیدرآبادی

مرا دل ہے وہ شرارہ جسے آندھیوں نے پالا!
جو مچل پڑے تو بجلی، جو بھڑک اٹھے تو جوالا

نہ دیے ہی روشنی ہے نہ تو صبح کا اجالا!
تھی سیاہ رات کل تک، ہوا آج دن بھی کالا!!

ترا فیض عام ہے جب سرِ میکدہ تو ساقی
ترے میکشوں کو پھر کیوں نہ ملا کوئی پیالہ؟

نہ سنا کلیدِ جنّت کی حدیثِ خشک زاہد!
کہ نہ کھل سکے گا ہم سے تری جنتوں کا تالا

ہوئیں مدتیں کہ بدلا وہ مذاقِ سجدہ ریزی!
ہیں جبیں کے سامنے اب نئے بت، نیا شوالہ

ہے نگاہ اپنی اپنی، ہے مذاق اپنا اپنا
کہیں شام کی سیاہی، کہیں صبح کا اجالا

ہے خبر ستم گروں کو کہ کہاں رہیں گی جا کر؟
یہ زمیں گداز آہیں، یہ فلک شگاف نالہ

جسے مدتوں دبایا تھا شرر سمجھ کے تم نے
کہیں ظلم کی ہوا سے نہ بھڑک اٹھے وہ جوالا

یوں سنا رہا ہے باتیں، تو ہیں سزا جزا کی
ترے پاس جیسے واعظ ہے بہشت کا قبالہ

مرے باغباں نے کی ہے بڑی خدمتِ گلستاں!
کہیں آشیاں جلائے، کہیں خونِ گل اُچھالا!!

بڑی پر فضا ہیں اکبرؔ مرے دیش کی بہاریں
ہیں قدم قدم اجنتا، تو نظر نظر ہمالہ!

اثر مجیدی

کون کہتا ہے ہم تمہارے ہیں
ہم تو ان کے ہیں جو ہمارے ہیں

جو عبارت ہیں موج و طوفاں سے
میری نظروں میں وہ کنارے ہیں

آپ ہی سے مرا تخاطب ہے
برق و باراں تو استعارے ہیں

میرے ماحول کے اندھیرے ہیں
خون رستے ہوئے نظارے ہیں

آپ جب تک بھی سربلند رہے
ہم نے سولی پہ دن گذارے ہیں

آج گلچیں نظر نہیں آتے
پھول دہکے ہوئے شرارے ہیں

جن سے قائم ہے زندگی کا سہاگ
ان کے آنچل میں سرخ تارے ہیں

ہم اثرؔ ارتقا کے جویا ہیں
ہم سے نزدیک چاند تارے ہیں

س۔ا۔عشرت

فروغِ تشنگیٔ مہر دہن کی بات نہ کر
ابھی بہار نہیں ہے چمن کی بات نہ کر

اب اور کھا نہ سکیں گے فریبِ اہلِ سفر
قبا دتوں میں چھپے راہزن کی بات نہ کر

ابھی تو ایک ہی ساغر دیا ہے ساقی نے
ابھی سے تلخیٔ کام و دہن کی بات نہ کر

ترے شعور نے سمجھا نہیں مقام مرا
تو میرے سامنے دار و رسن کی بات نہ کر

یہاں سکون دلِ مضطرب محال سہی
وطن فروش تو ارضِ وطن کی بات نہ کر

بہار آتے ہی نظمِ چمن بدل دیں گے
ابھی تسلطِ زاغ و زغن کی بات نہ کر

تجھے بلندیٔ فکر و نظر نصیب نہیں
سیاہ بختیٔ اربابِ فن کی بات نہ کر

غمِ حیات سے فرصت نہیں ملی عشرتؔ
ابھی تو زلفِ شکن در شکن کی بات نہ کر

شفیق فاطمہ شعریٰ

ہر ایک ذرہ میں سورج ہے دیدہ ور کے لئے
چلے چلو یہ توقف بھی کیوں سحر کے لئے

خیالِ قافلہ درخت و ساراں ہے عبث
کہ ایک عزم ہی کافی ہے بس سفر کے لئے

ہم ایک لمحہ میں گذرے وہاں سے مثلِ نسیم
گذر محال ہے اب تک جہاں خضر کے لئے

گرفتِ حلقۂ امواج و ظلمتِ احول
بلائیں بحر میں کیا کیا نہیں گہر کے لئے

پہنچ کے رفعتِ افلاک تک تو رُٹ آئی
اب اور کون سا سامان ہے نظر کے لئے

نسیمِ صبح کی شادابیوں کو چھان لیا
دوا ملی نہ مجھے سوزشِ جگر کے لئے

خود اپنی حدتِ انفاس ہی سے راکھ بنا
چمک ہی دشمنِ جاں بن گئی شرر کے لئے

فرشتے رشک سے کیوں دیکھتے ہیں سوئے زمیں
حیات اٹھی ہے کس کے طوافِ در کے لئے

ہنر سے بڑھ کے صلہ اور کوئی کیا ہوگا
صلہ نہیں تو نہ ہو دہر میں ہنر کے لئے

بس اور کچھ نہیں اتنا ہی یاد ہے مجھ کو
چنے تھے پھول کبھی تیری رہ گذر کے لئے

محمد علوی

کھڑے رہے ہیں سرِ رہگذار صبح تلک
کیا ہے یوں بھی ترا انتظار صبح تلک

وہ تارے تھے کہ تھے لمحے شبِ جدائی کے
جو تارے گنتے رہے بے قرار صبح تلک

مری امید، مری آرزو، مری خواہش
تری وفا سے رہی ہم کنار صبح تلک

تمام رات لرزتی رہی صدائے جرس
اٹھا کیا رہِ دل سے غبار صبح تلک

اتر چکا تھا غمِ جاں گسل رگ و پے میں
بکھر چکا تھا طلسمِ خمار صبح تلک

کہاں کہاں نہ کھلے زخم ہائے دل علوی
کہاں کہاں نہ گئی یادِ یار صبح تلک

محمد حنیف خان ناشاد

رنگ غنچے کا اڑا، چاند سے وہ نور گیا
لے ترے حسن کا چرچا بھی بہت دور گیا

اور اس کوچہ میں خاک اس کی ٹھکانے لگتی
شکر ہے تیرا کہ در تک دلِ رنجور گیا

کس کا یہ ظرف کہ پیتا غمِ ہستی کی شراب
میں ہی بس اک ترے میخانے سے مخمور گیا

اہلِ عرفاں کو ہے پھر حوصلۂ دار و رسن
پھر اسی راہ سے ہو کر کوئی منصور گیا

ان اداؤں میں کہیں سایۂ افرنگ نہ ہو
ابھی ناشاد کہاں وہ بتِ مغرور گیا

مظہر امام

جلالِ دوش ہوں، فردا کا غلغلہ ہوں میں
امامِ وقتِ رواں، جانِ ارتقا ہوں میں
شبِ فراق کی حد سے گزر چکا ہوں میں
نگارِ صبح کے رخسار چومتا ہوں میں

ذرا سا چھیڑ تو دے زخمۂ بہار مجھے
ربابِ لالہ و نسریں کا زمزمہ ہوں میں
نظر ملائے بھلا کس طرح ضعیفیٔ شب
عروسِ صبحِ مسرت کا آئینہ ہوں میں

جبینِ مہر بھی جھکتی ہے میرے قدموں پر
زمیں کی رفعت پستی کا دبدبہ ہوں میں
فرازِ دار بھی رنگین ہے مرے دم سے
کفِ حیات کا سرمایہ ہوں، حنا ہوں میں

مری خطا نہیں، گر گونجتا ہے ہر ذرہ
لبِ حیات سے نکلی ہوئی صدا ہوں میں
انھیں یہ زعم کہ کشتی کے ناخدا ہیں وہ
مجھے یہ ناز کہ ساحل کا مدعا ہوں میں

خرد نصیب! نہ کر طنز میری شورش پر
جنونِ عشق کے آداب جانتا ہوں میں
ہزار بار مرے پاؤں لڑکھڑائے ہیں
ہزار بار نئے عزم سے چلا ہوں میں

کسی کی راہبری کی عنایتیں ہیں امامؔ!
کہ رہزنی کو بھی پہچاننے لگا ہوں میں

انجم پرویز

غمِ حیات سے بڑھ کر ہے کائنات کا غم
بہت زمانے میں سمجھے ہیں اتنی بات کو ہم

اب آؤ اوجِ ثریا سے جا کے ٹکرائیں
زمیں پہ رہ کے ستاروں کو توڑ لائیں ہم

جنوں شکار نظر نے یہ راز سمجھایا
کہ مہر و ماہ سے بڑھ کر ہے عظمتِ آدم

نہ سنگِ در کی طلب ہے نہ آستاں کی تلاش
مرے شعور نے ڈھالا ہے خود ہی ایک صنم

زمانہ تم کو سکھائے گا انقلاب ہے کیا!
یہ روز و شب کا تسلسل، یہ گردشِ پیہم

زمانے بھر کے دکھوں کو گلے لگانے سے
ہے دردِ دل کا بھی احساس آج کچھ کم کم

بتاؤں تم کو یہ کیوں کر کہاں ہوں میں انجمؔ
زماں تو گردِ سفر ہے مکاں ہے ایک قدم

سعید اختر نعمانی

سوزِ دروں میرا کامیاب نہیں ہے
رُخ پہ ابھی غم کی آب و تاب نہیں ہے
عشق میں وہ جذبہ کامیاب نہیں ہے
جس میں تب و تاب اضطراب نہیں ہے
اور بھی کچھ ہے یہاں طرب کے علاوہ
حاصلِ ہستی مئے و رباب نہیں ہے
بزم بھی ہے مرے ہی خون سے ساقی
اور مرے ہی لئے شراب نہیں ہے
عیش و مسرت میں کیف ہے گر اے دوست
کیف الم کا کوئی جواب نہیں ہے
عقدہ کُشا ہے کس کی زلف خمیدہ
میری نظر صرفِ پیچ و تاب نہیں ہے
اے غمِ جاناں میں کیف ڈھونڈنے والے
یہ غمِ دوراں کوئی عذاب نہیں ہے
شورشِ پیہم متاعِ شوق ہے اختر
اسے وہ دل جس میں اضطراب نہیں ہے

ذبایر رضوی

یوں تو ہر راہ نکلتی تھی سوئے باغِ ارم
جانے کس راہ سے گذرے ہیں بہاروں کے قدم
میں کہاں اور کہاں لطف و عنایات کا غم
مجھ کو بدنام نہ کر دے یہ تیرا حُسنِ کرم
کتنی بے سود ہے یہ کشمکشِ دیر و حرم
یہاں تخیل کے پارے وہاں پتھر کے صنم
ان ہی صحراؤں میں مہکیں گے بہت لالہ و گل
بہ غمِ دوست یہ حالات کا بے پایاں الم
لیلیٰ صبح رہی محوِ خود آرائی ہے
اور کچھ روز ہے یہ تیرگیٔ شب کا بھرم
ان کی تعزیر کڑی ہے کہ مرا عزمِ جواں
لائیں وہ تیغ و سناں حوصلۂ جور و ستم
آج انسان ہر اک ظلم سے ٹکرائے گا
حُسنِ غمگیں کی قسم خونِ شہیداں کی قسم
عہدِ امروز میں وہ وقت بھی آئے گا ذبایر
بڑھ کے تلوار اٹھائیں گے تیرے اہلِ قلم

افسر آذری

جو اتفاق سے صحرا میں پھول کھلتے ہیں
تو اپنے آپ گریباں کے چاک سلتے ہیں

مچل گیا ترا گھونگٹ تو یوں ہوا محسوس
ندی کے پار شفق رنگ پھول کھلتے ہیں

مری ندیم! مرے حال پر نظر رکھنا
یہ لوگ کیوں مجھے تنہائیوں میں ملتے ہیں!

کھلی شعور کی آنکھیں تو ہم نے یہ جانا
اب آسمان کی چھت کے ستون ہلتے ہیں

چھڑا ہے ذکر تمہارے شباب کا جب سے
کلی کی آنکھ میں آنسو خوشی کے ملتے ہیں

نعمت انور

ترے جمال دل آرا کی تاب لا نہ سکے
ہم اپنی خواہش دیدار بھی مٹا نہ سکے
جو بات حشر اٹھائے ہوئے ہے دل میں ندیم
وہ ایک بات ترے روبرو سنا نہ سکے
محافظانِ چمن کا سلوک کیا کہیے
بھری بہار میں ہم کھل کے مسکرا نہ سکے
نشاطِ جلوۂ جاناں کو ہم نے پا تو لیا
غمِ حیات کی تلخی مگر مٹا نہ سکے
نگاہِ یار تو اپنے نفس کی بات نہ پوچھ
تری بلا سے اگر دل سکون پا نہ سکے
ہمارا میکدہ، ساقی ہمارا، مے اپنی
عجیب بات ہے ہم تشنگی بجھا نہ سکے

ڈاکٹر محی الدین زور

تبصرے

نقوش لاہور کے ایک مشہور رسالہ نقوش نے اپنا جنوری کا شمارہ "افسانہ نمبر" کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ ادارۂ فروغ اردو سے نکلتا ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر دو تین ماہ میں ایک ضخیم مشترکہ شمارہ شائع کرتا رہتا ہے۔

زیر نظر شمارہ میں تقریباً (۴۰) افسانے اور خاکے شریک کئے گئے ہیں۔ اس کے لکھنے والوں میں اردو کے اکثر بہترین افسانہ نگار مثلاً عصمت چغتائی، غلام عباس، منٹو، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، کنہیا لال کپور، ہاجرہ مسرور، ابراہیم جلیس وغیرہ شامل ہیں۔

ابتدا میں بعض افسانہ نگاروں کی تصویریں اور سمپوزیم میں حصہ لینے والوں کی تصویریں بھی شریک ہیں۔ یہ سالنامہ پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے اور اس کے آخری حصے میں اس سمپوزیم کی تفصیلات درج ہیں جو اردو افسانہ میں روایات اور تجربے کے عنوان سے ادارہ نقوش نے منعقد کیا تھا۔ یہ پرچہ اس قابل ہے کہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے خاص نمبروں کے مقابل پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس کی کامیابی پر اس کے مدیر محمد طفیل صاحب قابل مبارک باد ہیں۔

ساقی شاہد احمد دہلوی کی ادارت میں ماہنامہ ساقی کراچی سے بھی اسی اہتمام کے ساتھ شائع ہوتا رہا ہے جیسا کہ دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ البتہ اس کی مالی حالت اگلی سی باقی نہیں رہی لیکن علمی و ادبی معیار اسی طرح برقرار ہے۔

جنوری کے خاص نمبر میں مضامین، افسانے، نظمیں اور ڈرامے سب ہی شریک ہیں اور اس کے لکھنے والوں میں پروفیسر رشید احمد صدیقی، جعفر علی خاں اثر، ڈاکٹر ابواللیث، ڈاکٹر عبادت بریلوی، عبدالرحمٰن چغتائی، ایم اسلم، امتیاز علی، جہاں بانو نقوی اور تسنیم سلیم جیسے پختہ مشق ادیب وغیرہ شامل ہیں۔ ہر حصۂ مضامین کا معیار قابل قدر ہے۔ البتہ منظومات کے معیار میں اور زیادہ بلندی کی ضرورت تھی۔ یہ خاص نمبر تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہے اور اس قابل ہے کہ اس کی توصیف کی جائے۔

مشرب کراچی سے صحت مند اور توانا ادب کے ترجمان کی حیثیت سے یہ ماہنامہ اختر انصاری الہ آبادی کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ سنہ ۱۹۵۴ء کے ماہ جنوری کا شمارہ سالنامے کے طور پر تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل شائع ہوا ہے جس میں مضامین، نظمیں اور افسانے سب ہی شامل ہیں۔ اس کے لکھنے والوں میں ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عندلیب شادانی، سری نواس لاہوتی، جوش ملیح آبادی، جیلانی بانو، آمنہ ابوالحسن، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس میں دوسری زبانوں کی چھ کہانیاں بھی شریک کی گئی ہیں اور یہ ایک اچھا ادبی اضافہ ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کی کئی تصویریں بھی اس سالنامہ کی زینت ہیں۔

ھمایوں لاہور کا ایک قدیم ماہنامہ ہے جو میاں بشیر احمد کی ادارت میں سالہا سال سے اپنا معیار اور رنگ قائم رکھے نکل رہا ہے۔ پہلے اس کا سالگرہ نمبر خاص اہتمام سے شائع ہوتا تھا۔ اس سال جنوری کا پرچہ بطور سالگرہ نمبر کے (۱۱۲) صفحات میں شائع کیا گیا ہے۔ تصویریں وغیرہ شریک نہیں ہیں اس لئے ضخامت کی کمی کی وجہ سے یہ دوسرے پرچوں کے سالناموں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تاہم اپنے بعض مضامین نظم و نثر کی وجہ سے قابل قدر ہے اور معتدل ذوق کے لئے تشفی بخش۔

تحریک گزشتہ سال دہلی سے گوپال متل کی ادارت میں یہ پرچہ شائع ہوا اور اب تک پابندیٔ وقت کے ساتھ ایک خاص رنگ میں شائع ہو رہا ہے۔ اس نے فروری مارچ کے شماروں کو بطور سالنامہ شائع کیا ہے۔ یہ بھی "ہمایوں" کی طرح

۱۰۰) صفحات پر مشتمل ہے اور اس کے مضامین بھی مقالوں، نظموں، افسانوں اور غزلوں پر مشتمل ہیں۔ اس پرچے کی خصوصیت یہ ہے کہ کمیونزم کے خلاف بطور تحریک کے پرچار کرتا ہے اس سالنامے میں ہالیائی کونشن کے عنوان سے مختلف شعرا کے نظمیں اور قطعات شائع کر کے ایک علیحدہ حصہ اس کے لئے وقف کیا گیا ہے لکھنے والوں میں جعفر علی خاں اثر۔ احسان دانش۔ امجد۔ مخمور سعیدی۔ گوپال متل۔ اختر انصاری قابل ذکر ہیں۔

راهی دہلی ہی سے نکلتا ہے اور جنوری میں اپنا سالنامہ شائع کیا ہے جو (۲۴۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ بلدیو متر اور مہر چند آہوجہ اس کو ترتیب دیتے ہیں۔ مقالے، افسانے، غزلیں، نظمیں اور تصویریں سب ادب کے صحت مند قدروں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اس کے لکھنے والوں میں برجموہن دتا تریہ کیفی۔ احتشام حسین۔ آل احمد سرور۔ کرشن چندر۔ سجاد ظہیر۔ راجندر ناتھ شیدا۔ پرکاش پنڈت۔ خواجہ احمد عباس اور جوش ملیح آبادی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ سالنامہ اپنے خاص معیار کی وجہ سے قابل قدر ہے لیکن کتابت و طباعت کا معیار ابھی قابل توجہ ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو
کی سرگرمیاں

۳ جنوری ۱۹۵۴ء

ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر کے استقبال میں ایک عصرانہ اور مشاعرہ ترتیب دیا گیا جس میں سائنس کانگریس کے اردو مندوبین اور حیدرآباد کے علم دوست اصحاب نے شرکت کی

۸ جنوری

دکنی بورڈ کی ایک کمیٹی (جس میں ادارہ اور ہندی پرچار سبھا کے نمائندے شامل تھے) سبھا کے دفتر میں منعقد ہوئی۔ دکنی کتابوں کو ہندی اور اردو رسم خط میں چھاپنے کا پروگرام اور تقسیم کار کے بارے میں تصفیہ کیا گیا۔

۱۰ جنوری

ادارے کے جملہ معتمدین مجالس کا اجلاس منعقد ہوا جس میں آئندہ دو سالوں کے کام اور نظام العمل و طریقۂ کار کا تعین کیا گیا۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری۔ شاہجہاں بیگم صاحبہ ایم اے۔ اکبرالدین صاحب صدیقی۔ رمن راج سکسینہ صاحب۔ خواجہ حمیدالدین صاحب شاہد۔ مولوی محمد مصلح الدین صاحب۔ مولوی محمد محمود حسین صاحب اور فیض محمد صدیقی صاحب نے شرکت کی

۱۱ جنوری

معتمد ادارہ کی دعوت پر ایک اردو کانفرنس کے انعقاد کیلئے ملک کے مختلف انجمنوں اور جماعتوں کے نمائندوں کو مدعو کیا گیا جس میں ایک ابتدائی کمیٹی بنائی گئی۔

۱۳ جنوری

مجلس ادب اطفال کا جلسہ ہوا جس میں سیتو مادھو راؤ صاحب ناظم تعلیمات۔ رابعہ بیگم صاحبہ ایم۔ اے۔ سعیدہ جہاں بیگم صاحبہ۔ راجندر پرشاد صاحب بس اندوستی بندو۔ فیض محمد صدیقی صاحب۔ مراد علی صاحب طالع۔ منیر صفوی صاحب اور مصلح الدین صاحب صدیقی نے شرکت کی اور اس مجلس کا پروگرام اور موازنہ طے کیا۔

● مجلس انتظامی شاخہائے ادارہ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں عاقل علی خاں صاحب۔ غلام حسین صدیقی صاحب۔ رمن راج سکسینہ صاحب۔ عبدالمنان صاحب۔ پرنسپل ذوالفقار علی صاحب۔ خواجہ حمیدالدین صاحب شاہد اور عارف الدین حسن صاحب نے شرکت کی۔

شہر اور اضلاع میں شاخوں کو پھر سے سرگرم عمل کرنے اور نئی شاخوں کے قائم کرنے کے بارے میں تصفیہ کیا گیا اور سنہ ۵۴۔۱۹۵۵ء کے لئے موازنہ مرتب ہوا۔

۱۴ جنوری

مجلس انتظامی کتب خانہ کا اجلاس منعقد ہوا۔ رامچندر پرشاد صاحب۔ حمید شطاری صاحب۔ غلام رسول صاحب۔ اکبرالدین صاحب صدیقی نے شرکت کی۔ طے پایا کہ کتب خانہ سٹی کالج کی فہرست کے نمونے پر ادارہ کی ایک فن واری فہرست تیار کی جائے اور کتابوں کی موجودہ تعداد کو ختم سال پر بڑھا کر ۵۰ ہزار تک کرنے کے لئے ایک مہم جاری کی جائے جس کے لئے ایک اپیل اخباروں میں شائع کی جائے اور مختلف اصحاب تک پہنچائی جائے۔

● مجلس تعلیم بالغان اور اردو امتحانات کا اجلاس منعقد ہوا۔ مولوی سید علی اکبر صاحب۔ زینت ساجدہ صاحبہ۔ کنول پرشاد صاحب کنول۔ عابد علی خاں صاحب۔ سید محمد صاحب۔ سرنجاس صاحب لاہوتی۔ مظہر حسین صاحب۔ حمیدالدین صاحب شاہد نے شرکت کی۔

طے پایا کہ ماہ جون میں اردو دانی۔ اردو عالم کے امتحانات

بنائے جائیں اور ۱۹۵۵ء کے لئے موجودہ نصاب امتحانات پر نظرثانی کی تجاویز تیار کرنے چاہئیں تاکہ آئندہ اجلاس میں پیش ہوسکیں۔ مجلس کا موازنہ بھی مرتب کیا گیا۔

● مجلس عمارت ادارہ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں شاہجہاں بیگم صاحب ام اے۔ زخشیدہ جیلانی صاحبہ۔ نواب سراج الدین احمد صاحب۔ مرزا حسن علی صاحب نازش۔ ڈاکٹر میر سیادت علی خاں صاحب۔ ڈی، ڈی اٹالیہ صاحب۔ مرزا ہمایوں علی بیگ صاحب۔ جانکی پرشاد صاحب۔ حمید الدین صاحب شاہد نے شرکت کی اور طے پایا کہ ادارہ کی عمارت کے سلسلے میں مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کر کے معتمد مجلس آئندہ اجلاس میں اپنی رپورٹ پیش کریں۔

۱۵ر جنوری

مجلس علمیہ و تحقیقات کا اجلاس منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر اریندر رشرما۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری۔ ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ۔ مولوی سید محمد صاحب۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل۔ مس دملا واگھرے۔ حسینی شاہد صاحب اور نصیر الدین ہاشمی صاحب نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں اس مجلس کے اغراض و مقاصد اور طریقہ کار اور موازنہ طے کیا گیا۔

● مجلس انسائیکلو پیڈیا کا اجلاس منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر راحت اللہ خاں۔ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب معتمد انجمن ترقی اردو۔ ڈاکٹر سید شاہ محمد۔ پروفیسر سید محمد صاحب۔ عالم خوندمیری صاحب۔ ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ۔ پروفیسر سروری صاحب۔ رضیہ بیگم صاحبہ اور ڈاکٹر حفیظ قتیل نے شرکت کی۔ طے پایا کہ اصل انسائیکلو پیڈیا کا کام شروع کرنے سے قبل ایک چھوٹے انسائیکلو پیڈیا کی اشاعت پر غور کیا جائے جس کا مسودہ تیار ہے اور جس کی جانچ کے لئے عالم خوندمیری صاحب ڈاکٹر سکسینہ اور رفیق محمد صاحب پر مشتمل ایک سب کمیٹی بنادی گئی۔

۱۶ر جنوری

ماہنامہ سب رس کی مجلس انتظامی کا اجلاس منعقد ہوا جس میں رمن راج صاحب سکسینہ۔ سلیمان اریب صاحب۔ اکبرالدین صاحب صدیقی۔ طیبہ رفعت صاحبہ۔ سرینواس صاحب لاہوٹی۔ حمید الدین صاحب شاہد نے شرکت کی۔ "سب رس" کے متعلق مختلف ارکان نے اشتہارات فراہم کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا اور توسیع اشاعت و ارکان مجلس کے اسم طے پائے۔

۱۷ر جنوری

مجلس نشرو اشاعت کا اجلاس منعقد ہوا جس میں محمود حسین صاحب۔ منیرو ہانسکا دس جی صاحبہ۔ محمد بن عمر صاحب۔ رفیعہ سلطانہ صاحبہ۔ عالم خوندمیری صاحب۔ ابوالفضل صاحب اور حمید شطاری صاحب نے شرکت کی۔ بعض ارکان کا اضافہ کیا گیا اور طے پایا کہ اس مجلس کے ارکان میں سے ہر رکن ادارے کے لئے اراکین بنائے اور نشرو اشاعت کے لئے مختلف مقامات کا دورہ کیا جائے۔ اس مجلس کا موازنہ بھی طے کیا گیا۔

۱۹ر جنوری

مجلس انتظامی کتب خانہ کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر راحت اللہ خاں۔ خواجہ محمد احمد صاحب۔ مسعود یزدانی صاحب۔ رامچندر پرشاد صاحب۔ خالدہ بیگم صاحبہ۔ غلام رسول صاحب۔ اکبرالدین صاحب صدیقی صاحب اور حمید شطاری صاحب نے شرکت کی اور طے پایا کہ فن واری فہرست کی اسکیم کے لئے جانچ کی غرض سے ایک سب کمیٹی مقرر کی جائے جس میں ڈاکٹر راحت اللہ خاں، مسعود یزدانی اور خواجہ محمد احمد صاحب شامل ہوں۔ گذشتہ میٹنگ میں جو موازنہ اس مجلس کے لئے بنایا گیا تھا اس کو بعد نظرثانی منظور کیا گیا۔

۲۴ر جنوری

مجلس انتظامی شاخہائے ادارہ کا دوسرا اجلاس معتمد مجلس کے مکان پر منعقد ہوا جس میں معتمد عمومی ادارہ کے علاوہ مولانا حامد صدیقی صاحب۔ حمید الدین صاحب شاہد۔ پرنسپل ذوالفقار علی صاحب۔ پرنسپل مرزا سرفراز علی صاحب۔ غلام حسین صدیقی صاحب۔ سید محمد صاحب۔ مہدی حسن زبیری صاحب۔ محمد سلطان صاحب نے شرکت کی۔ مختلف مقامات پر شاخیں قائم کرنے کے سلسلے میں اراکین کمیٹی میں مراسلت اور دوروں کے بارے میں کام تقسیم کیا گیا اور پہلے اجلاس کے مرتبہ موازنہ میں ضروری ترمیم کی گئی

۲۵ر جنوری

۵ بجے شام۔ مولوی عبدالحمید خاں صاحب صدرالمہام صرفخاص نے ادارہ کا معائنہ کیا۔

۲۷ر جنوری

مجلس نشرو اشاعت اور مجلس شاخہائے ادارہ کا متحدہ جلسہ چادرگھاٹ کالج میں منعقد ہوا۔ معتمد ادارہ کے علاوہ پرنسپل ذوالفقار علی صاحب۔ رفیعہ سلطانہ صاحبہ۔ محمد بن عمر صاحب۔ زینت ساجدہ صاحبہ

رمن راج صاحب سکسینہ۔ عارف الدین حسن صاحب۔ منیرہ بانو کاوش جی صاحبہ۔ مولانا حامد صدیقی۔ محمود حسین صاحب۔ عالم خوندمیری صاحب سلطانہ عزیز صاحبہ۔ قاضی عبدالرشید صاحب۔ خواجہ حمید الدین شاہد صاحب خلیل اللہ حسینی صاحب۔ نذر مصطفےٰ صاحب۔ غلام حسین صدیقی صاحب گردچرنداس سکسینہ صاحب۔ حمید شطاری صاحب۔ عبدالمنان صاحب ابوالفضل صاحب اور سلیمان اریب صاحب وغیرہ نے شرکت کی اور طے پایا کہ مجلس نشر و اشاعت کی طرف سے زینب ساجدہ صاحبہ اور حامد صدیقی صاحب کو مجلس شاخہائے ادارہ میں اور عارف الدین حسن صاحب اور خلیل اللہ حسینی صاحب کو مجلس شاخہائے ادارہ کی طرف سے مجلس نشر و اشاعت میں نمائندہ مقرر کیا جائے۔ نشر و اشاعت کے کام کی توسیع کے لئے مختلف ذرائع تجویز کئے گئے اور طے پایا کہ ادارے سے متعلق اردو کتابچہ جلد شائع کیا جائے۔

۶ رفروری ۱۹۵۴ء

مجلس تاریخ دکن کا اجلاس منعقد ہوا جس میں پروفیسر ہارون خاں صاحب شیروانی۔ پروفیسر مجید صدیقی صاحب۔ محمود علی صاحب سراج الدین احمد صاحب۔ مظہر حسین صاحب نے شرکت کی۔ طے پایا کہ بھارت چند کھنہ صاحب اور علی اصغر بلگرامی صاحب کو بھی اس مجلس کی رکنیت کی دعوت دی جائے اور سال حال تاریخ گولکنڈہ۔ میر مومن اور ارسطو جاہ کا دوسرا ایڈیشن اور حیات بخشی بیگم کی حیات بھی چھپوائی جائے۔ آئینہ دکن مرتبہ ست گرو پرشاد صاحب۔ تاریخ بالکنڈہ۔ حدیقۃ السلاطین حصہ دوم کی طباعت کے بارے میں بھی خاص طور پر سرمایہ جمع کرنے کا کام شروع کرنے کا تصفیہ کیا گیا اور اس مجلس کے لئے موازنہ بھی مرتب ہوا۔

۷ رفروری

ادارے کی مجلس انتظامی منعقد ہوئی جس میں نواب لیاقت جنگ مولوی سید علی اکبر صاحب۔ راجہ نرسنگ راج بہادر عالی۔ پروفیسر سروری صاحب۔ پروفیسر مجید صدیقی۔ مسٹر ایل، این گپتا۔ جانکی پرشاد صاحب مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی اور ڈاکٹر زور نے شرکت کی

اردو کانفرنس۔ دکنی بورڈ اور پی۔ ین کانفرنس کے سلسلے میں رقمی منظوریاں دی گئیں اور ادارے کے مجلسوں کی روئیداد پیش ہوئیں۔ طے پایا کہ مشاورتی کونسل کا اجلاس طلب کر کے ان پر غور کیا جائے۔

● مجلس انتظامی "سب رس" کا اجلاس منعقد ہوا۔ سلیمان اریب صاحب۔ رمن راج سکسینہ صاحب۔ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ طیبہ رفعت صاحبہ۔ لاہوتی صاحب۔ اکبر الدین صاحب صدیقی۔ حمید الدین صاحب شاہد نے شرکت کی۔ سب رس کا موازنہ اور دیگر امور کے متعلق ضروری تصفیے کئے گئے اور طے پایا کہ مسز یٰسین علی خاں صاحب، سلطانہ عزیز صاحبہ اور راشد افسر صاحب کو بھی اس مجلس کا رکن بننے کی دعوت دی جائے۔

۱۷ رفروری

شری گوپال راؤ اکبوٹے کے وزیر تعلیم مقرر ہونے پر ادارہ کی طرف سے عصرانہ دیا گیا جس میں حیدرآباد کی اکثر انجمنوں اور جماعتوں کے نمائندوں اور ادارے کے اراکین اور علم دوست حضرات کو مدعو کیا گیا۔ مجلس ادب اطفال کے رکن پی۔ ہنمنت راؤ نے بھی جنھوں نے اسی روز ڈپٹی منسٹری کا جائزہ حاصل کیا شرکت کی۔ اکبوٹے صاحب اور ہنمنت راؤ صاحب نے خیر مقدمی تقریر کے جواب میں تقریریں کیں۔

۲۰ رفروری

دفتر ادارہ میں اردو کانفرنس کے علمی و ادبی پروگرام کی ترتیب کے لئے ایک بیٹھک منعقد ہوئی جس میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر حفیظ جعفری پروفیسر سروری، مولوی حبیب الرحمٰن صاحب، رضیہ بیگم صاحبہ، حسینی شاہد صاحب، محمد مہدی صاحب، خواجہ حمید الدین شاہد صاحب، سرینواس لاہوٹی صاحب۔ پروفیسر سید محمد صاحب، کلیم اللہ صاحب اور ڈاکٹر زور صاحب نے شرکت کی اور کانفرنس کے مختلف اجلاسوں اور ان کے عہدہ داروں کے بارے میں انتخاب اور تفصیلی پروگرام مرتب کیا گیا۔

۲۴ رفروری

ادارہ کی اڈوائزری کونسل کا اجلاس ہوا جس میں ادارے کی مجلس انتظامی کے ارکان اور مجالس ادارہ کے معتمدین نے شرکت کی۔ معتمد نے ۱۹۵۴ء و ۱۹۵۵ء کے لئے اپنا لائحہ عمل اور موازنہ پیش کیا جس پر تبادلہ خیال کے بعد مجلس انتظامی میں پیش کرنے کے لئے سفارشات اور تحریکات منظور کی گئیں۔

حیدرآباد کی ادبی و تہذیبی خبریں

سری نیواس لاہوٹی

ماہ جنوری اور فروری

۲ر جنوری سنہ ۱۹۵۴ء

تیرہ ارکان پر مشتمل روسی سائنس دانوں کا ایک وفد انڈین سائنس کانگریس میں شرکت کے لئے حیدرآباد پہنچا۔ طیران گاہ پر انڈو سوویت کلچرل سوسائٹی اور حیدرآبادی عوام کی جانب سے وفد کا استقبال کیا گیا اور گلپوشی کی گئی۔

۳ر جنوری

انجمن ارتقائے ادب کا ہفتہ وار جلسہ دستوامتر عادل کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں برق یوسفی نے نظم اور اقبال اختر نے افسانہ سنایا جن پر مباحث ہوئے۔ آخر میں صدر جلسہ نے "ادب اور جمود" کے عنوان پر تقریر کی۔

● ادارۂ ادبیات اردو میں ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر کے اعزاز میں ایک مشاعرہ اور عصرانہ ترتیب دیا گیا جس میں حیدرآباد کے کئی علم دوست اصحاب کے علاوہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی نے بھی شرکت کی۔ مشاعرے میں جن شعرا نے حصہ لیا ان کے نام یہ ہیں: حضرت امجد، مولوی علی منظور، سراج الکامل شطاری، حکیم آشفتہ، نجم آفندی، نرسنگ راج عالی، جذب عالپوری، سلیمان اریب، دل پرشاد، شبیل بالا، عزیز قیسی، قمر ساحری، سرور ڈنڈا، مظہر حسین تیغ، ہرس۔ لی عشرت، راشد افسر، سعادت نظیر اور ڈاکٹر سکسینہ۔

۴ر جنوری

ہندستان کی مشہور رقاصہ مس شیریں دجفلار نے سائنس کانگریس کے مندوبین اور عوام کے سامنے اپنے رقص کا مظاہرہ کیا۔

۵ر جنوری

بلدیہ اور عثمانیہ یونیورسٹی کے [illegible] میں شہریان حیدرآباد کی جانب سے سائنس کانگریس کے مندوبین کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس موقع پر ایک عصرانہ بھی ترتیب دیا گیا تھا۔

● ادبی سنگم کا پندرہ روزہ جلسہ "گلفشاں" ملک پیٹھ میں بصدارت صفی الدین صدیقی لکچرار ورنگل کالج منعقد ہوا جس میں خورشید ندیم صاحبہ نے ایک افسانہ اور غیاث صدیقی نے ایک غزل سنائی جن پر مباحث ہوئے۔

۶ر جنوری

روٹری کلب میں میجر جنرل سوکھے نائب صدر کل ہند امن کونسل نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مختلف ممالک کے عوام کا مطالبۂ امن اتنا طاقتور اور مضبوط ہے کہ کوئی سیاستداں اس مطالبے کی مخالفت نہیں کر سکتا۔

۷ر جنوری

"ہندی بھون" میں ہندی پرچار سبھا، پریم چند سوسائٹی اور دیگر اداروں کی جانب سے روسی سائنس دانوں کا استقبال کیا گیا۔ ڈاکٹر نز درروف نے سپاس نامہ کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ روسی عوام ہندستانیوں سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ وفد کو ٹیگور، دوستوفیسکی، پریم چند کی تخلیقات بطور تحفہ پیش کی گئیں۔ اس موقع پر شری ایم ایس کرشنا پنڈت ہری رام شرما، گوپال راؤ ایکبوٹے اور رام گوپال نے ہندی میں تقریریں کیں

کے عنوانات پر تقریر کرتے ممتاز روسی سائنس دانوں کا استقبال کیا۔

● انڈو سویت کلچرل سوسائٹی کی جانب سے بوٹ کلب میں روسی سائنس دانوں کے اعزاز میں ایک عصرانہ اور خیر مقدمی تقریب منعقد کی گئی جس میں حیدرآباد کے ممتاز اصحاب نے شرکت کی حیدرآباد کے بڑے وزیر نے اراکین وفد کی گلپوشی کی۔

۸ر جنوری

حیدرآباد راجیہ ہندی پرچار سبھا کی جانب سے اتر پردیش کے گورنر اور گجراتی، ہندی کے مشہور ادیب شری کے ایم منشی کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس موقع پر منشی جی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندی کی ترقی اسی وقت ممکن ہے جب کہ وہ دوسری زبانوں کے مروجہ الفاظ کو اپنا ئے۔ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ تحقیقاتی کاموں میں بھی بین الاقوامی اصطلاحات کا استعمال کیا جانا چاہئے۔ اس موقع پر مسٹر ایل این گپتا اور پنڈت سری رام شرما نے بھی تقریریں کیں۔

۹ر جنوری

شاد میموریل لائبریری میں تلگو شاعروں کا ایک اجتماع عمل میں آیا جس میں تلنگی کے ممتاز شعرا نے حصہ لیا اور تلگو ادب کے تعلق سے بات چیت کی۔ بعد میں شعرا نے اپنا کلام سنایا۔

۱۰ر جنوری

عوامی ادبی سوسائٹی کا ہفتہ وار جلسہ امیر عارفی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں نصیر اختر اور غوث چغتائی نے افسانے سنائے اور سعادت نذیر نے غزل پڑھی۔

● انجمن ارتقائے ادب کا ہفتہ وار جلسہ رضیہ بیگم لکچرار کلیہ اناث جامعہ عثمانیہ کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں عاتق شاہ اور پریم تیاگی نے افسانہ سنایا اور صادق نوید نے غزل پڑھی۔

۱۱ر جنوری

اردو کی مختلف ادبی انجمنوں کی دعوت پر اردو کے کارکنوں کا ایک جلسہ ادارۂ ادبیات اردو میں منعقد ہوا جس میں طے پایا کہ ماہ اپریل یا مئی میں ایک اردو کانفرنس منعقد کی جائے تاکہ اس میں اردو زبان اور ادب کا جائزہ لیا جاسکے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کی بقا اور ترقی کے مسائل پر بھی غور کیا جاسکے اس سلسلہ میں ایک استقبالیہ کمیٹی کی تشکیل پائی جس کے حسب ذیل عہدہ دار

صدر:۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور (معتمد ادارہ ادبیات اردو)

معتمد:۔ حبیب الرحمن صاحب (معتمد انجمن ترقی اردو)، نائب معتمدین۔ سلیمان اریب (معتمد انجمن عوامی مصنفین) اور رمن راج سکسینہ اراکان نواب سید جنگ، جانکی پرشاد، عالم خوندمیری (معتمد پریم چند سوسائٹی)، محمد کلیم اللہ (معتمد امن کمیٹی)، پروفیسر عبدالقادر سروری، زینت ساجدہ، عابد علی خاں (ایڈیٹر سیاست) اور سری نیواس لاہوٹی منتخب ہوئے۔

۱۲ر جنوری

حیدرآباد کے صحیفہ نگاروں کی جانب سے مسٹر واسدیو راؤ اڈیٹر "مشیر دکن" کو ان کی ۷۰ ویں سالگرہ پر خراج تحسین ادا کیا گیا۔ اس موقع پر مسٹر بندو راؤ اور جانکی پرشاد ناظم و نائب ناظم اطلاعات مسٹر حبیب الرحمن معتمد انجمن ترقی اردو، مسٹر عابد علی خاں معتمد حیدرآباد جرنلسٹس کانفرنس اور ہندی پرچار سبھا سے سری نیواس لاہوٹی نے مسٹر واسدیو راؤ کی گلپوشی کی اور انھیں مبارکباد دی۔

۱۳ر جنوری

انوار العلوم کالج نامپلی میں ڈاکٹر حفیظ قتیل کی صدارت میں ایک ادبی محفل منعقد ہوئی جس میں زینت ساجدہ لکچرار جامعہ عثمانیہ نے فیض کی شاعری پر تقریر کی۔

۱۷ر جنوری

انجمن ارتقائے ادب کا ہفتہ وار جلسہ س۔ ا۔ عشرت کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں برق یوسفی نے اپنی نظم اور جبار جعفر نے اپنا افسانہ سنایا۔ آخر میں صاحب صدر نے غزل سنائی۔

● عوامی ادبی سوسائٹی کا ہفتہ وار جلسہ صدیق منزل میں بصدارت مہیش پرشاد منعقد ہوا جس نصیر اختر نے اور امیر عارفی نے اپنے افسانے سنائے۔ اس کے بعد سعادت نذیر نے ایک غزل مسلسل پڑھی۔

اس مباحث کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

۲۰ر جنوری

ادبی سنگم کا پندرہ روزہ جلسہ صلاح الدین کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں امیر عارفی اور نصیر اختر نے افسانے پڑھے اور تاج ہاشمی نے غزل سنائی۔ اس کے بعد ایک محفل شعروسخن منعقد ہوئی۔

● ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے پروفیسر بھگوت دیال ورما صدر شعبہ اردو، فارسی جامعہ پٹنہ، اوشا دیوی ریسرچ اسکالر پونہ اور حسید رعلی خاں صاحب پروفیسر اردو جامعہ مدراس کے خیر مقدم میں ایک عصرانہ ترتیب دیا گیا جس میں حیدرآباد کے اکثر اساتذہ اور علم دوست حضرات نے شرکت کی۔

۲۴ر جنوری

عوامی ادبی سوسائٹی کا ہفتہ وار جلسہ "صدیق منزل" میں منعقد ہوا جس میں مہیش پرشاد نے ایک مقالہ پڑھا اور حبیب عابد نے افسانہ سنایا۔ آخر میں برق یوسفی اور کیلاش چند نے نظمیں پڑھیں۔ ان نظموں پر بحث کے دوران میں زبان کے مسئلہ پر بھی گفتگو ہوئی۔

● انجمن ارتقائے ادب کا ہفتہ وار جلسہ ٹے پلی میں منعقد ہوا جس کی صدارت نعیم زبیری نے لی۔ کیلاش چندر اور نصیر اختر صدیقی نے افسانے سنائے۔ حبیب پرواز نے دیہاتی زبان میں ایک گیت پڑھا۔

۲۶ر جنوری

ماں والا پیلس میں جشن جمہوریہ کی مسرت میں ایک طرحی مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت راجہ محبوب کرن نے کی۔

۲۷ر جنوری

بدرکا کالج آف کامرس میں مسٹر سیتھو مادھوراؤ ناظم تعلیمات کی صدارت میں ایک غیر طرحی محفل مشاعرہ منعقد ہوئی جس میں مقامی قدیم و جدید شعراء نے حصہ لیا۔ مسٹر احمد حسن قدوائی نے مشاعروں کی عوامی اہمیت پر تقریر کی۔

۲۸ر جنوری

انجمن اتحاد طلبہ مدرسہ فوقانیہ چوک کی جانب سے ایک محفل شعروسخن منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر عبدالقادر سروری صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ نے کی اور جس میں حیدرآباد کے تمام ممتاز شعراء نے حصہ لیا۔ آخر میں صدر مدرس جناب سرفراز علی صاحب نے شاعروں اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

۲۹ر جنوری

انجمن ترقی اردو حیدرآباد کی جانب سے اردو اخبار "مشیر دکن" کی ۷۰ ویں سالگرہ پر اخبار کے اڈیٹر مسٹر داسد یوراؤ کو مبارکباد دینے کے لئے ایک خیر مقدمی تقریب اور عصرانہ ترتیب دیا گیا۔ اس تقریب کی صدارت ڈاکٹر غلام یزدانی نے کی۔ اس میں مشیر حیدرآباد مادراج منت راؤ معتمد انجمن ترقی اردو، حبیب الرحمٰن صاحب اور مسٹر ایم نرسنگ راؤ ایم ال اے نے تقریریں کیں۔ اس موقع پر مشیر دکن کے پرانے پرانے پرچوں کی نمائش بھی کی گئی۔

۳۱ر جنوری

انجمن ارتقائے ادب کا ہفتہ وار جلسہ خیرات ندیم صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں برق یوسفی اور مجاہد انصاری نے نظمیں پڑھیں۔ آخر میں اقبال اختر نے افسانہ سنایا۔

● اردو مجلس کا ماہانہ جلسہ نواب ناظر یار جنگ کے مکان پر منعقد ہوا جس میں پروفیسر ہارون خاں شروانی نے "ز، خ، ش کی شاعری" پر ایک پر از معلومات مقالہ پڑھا۔ اس کے بعد محفل شعروسخن منعقد ہوئی۔

یکم فروری

انڈین ہسٹاریکل کمیشن کے تیسویں سالانہ اجلاس کا افتتاح حیدرآباد کے بڑے وزیر بی۔ رام کشن راؤ نے کیا۔ اس جلسہ کی صدارت حکومت ہند کے مشیر تعلیم پروفیسر ہمایوں کبیر نے کی۔ ان اجلاسوں میں ہندستان کے تاریخی واقعات پر دلچسپ مقالے پڑھے گئے۔ سب سے اچھا اور دلچسپ مقالہ ڈاکٹر نندلال چٹرجی کا تھا جس میں انھوں نے

غدر سے پہلے کے اردو اور ہندی کے قضیئے پر روشنی ڈالی تھی۔

۳/ فروری

دھرم ونت ہندی ہائی اسکول کے سالانہ جلسہ کے موقع پر ایک کلچرل پروگرام پیش کیا گیا۔ اس کلچرل پروگرام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ڈرامے میں جن لوگوں نے پارٹ کیا تھا وہ سب اسکول کے ننھے طالب علم تھے۔

● حیدری کشتی کتب خانے میں مولوی نصیرالدین ہاشمی نے عراق میں اردو کے عنوان پر تقریر کی۔

۴/ فروری

نمائش تھیٹر میں شام کو مسز رکمنی ارینڈل رکن پارلیمان کے زیر ہدایت ایک رقص و موسیقی کا پروگرام منعقد ہوا جس میں سب سے زیادہ مسز رکمنی ارینڈل کے بھارت ناٹیم کو پسند کیا گیا۔

۵/ فروری

ادبی سنگم کی پندرہ روزہ میٹنگ مسٹر مغنی تبسم کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں غیاث صدیقی، امیر عارفی اور جبار جعفر نے افسانے سنائے اور برق یوسفی نے نظم پیش کی۔

۶/ فروری

کرناٹک ساہتیہ مندر کے زیر اہتمام تمام زبانوں کے شعرا کا ایک اجتماع کنڑی کے مشہور شاعر ڈی۔ آر۔ بیندرے کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس ادبی اجتماع کا افتتاح حکومت ہند کے وزیر پیداوار مسٹر کے۔ سی۔ ریڈی نے کیا۔

● کل ہند صنعتی نمائش کی جانب سے اردو ہندی کا ایک ملا جلا مشاعرہ سکندر علی وجد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس مشاعرہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں پرانے اور نئے دونوں قسم کے شعرا نے اپنا کلام سنایا۔

۷/ فروری

عثمانیہ میڈیکل کالج کے یوم اتحاد طلباء کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ایک کلچرل پروگرام پیش کیا گیا۔ اس پروگرام میں ہندی کا ڈرامہ "حکومت کے آدھار" کو اسٹیج کیا گیا تھا۔

● انجمن ارتقائے ادب کا ہفتہ وار جلسہ سری نواس لاہوٹی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں برق یوسفی اور غیاث صدیقی نے اپنا کلام پیش کیا۔ بدنام رشی نے افسانہ سنایا اور آخر میں صدر نے دور وسطیٰ کے نمائندہ شاعر "تلسی داس" پر اپنا مقالہ پڑھا۔

۱۱/ فروری

حیدرآباد ہندی پرچار سبھا کی جانب سے سری گوپال راؤ ایکبوٹے وزیر تعلیم کا خیر مقدم کرنے کے لئے ایک جلسہ کیا گیا۔ اس موقع پر ایک عصرانہ بھی ترتیب دیا گیا تھا۔ مسٹر ایل۔ این گپتا معتمد تعلیمات نے خیر مقدمی تقریر کی جس کے جواب میں مسٹر ایکبوٹے نے کہا کہ وہ ہندی کو مقبول بنانے کی کوشش کریں گے۔

۱۴/ فروری

عوامی ادبی سوسائٹی کا ہفتہ وار اجلاس صدیقی منزل میں بصدارت مغنی تبسم منعقد ہوا جس میں امیر عارفی اور امجد باغی نے افسانے سنائے جس پر کافی بحث ہوئی۔ بعد میں سعادت نذیر اور صاحب صدر نے اپنا کلام سنایا۔

● انجمن ارتقائے ادب کا ہفتہ وار جلسہ وحید انور کی صدارت میں منعقد ہوا۔ کیلاش پرشاد جیسوال اور اختر عادل نے افسانے پڑھے اور شریف نشتر اور حبیب پرواز نے اپنا کلام برائے تنقید پیش کیا۔ نصرت یوسف زئی نے ایک تاثر سنایا۔ آخر میں صدر جلسہ نے چارلی چپلن پر ایک مضمون پڑھا۔

۱۵/ فروری

بزم اتحاد طلباء نظام کالج کی جانب سے ایک غیر طرحی محفل شعر و سخن منعقد ہوئی جس کی صدارت حیدرآباد کے مشہور شاعر اور ڈرامہ نویس مسٹر فضل الرحمٰن نے کی۔

۱۷/ فروری

ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے سری گوپال راؤ ایکبوٹے

کے وزیر تعلیم مقرر ہونے پر ایک عصرانہ ہونے پر ایک عصرانہ ترتیب دیا گیا' جس میں تقریباً دو سو اصحاب نے شرکت کی۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور معتمد ادارہ نے خیر مقدمی تقریر کی۔ خیر مقدمی تقریر کا جواب دیتے ہوئے سری اکبو نے نے کہا کہ اردو کے مستقبل کی جانب سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اردو زبان اور ادب کا خزانہ اس قدر وسیع اور مالا مال ہے کہ اسے کوئی بھی ختم نہیں کرسکتا۔ آخر میں انھوں نے یقین دلایا کہ وہ حتی الامکان اردو کے تحفظ و بقار کے سلسلے میں مدد کرتے رہیں گے سری بی۔ ہنمنت راؤ نائب وزیر۔ ال نے بھی تقریر کی اور گاندھی جی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اردو ہندستان ہی کی زبان ہے اور ملک میں ایک ایسی ہندستانی کو رائج کرنا چاہیے جو اردو اور ناگری دونوں رسم الخطوں میں لکھی اور سمجھی جائے۔

۲۰ر فروری

ایک محفلِ شعر و سخن بیادگار ست گرو پرشاد رہبر آنجہانی منعقد ہوئی اس محفل کی صدارت راجہ نرسنگ راج عالی نے کی۔

● ادبی سنگم کی پندرہ روزہ میٹنگ پریم تیاگی کی صدارت میں منعقد ہوئی برق یوسفی نے اپنی نظم اور شاہ غیاث نے اپنا مقالہ "امراؤ جان ادا پر ایک مختصر تنقید" پیش کیا۔ پروفیسر سروری، پروفیسر سید محمد، مغنی تبسم اور غیاث صدیقی نے بحث میں حصہ لیا۔ آخر میں محفلِ شعر و سخن منعقد ہوئی۔

۲۱ر فروری

انجمن ارتقائے ادب کا ہفتہ وار جلسہ نصرت یوسف زئی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس جلسے میں کیلاش پرشاد' اسماعیل ادیب' مجاہد انصاری اور فاروق اعظم نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔

● عوامی ادبی سوسائٹی کا ہفتہ وار اجلاس قمر ساحری کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں سربندنا تھ گوڑ نے افسانہ سنایا۔ امیر عارفی' سعادت نظیر اور غیاث صدیقی نے اپنا کلام سنایا۔ آخر میں صاحب صدر نے اپنی تازہ غزل سنائی۔

● پروفیسر عبدالقادر سروری نے حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں کو اپنے یہاں عصرانہ پر مدعو کیا جس میں شعراء نے اپنا کلام سنایا۔

۲۳ر فروری

انجمن اتحاد طلباء جامعہ عثمانیہ کی جانب سے ... کالج ڈے کے موقع پر ایک ... مشاعرہ منعقد ہوا جس میں حیدرآباد کے ممتاز شعراء نے حصہ لیا۔

۲۵ر فروری

مشہور ترقی پسند شاعر اور کمیونسٹ لیڈر مسٹر مخدوم محی الدین ایم ایل اے نو ماہ تک یورپ کا دورہ کرنے کے بعد وارد حیدرآباد ہوئے۔ آپ نے ویانا امن کانفرنس میں حیدرآباد کی مندوب کی حیثیت سے بھی شرکت کی تھی۔

۲۶ر فروری

روسی تہذیبی وفد کا ریلوے اسٹیشن پر حیدرآباد کے مختلف تہذیبی اداروں کی جانب سے شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ روس کا یہ تہذیبی وفد چھبیس ارکان بشمول بارہ خواتین پر مشتمل تھا۔ وفد کے ہر رکن کو کثرت سے پھول کے ہار پہنائے گئے۔

● بلدیات حیدرآباد و سکندرآباد اور شہریوں کی جانب سے روسی تہذیبی وفد کا نمائش کے میدان میں خیر مقدم کرتے ہوئے ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا وفد کے لیڈر مسٹر نکولائی این لیباپوف نے سپاسنامے کا جواب دیتے ہوئے کہا ہند اور روس کے درمیان تہذیبی وفود کے تبادلے دونوں ممالک کے رشتوں کو استوار کریں گے۔ شہریوں کی استقبالیہ کمیٹی نے وفد کے سامنے ملبارڈ ناچ' سدی ناچ اور طبلہ و سارنگی کا پروگرام پیش کیا جسے وفد کے ارکان نے کافی پسند کیا۔

● نمائش میدان کے کھلے تھیٹر میں سویت فنکاروں نے ہزاروں حیدرآبادیوں کے سامنے اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا۔ حیدرآباد کے بڑے وزیر بی۔ رام کشن راؤ نے حیدرآبادیوں کی جانب سے بڑے پرجوش انداز میں وفد کا خیر مقدم کیا۔ پروگرام کا آغاز روس اور ہند کے قومی ترانوں سے کیا گیا۔ سیاسی اختلاف رائے کے قطع نظر سب ہی لوگوں نے پروگرام کو بیحد پسند کیا۔ اس پروگرام میں شریک ہونے کے لئے ناگپور اور ... ریاست آندھرا کے دو سو اراکین مقننہ خاص طور پر آئے تھے۔

۲۷ر فروری

انجمن اتحاد طلبہ جامعہ عثمانیہ کے سالانہ عثمانیہ کے موقع پر ایک محفل شعر و سخن زیر صدارت مخدوم محی الدین منعقد ہوئی جس میں سلیمان اریب' عزیز قیسی' وحید اختر' شاذ تمکنت' س۔ ا۔ عشرت' عصمت اللہ بیگ

سروجنی نائیڈو نے حصہ لیا۔

● بزم اتحاد ایوننگ کالج کے زیر اہتمام علامہ حیرت کی صدارت میں ایک محفلِ شعر و سخن منعقد ہوئی جس میں حیدر آباد کے قدیم اور جدید شعراء نے حصہ لیا۔

۲ر فروری

عوامی ادبی سوسائٹی کا ہفتہ وار جلسہ جاندار افسر کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں شعرا نے اپنا کلام سنایا۔ امجد باغی کے افسانے "گاندھی کا خط نہرو کے نام" پر کافی بحث ہوئی۔

● انجمن ارتقائے ادب کا ہفتہ وار جلسہ غیاث صدیقی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ نعیم زبیری اور اسمٰعیل ادیب نے افسانے اور برق یوسفی نے غزل سنائی جس پر بحث و تنقید ہوئی

● اردو مجلس کا ماہانہ اجلاس بصدارت مولوی غلام یزدانی، ناظر یار جنگ کے مکان پر منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر ہاشم امیر علی خاں نے امریکی جامعات پر ایک معلومات آفریں تقریر کی اور نصیر الدین ہاشمی نے "تاثراتِ سفرِ عراق" کے عنوان سے ایک مضمون پڑھا۔ آخر میں شعرا نے اپنا کلام سنایا۔


at the
FIRST
SNEEZE
چھینک کے آتے ہی
چھینک کے آتے ہی سُعالین کی ایک ٹکیہ زبان پر
رکھکر آہستہ آہستہ چوسئے یہ نہ صرف زکام کو تسکین دے گی،
حلق کی خرابیوں کو دُور کریگی، طبیعت کو سکون بخشے گی
بلکہ سانس کی نالیوں کو صاف کرکے نظام میں توازن پیدا
کرے گی اور سانس کو خوشگوار بنائے گی۔
KEEP A BOTTLE HANDY
قیمت فی شیشی بارہ آنے (۱۲/)
ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی
Hamdard
DAWAKHANA (TREST) DELHI
ہزاروں روپے مفت انعام حاصل کرنے کے لئے رسالہ "ہمدرد صحت" کا مطالعہ کیجئے
SUALIN



یہ مسکراتے ہوئے چہرے۔ حال کی مسرتوں
اور سکون کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں لیکن ان کے
مستقبل کے سکون اور مسرتوں کی ذمہداری
بھی تو آپ پر ہے۔ آپ صاحب عقل
فراست ہیں۔ دور اندیش ہیں۔ اسی لئے
زندگی کے کسی ناخوشگوار موڑ کے
آنے سے پہلے ان کے مستقبل
کی خوشیوں اور سکون کا ضامن

دی نیو ایشیاٹک انشورنس کمپنی لمیٹیڈ

کو بنا دیجئے

ہماری ایجنسی کیلئے حسب ذیل پتہ پر لکھئے یا فون کیجئے

فون نمبر ۵۳۵۲

دی نیو ایشیاٹک انشورنس کمپنی لمیٹیڈ

سلطان بازار۔ حیدرآباد دکن


خوشبو کے تصور کے ساتھ
گلبہار کمپنی
کا خیال آنا ضروری ہے
دکن کا یہ مشہور اور قدیم کارخانہ جو ایک عرصہ دراز سے اپنے معزز گاہکوں کی خدمت میں عطر گلبہار، عطر سلیمہ عطر شمامتہ العنبر، عطر بٹ موگرا اور ہمہ اقسام کے ہیرآئیل۔ روحانی اگربتی وغیرہ پیش کرکے خراج تحسین حاصل کرتا رہا ہے
گلوں کی روح
کو
پیش کرنے والا
دکن کا مایۂ ناز کارخانہ
گلبہار کمپنی
حیدرآباد دکن
افضل گنج۔ معظم جاہی مارکٹ۔ ہنمکنڈہ (ورنگل)
نوٹ (۱) نقالوں اور نقلی مال سے بچیئے۔ (۲) گلبہار کمپنی کی تیار شدہ اشیاء سیل بند دیکھکر خریدیئے۔
(۳) اضلاع کی سہولت کی خاطر وی۔ پی اور پارسل کا بھی معقول انتظام کیا گیا ہے۔